حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم

میمن اسلامک پبلشرز

اصلاحی خطبات

جلد (۹)

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

خطاب ☜ حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب ☜ محمد عبداللہ میمن صاحب

تاریخ ☜ نومبر ۱۹۹۸ء

مقام ☜ جامع مسجد بیت المکرم گلشن اقبال کراچی

باہتمام ☜ ولی اللہ میمن صاحب

ناشر ☜ میمن اسلامک پبلشرز

کمپوزنگ ☜ عبدالماجد پراچہ (فون: 0333-2110941)

قیمت ☜ /- روپے

ملنے کے پتے

- میمن اسلامک پبلشرز، ۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹
- دارالاشاعت، اردو بازار، کراچی
- مکتبہ دارالعلوم کراچی ۱۴
- ادارۃ المعارف، دارالعلوم کراچی ۱۴
- کتب خانہ مظہری، گلشن اقبال، کراچی
- اقبال بک سینٹر صدر کراچی

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

پیش لفظ

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم العالی

الحمدللہ وکفی، وسلام علی عبادہ الذین اصطفی۔ امابعد!

اپنے بعض بزرگوں کے ارشاد کی تعمیل میں احقر کئی سال سے جمعہ کے روز عصر کے بعد جامع مسجد البیت المکرم گلشن اقبال کراچی میں اپنے اور سننے والوں کے فائدے کے لئے کچھ دین کی باتیں کیا کرتا ہے۔ اس مجلس میں ہر طبقہ خیال کے حضرات اور خواتین شریک ہوتے ہیں، الحمد للہ احقر کو ذاتی طور پر بھی اس کا فائدہ ہوتا ہے اور بفضلہ تعالیٰ سامعین بھی فائدہ محسوس کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس سلسلے کو ہم سب کی اصلاح کا ذریعہ بنائیں۔ آمین۔

احقر کے معاون خصوصی مولانا عبداللہ میمن صاحب سلمہ نے کچھ عرصے سے احقر کے ان بیانات کو ٹیپ ریکارڈ کے ذریعے محفوظ کر کے ان کے کیسٹ تیار کرنے اور ان کی نشر و اشاعت کا اہتمام کیا جس کے بارے میں دوستوں سے معلوم ہوا کہ بفضلہ تعالیٰ ان سے بھی مسلمانوں کو فائدہ پہنچ رہا ہے۔

ان کیسٹوں کی تعداد اب ڈھائی سو سے زائد ہوگئی ہے۔ انہی میں سے کچھ کیسٹوں کی تقاریر مولانا عبداللہ میمن صاحب سلمہ نے قلمبند بھی فرمالیں اور ان کو

چھوٹے چھوٹے کتابچوں کی شکل میں شائع کیا۔ اب وہ ان تقاریر کا ایک مجموعہ "اصلاحی خطبات" کے نام سے شائع کر رہے ہیں۔

ان میں سے بعض تقاریر پر احقر نے نظر ثانی بھی کی ہے۔ اور مولانا موصوف نے ان پر ایک مفید کام یہ بھی کیا ہے کہ تقاریر میں جو احادیث آئی ہیں، ان کی تخریج کر کے ان کے حوالے بھی درج کر دیئے ہیں، اور اس طرح ان کی افادیت بڑھ گئی ہے۔

اس کتاب کے مطالعے کے وقت یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ یہ کوئی باقاعدہ تصنیف نہیں ہے، بلکہ تقریروں کی تلخیص ہے جو کیسٹوں کی مدد سے تیار کی گئی ہے، لہٰذا اس کا اسلوب تحریری نہیں، بلکہ خطابی ہے۔ اگر کسی مسلمان کو ان باتوں سے فائدہ پہنچے تو یہ محض اللہ تعالیٰ کا کرم ہے، جس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہئے، اور اگر کوئی بات غیر محتاط یا غیر مفید ہے، تو وہ یقیناً احقر کی کسی غلطی یا کوتاہی کی وجہ سے ہے۔ لیکن الحمد للہ ان بیانات کا مقصد تقریر برائے تقریر نہیں، بلکہ سب سے پہلے اپنے آپ کو اور پھر سامعین کو اپنی اصلاح کی طرف متوجہ کرنا ہے۔

نہ بہ حرف ساختہ سرخوشم، نہ بہ نقش بستہ مشوشم
نفسے بیاد تو می زنم، چہ عبارت و چہ معانیم

اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ان خطبات کو خود احقر کی اور تمام قارئین کی اصلاح کا ذریعہ بنائیں، اور یہ ہم سب کے لئے ذخیرہ آخرت ثابت ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے مزید دعا ہے۔ کہ وہ ان خطبات کے مرتب اور ناشر کو بھی اس خدمت کا بہترین صلہ عطا فرمائیں آمین۔

محمد تقی عثمانی

دار العلوم کراچی ۱۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ ناشر

الحمد للہ ''اصلاحی خطبات'' کی نویں جلد آپ تک پہنچانے کی ہم سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ آٹھویں جلد کی مقبولیت اور افادیت کے بعد مختلف حضرات کی طرف سے نویں جلد کو جلد از جلد شائع کرنے کا شدید تقاضہ ہوا، اور اب الحمد للہ، دن رات کی محنت اور کوشش کے نتیجے میں صرف چھ ماہ کے اندر یہ جلد تیار ہو کر سامنے آگئی اس جلد کی تیاری میں برادر مکرم جناب مولانا عبداللہ میمن صاحب نے اپنی دوسری مصروفیات کے ساتھ ساتھ اس کام کے لئے اپنا قیمتی وقت نکالا، اور دن رات کی انتھک محنت اور کوشش کر کے نویں جلد کے لئے مواد تیار کیا، اللہ تعالیٰ ان کی صحت اور عمر میں برکت عطا فرمائے۔ اور مزید آگے کام جاری رکھنے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

ہم جامعہ دارالعلوم کراچی کے استاد حدیث جناب مولانا محمود اشرف عثمانی صاحب مدظلہم اور مولانا راحت علی ہاشمی صاحب مدظلہم کے بھی شکرگزار ہیں جنہوں نے اپنا قیمتی وقت نکال کر اس پر نظر ثانی فرمائی اور مفید مشورے دیئے، اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں ان حضرات کو اجر جزیل عطا فرمائے۔ آمین۔

تمام قارئین سے دعا کی درخواست ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سلسلے کو مزید آگے جاری رکھنے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے۔ اور اس کے لئے وسائل اور اسباب میں آسانی پیدا فرمادے۔ اور اس کام کو اخلاص کے ساتھ جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

ولی اللہ میمن

اجمالی فہرست

جلد ۹

عنوان	صفحہ نمبر

فہرست مضامین

عنوان	صفحہ

ایمان کامل کی چار علامتیں

عنوان	صفحہ

مسلمان تاجر کے فرائض

عنوان	صفحہ

عنوان	صفحہ

اپنے معاملات صاف رکھیں

عنوان	صفحہ

اسلام کا مطلب کیا ہے؟

عنوان	صفحہ

عنوان	صفحہ

آپ زکوٰۃ کس طرح ادا کریں؟

عنوان	صفحہ

عنوان	صفحہ

کیا آپ کو خیالات پریشان کرتے ہیں

عنوان	صفحہ

گناہوں کے نقصانات

عنوان	صفحہ

منکرات کو روکو۔ ورنہ!!

صفحہ	عنوان

عنوان | صفحہ

جنت کے مناظر

عنوان	صفحہ

فکرِ آخرت

عنوان	صفحہ

دوسروں کو خوش کیجئے

عنوان	صفحہ

مزاج و مذاق کی رعایت کریں

صفحہ	عنوان

ایمان کامل کی چار علامتیں

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

تاریخ خطاب : ۲۵/ اگست ۱۹۹۵ء

مقام خطاب : جامع مسجد بیت المکرم
گلشن اقبال کراچی

وقت خطاب : بعد نماز عصر تا مغرب

اصلاحی خطبات : جلد نمبر ۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایمانِ کامل کی چار علامتیں

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ و نؤمن بہ ونتوکل علیہ، ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا، من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ، ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ، ونشھد ان سیدنا وسندنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ، صلی اللہ تعالٰی علیہ وعلٰی آلہ واصحابہ وبارک وسلم تسلیماً کثیراً کثیرا۔

اما بعد!

﴿من اعطی للہ ومنع للہ واحب للہ وابغض للہ فقد استکمل ایمانہ﴾ (ترمذی، ابواب صفۃ القیامۃ، باب نمبر ۶۱)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "جو شخص کسی کو کچھ دے تو اللہ کے لئے دے اور کسی کو دینے سے منع کرے تو اللہ کے لئے منع کرے۔ اگر کسی سے محبت کرے تو اللہ کے لئے کرے اور اگر کسی سے بغض اور عناد رکھے تو اللہ کے لئے رکھے تو اس شخص کا ایمان کامل ہو گیا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ایمان کے کامل ہونے کی گواہی دی۔

پہلی علامت

ایمانِ کامل کی پہلی علامت یہ بیان فرمائی کہ وہ دے تو اللہ کے لئے دے۔ اس کا

مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی موقع پر کچھ خرچ کر رہا ہے تو اس خرچ کرنے میں اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کی نیت ہو۔ انسان اپنی ذات پر بھی خرچ کرتا ہے، اپنے اہل و عیال پر بھی خرچ کرتا ہے اور صدقہ خیرات بھی کرتا ہے تو ان تمام مواقع پر خرچ کرتے وقت اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کی نیت ہو۔ صدقہ خیرات میں تو یہ بات واضح ہے کہ اس کو دیتے وقت یہ نیت ہونی چاہئے کہ میں اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے صدقہ دے رہا ہوں اور اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس کا ثواب مجھ کو عطا فرمادیں۔ اس صدقہ دینے میں احسان جتانا مقصود نہ ہو، نام و نمود مقصود نہ ہو، دکھلاوا مقصود نہ ہو، تو یہ دینا اللہ کے لئے ہوا۔

خرید و فروخت کے وقت یہ نیت کرلیں

صدقہ خیرات کے علاوہ بھی جہاں خرچ کرو تو وہاں بھی اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کی نیت کرلو۔ مثلاً فرض کریں کہ آپ نے کوئی چیز خریدی اور دکان دار کو پیسے دے دیئے۔ اب بظاہر تو یہ ایک دنیاوی معاملہ ہے، لیکن اگر وہ چیز مثلاً گوشت، ترکاری خریدتے وقت یہ نیت کرلی کہ اللہ تعالیٰ نے میرے اہل و عیال کے جو حقوق میرے ذمے عائد کر رکھے ہیں، ان حقوق کی ادائیگی کے لئے یہ خریداری کر رہا ہوں۔ اور اگر اسی طرح دوسری نیت یہ کرلی کہ میں دکاندار کے ساتھ خرید و فروخت کا جو معاملہ کر رہا ہوں وہ اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے اس حلال طریقے کے مطابق کر رہا ہوں جو طریقہ اللہ تعالیٰ نے میرے لئے جائز کیا ہے اور حرام طریقے سے معاملہ نہیں کر رہا ہوں۔ تو ان دو نیتوں کے ساتھ خریداری کا جو معاملہ کیا اور دکاندار کو جو پیسے دیئے، یہ دینا اللہ کے لئے ہوا۔ اگرچہ بظاہر یہ نظر آرہا ہے کہ تم نے ایک دنیاوی لین دین کا معاملہ کیا اور گوشت خریدا یا کپڑا خریدا یا ترکاری خریدی لیکن یہ دینا اللہ کے لئے ہوا۔

صرف زاویہ نگاہ بدل لو

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب قدس اللہ سرہٗ فرمایا کرتے تھے کہ دین اور دنیا میں صرف زاویہ نگاہ بدلنے کا فرق ہے۔ اگر زاویہ نگاہ بدل لو تو وہی دنیا تمہارے حق میں دین بن جائے گی۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم دنیا کے اندر جو کچھ کام کر رہے ہو، سونا، جاگنا، اٹھنا، بیٹھنا، کھانا، پینا۔ یہ سب کرتے رہو مگر ذرا سا زاویہ نگاہ بدل لو۔ مثلاً کھانا کھانا ایک دنیاوی کام ہے، لیکن کھانا کھاتے وقت ذرا یہ سوچ لو کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

﴿ان لنفسک علیک حقا﴾

(صحیح بخاری جلد ا صفحہ ۲۶۴،۲۵۶۰)

یعنی تمہارے نفس کا بھی تمہارے اوپر کچھ حق ہے۔ اس حق کی ادائیگی کے لئے کھانا کھا رہا ہوں۔ اور یہ سوچ لو کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جب کھانا آتا تو آپ اس کو اللہ تعالیٰ کی نعمت سمجھ کر اس پر شکر کرتے ہوئے کھانا تناول فرمایا کرتے تھے۔ میں بھی آپ کی اسی سُنّت کی اتباع میں کھانا کھا رہا ہوں۔ تو اب یہی دنیا کا کام دین کا کام بن گیا۔ لہٰذا وہ سارے کام جن کو ہم دنیاوی کام سمجھتے ہیں، ان میں کوئی بھی کام ایسا نہیں ہے جن کو ہم زاویہ نگاہ کی تبدیلی سے دین نہ بنا سکیں اور اس کو اللہ کے لئے نہ بنا سکیں۔ صبح سے لے کر شام تک کی زندگی میں جتنے کام ہم کرتے ہیں ان کے بارے میں ذرا سوچیں کہ میں ان کے اندر زاویہ نگاہ بدل کر کس طرح ان کو دین بنا سکتا ہوں۔

ہر نیک کام صدقہ ہے

لوگ سمجھتے ہیں کہ صدقہ کرنا صرف اس کا نام ہے کہ آدمی کسی ضرورت مند کو پیسے دے دے یا کسی غریب کو کھانا کھلا دے وغیرہ۔ بس یہ کام صدقہ ہے اس کے

علاوہ کوئی کام صدقہ نہیں۔ لیکن حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر نیک کام جو نیک نیت سے کیا جائے وہ صدقہ ہے، یہاں تک فرمایا کہ کھانے کا وہ لقمہ جو انسان اپنی بیوی کے منہ میں ڈالے، یہ بھی صدقہ ہے۔ یہ صدقہ اس لئے ہے کہ آدمی یہ کام اس لئے کررہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میرے ذمے یہ حق عائد کیا ہے۔ اس حق کی ادائیگی کے لئے میں یہ کام کررہا ہوں تو اللہ تعالیٰ اس کو اس کام پر صدقہ کا اجر و ثواب عطا فرمائیں گے۔ یہ سب کام اللہ کے لئے دینے میں داخل ہیں۔

دوسری علامت

دوسری علامت یہ بیان فرمائی کہ اگر روکے اور منع کرے تو اللہ کے لئے روکے۔ مثلاً کسی جگہ پر پیسہ خرچ کرنے سے بچایا تو وہ بچانا بھی اللہ کے لئے ہو۔ چونکہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ فضول خرچی نہ کرو۔ اس فضول خرچی سے بچنے کے لئے میں اپنا پیسہ بچا رہا ہوں۔ تو یہ بچانا اور روکنا اللہ کے لئے ہے۔ یا مثلاً کوئی شخص آپ سے ایسے کام کے لئے پیسوں کا مطالبہ کررہا ہے جو کام شرعاً ممنوع ہے۔ اب آپ نے اس کام کے لئے اس کو پیسے نہیں دیئے تو یہ نہ دینا اللہ کے لئے ہوا۔

رسم کے طور پر ہدیہ دینا

ہمارے معاشرے میں نہ جانے کیسے کیسے رسم و رواج پڑ گئے ہیں کہ اس موقع پر فلاں تحفہ دیا جاتا ہے، اس موقع پر فلاں تحفہ دیا جاتا ہے، اس موقع پر یہ رسم ہے۔ اگر اس موقع پر نہیں دیں گے تو ناک کٹ جائیگی۔ اب اس موقع پر تحفہ دینے کا نہ تو شریعت نے کوئی حکم دیا اور نہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی حکم دیا۔ مثلاً تقریبات اور شادیوں میں "نیوتہ" دیا جاتا ہے، اس کو اس قدر لازمی

سمجھا جاتا ہے کہ چاہے کسی کے پاس پیسے ہوں یا نہ ہوں۔ چاہے وہ قرض لے، چاہے وہ حرام طریقے سے کما کر دے یا رشوت لے کر دے۔ لیکن یہ "نیوتہ" ضرور دے، اگر نہیں دے گا تو معاشرے میں ناک کٹ جائیگی۔ اب ایک شخص کے پاس دینے کے لئے پیسے موجود ہیں اور معاشرے کی طرف سے دینے کا مطالبہ بھی ہے لیکن وہ شخص صرف اس لئے نہیں دے رہا ہے کہ چاہے معاشرے کے اندر ناک کٹ جائے لیکن میرا اللہ تعالیٰ تو راضی ہو گا۔ اب یہ روکنا اللہ کے لئے ہو گا۔ یہ بھی ایمانِ کامل کی علامت ہے۔

تیسری علامت

تیسری علامت یہ بیان فرمائی کہ اگر محبت کرے تو اللہ کے لئے محبت کرے۔ دیکھئے۔ ایک محبت تو بغیر کسی شائبہ کے خالصۃً اللہ کے لئے ہوتی ہی ہے۔ جیسے کسی اللہ والے سے محبت ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے محبت اس وجہ سے نہیں ہوتی کہ اس سے پیسے کمائیں گے بلکہ اس سے محبت اس نیت سے ہوتی ہے کہ اس سے محبت اور تعلق رکھیں گے تو ہمارے دین کا فائدہ ہو گا اور اللہ تعالیٰ راضی ہوں گے۔ یہ محبت اللہ کے لئے ہے اور بڑی برکت کی اور بڑے فائدے کی چیز ہے۔

دنیا کی خاطر اللہ والوں سے تعلق

بعض اوقات شیطان اور انسان کا نفس اس محبت میں بھی صحیح راستے سے گمراہ کر دیتا ہے۔ مثلاً اولیاء اللہ سے اس تعلق کے وقت شیطان یہ نیت دل میں ڈال دیتا ہے کہ اگر ہم ان کے مقرب بنیں گے تو دنیا والوں کی نگاہ میں ہماری قدر و قیمت بڑھ جائے گی۔ العیاذ باللہ۔ یا مثلاً لوگ یہ کہیں گے یہ صاحب تو فلاں بزرگ کے خاص آدمی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو محبت خالص اللہ کے لئے ہونی چاہئے تھی وہ اللہ کے لئے نہیں ہوتی بلکہ وہ محبت دنیا داری کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ یا بعض لوگ

کسی اللہ والے کے ساتھ اس لئے رابطہ جوڑ لیتے ہیں کہ ان کے پاس ہر قسم کے لوگ آتے ہیں، صاحب منصب اور صاحب اقتدار بھی آتے ہیں اور بڑے بڑے مالدار لوگ بھی آتے ہیں۔ جب ہم ان بزرگ کے پاس جائیں گے تو ان لوگوں سے بھی تعلقات قائم ہونگے اور پھر اس تعلق کے ذریعہ ان سے اپنی ضروریات اور اپنے مقاصد پورے کریں گے۔ العیاذ باللہ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو محبت اللہ کے لئے ہونی تھی وہ دنیا حاصل کرنے کے لئے ہوگئی۔ لیکن اگر کوئی شخص کسی اللہ والے کے پاس یا کسی استاد کے پاس یا کسی شیخ کے پاس دین حاصل کرنے کے لئے جارہا ہے تو یہ محبت خالص اللہ کے لئے ہے اور حب فی اللہ میں داخل ہے اور اس محبت پر اللہ تعالیٰ نے بڑے ثمرات اور اجر و ثواب کا وعدہ فرمایا ہے۔

دنیاوی محبتوں کو اللہ کے لئے بنالو

لیکن اس محبت کے علاوہ جو دنیاوی محبتیں کہلاتی ہیں مثلاً ماں سے محبت ہے یا باپ سے محبت ہے یا بھائی بہن سے محبت ہے یا بیوی بچوں سے محبت ہے۔ رشتہ داروں سے محبت ہے، دوستوں سے محبت ہے۔ اگر انسان ذرا سا زاویہ نگاہ بدل لے تو یہ محبتیں بھی اللہ تعالیٰ کے لئے ہوجاتی ہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص والدین سے محبت اس نیت سے کرے کہ اللہ اور اللہ کے رسول جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ والدین سے محبت کرو۔ یہاں تک فرمادیا کہ اگر کوئی شخص والدین پر محبت سے ایک نظر ڈال لے تو اللہ تعالیٰ اس شخص کو ایک حج اور ایک عمرے کا ثواب عطا فرمائیں گے۔ اب بظاہر دیکھنے میں وہ شخص طبعی تقاضے کے نتیجے میں والدین سے محبت کررہا ہے لیکن حقیقت میں وہ محبت اللہ کے لئے ہے۔

بیوی سے محبت اللہ کے لئے ہو

بیوی سے محبت ہے۔ اب بظاہر تو یہ محبت نفسانی تقاضے سے ہے۔ لیکن اس

محبت میں اگر آدمی یہ نیت کرلے کہ اللہ اور اللہ کے رسول جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس محبت کا حکم دیا ہے اور میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت کی اتباع میں بیوی سے محبت کررہا ہوں تو یہی محبت اب اللہ کے لئے ہوگی۔ اب اگر ایک شخص اللہ کے لئے بیوی سے محبت کررہا ہے اور دوسرا شخص اپنی نفسانی خواہشات کے لئے بیوی سے محبت کررہا ہے تو بظاہر دیکھنے میں دونوں محبتیں ایک جیسی نظر آئیں گی، کوئی فرق معلوم نہیں ہوگا لیکن دونوں محبتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ احادیث میں یہ بات ثابت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ازواج مطہرات سے بڑی محبت فرماتے تھے اور ان کی دلداری کے لئے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں فرماتے تھے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ازواج مطہرات کے ساتھ ایسے ایسے معاملات نظر آتے ہیں جو بعض اوقات ہم جیسے لوگوں کو حیرت انگیز معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً حدیث شریف میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو گیارہ عورتوں کی کہانی سنائی کہ گیارہ عورتیں ایک جگہ جمع ہوئیں اور انہوں نے آپس میں یہ طے کیا کہ ہر عورت اپنے اپنے شوہر کا حال بیان کرے گی۔ پھر ایک عورت نے یہ کہا۔ دوسری عورت نے یہ کہا۔ تیسری نے یہ کہا۔ چوتھی نے یہ کہا وغیرہ۔ اب جس ذات گرامی پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی نازل ہورہی ہے اور جس ذات گرامی کا ہر وقت اللہ تعالیٰ سے رابطہ قائم ہے، وہ ذات گرامی اپنی بیوی کو گیارہ عورتوں کا قصہ سنا رہے ہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سفر پر تشریف لے جارہے تھے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ساتھ تھیں، راستے میں ایک کھلا میدان آیا تو آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ دوڑ لگاؤ گی؟ انہوں نے عرض کیا کہ ہاں۔ چنانچہ آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ اس میدان میں دوڑ لگائی۔ وہاں بے پردگی کا کوئی احتمال نہیں تھا۔ اس لئے کہ جنگل تھا اور کوئی دوسرا شخص ساتھ نہیں تھا۔

ہمارے کام نفسانی خواہش کے تابع

اب بظاہر یہ کام ایسے ہیں جن کا اللہ تعالیٰ سے یا اللہ کی عبادت سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ اسی طرح ہم میں سے کوئی شخص بیوی کی دلداری اور اس کی دلجوئی کے لئے اس قسم کا کوئی تفریح کا کام کرتا ہے تو وہ بھی بظاہر ایسا ہی لگتا ہے جیسے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم دلجوئی کا معاملہ فرمایا کرتے تھے۔ لیکن ہمارے اس کام میں اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اس کام میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ہم اس کام کو اپنی نفسانی خواہش اور نفسانی تقاضے کی بنیاد پر کرتے ہیں اور جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مقام بلند سے نیچے اتر کر اس کام کو اس لئے کر رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ بیوی کی دلداری کرو۔

"عارف" کون ہوتا ہے؟

صوفیاء کرام نے فرمایا کہ "عارف" یعنی جو اللہ کی معرفت اور شریعت و طریقت کی معرفت رکھتا ہو۔ وہ "عارف" مجموعہ اضداد ہوتا ہے۔ یعنی اس کی ذات میں اور اس کے عمل میں ایسی چیزیں جمع ہوتی ہیں جو بظاہر دیکھنے میں متضاد معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک طرف اس کا رابطہ اللہ تعالیٰ سے بھی جڑا ہوا ہے۔ تعلق مع اللہ بھی حاصل ہے اور ملکہ یادداشت بھی حاصل ہے۔ یعنی ہر وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر و فکر اور اس کی یاد دل میں بسی ہوئی ہے اور دوسری طرف لوگوں کے ساتھ اور گھر والوں کے ساتھ ہنس رہا ہے، بول بھی رہا ہے، کھا بھی رہا ہے، پی بھی رہا ہے۔ اس لئے ایسا شخص مجموعہ اضداد ہوتا ہے۔

مبتدی اور منتہی کے درمیان فرق

اسی طرح صوفیاء کرام نے فرمایا کہ جو آدمی مبتدی ہوتا ہے یعنی جس نے ابھی

طریقت کے راستے پر چلنا شروع کیا ہے اور دوسرا آدمی جو منتہی ہوتا ہے یعنی جو طریقت کا پورا راستہ طے کر کے آخری انجام تک پہنچ گیا ہے۔ ان دونوں کی ظاہری حالت ایک جیسی ہوتی ہے۔ بظاہر دونوں ایک جیسے نظر آتے ہیں اور جو آدمی درمیان میں ہوتا ہے اس کی حالت علیحدہ ہوتی ہے۔

مثلاً ایک شخص ہم جیسا مبتدی ہے جس نے ابھی دین کے راستے پر چلنا شروع کیا ہے تو وہ دنیا کے سارے کام کر رہا ہے۔ کھا رہا ہے، پی رہا ہے، ہنس بول رہا ہے، خرید و فروخت کر رہا ہے، بیوی بچوں کے ساتھ ہنسی مذاق کر رہا ہے۔ دوسری طرف حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کہ آپ بازار میں خرید و فروخت بھی کر رہے ہیں، مزدوری بھی کر رہے ہیں، بیوی بچوں کے ساتھ ہنس بول بھی رہے ہیں جبکہ آپ منتہی ہیں۔ اب بظاہر مبتدی اور منتہی کی حالت ایک جیسی نظر آرہی ہے۔ لیکن حقیقت میں دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اور ایک تیسرا آدمی ہے جو مبتدی سے ذرا آگے بڑھ گیا ہے اور درمیان راستے میں ہے۔ اس کی حالت الگ ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ نہ تو بازار میں جاتا ہے، نہ بیوی بچوں کے ساتھ ہنستا بولتا ہے اور ہر وقت اللہ کی یاد اور استغراق میں لگا ہوا ہے۔ صبح سے شام تک اس کے علاوہ اس کا کوئی مشغلہ نہیں ہے۔ یہ درمیان والا شخص ہے۔

مبتدی اور منتہی کی مثال

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان تینوں اشخاص کو ایک مثال کے ذریعہ سمجھاتے ہوئے فرمایا کہ جیسے ایک دریا ہے، ایک آدمی دریا کے اس کنارے پر کھڑا ہے اور دوسرا آدمی دریا پار کر کے دوسرے کنارے پر کھڑا ہے اور تیسرا آدمی دریا کے اندر ہے، دریا پار کر رہا ہے اور ہاتھ پاؤں چلا رہا ہے۔ اور اب بظاہر وہ شخص جو اس کنارے پر کھڑا ہے اور وہ شخص جو دوسرے کنارے پر کھڑا ہے۔ دونوں کی ظاہری حالت ایک جیسی ہے۔ یہ بھی ساحل

پر کھڑا ہے اور وہ بھی ساحل پر کھڑا ہے لیکن جو اس ساحل پر کھڑا ہے وہ ابھی تک دریا میں داخل ہی نہیں ہوا اور ابھی تک اس نے دریا کی موجوں کا مقابلہ نہیں کیا ہے لیکن جو شخص دوسرے ساحل پر کھڑا ہے وہ دریا پار کر کے اور دریا کی موجوں کا مقابلہ کر کے دوسرے ساحل پر پہنچ چکا ہے۔ اور تیسرا شخص ابھی دریا میں غوطے لگا رہا ہے اور دوسرے ساحل پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے اور موجوں سے لڑ رہا ہے۔ اب بظاہر یہ نظر آرہا ہے کہ یہ تیسرا شخص بڑا بہادر ہے جو دریا کی موجوں سے کھیل رہا ہے اور طوفانوں کا مقابلہ کر رہا ہے لیکن حقیقتاً بہادر وہ ہے جو ان موجوں اور طوفانوں کا مقابلہ کر کے دوسرے کنارے پر پہنچ چکا ہے۔ اور اب اس کی حالت اس شخص جیسی ہو گئی جو ابھی تک دریا میں داخل ہی نہیں ہوا۔ اس وجہ سے مبتدی اور منتہی کی حالت ایک جیسی نظر آتی ہے۔ لیکن حقیقت میں دونوں کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔

حب فی اللہ کے لئے مشق کی ضرورت

اب یہ کہ دنیاوی محبتیں بھی اللہ کے لئے ہو جائیں، یہ درجہ حاصل کرنے کے لئے انسان کو کچھ مشق کرنی پڑتی ہے۔ اور بزرگان دین اور صوفیاء کرام کے پاس جب کوئی شخص اپنی اصلاح کرانے کے لئے جاتا ہے تو یہ حضرات مشق کراتے ہیں کہ یہ ساری محبتیں اسی طرح رہیں لیکن ان محبتوں کا زاویہ بدل جائے اور ان کا طریقہ اس طرح بدل جائے کہ یہ محبتیں حقیقت میں اللہ کے لئے ہو جائیں۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے ان محبتوں کو بدلنے کی سالہا سال تک مشق کی ہے تب جاکر اس میں کامیابی ہوئی اور اس طرح مشق کی ہے کہ مثلاً گھر میں داخل ہوئے، کھانے کا وقت ہے بھوک لگی ہوئی ہے اب کھانا کھانے کے لئے بیٹھے اور کھانا سامنے آیا۔ اب دل چاہ رہا ہے کہ جلدی سے کھانا شروع کر دیں لیکن ایک لمحے کے لئے رک گئے اور دل میں یہ خیال لائے کہ

نفس کے تقاضے سے کھانا نہیں کھائیں گے۔ پھر یہ سوچا کہ اللہ تعالیٰ نے میرے نفس کا مجھ پر حق رکھا ہے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت یہ تھی کہ آپ کے سامنے جب کھانا آتا تو آپ شکر ادا کرتے ہوئے اور اس کھانے کی طرف اپنی احتیاج ظاہر کرتے ہوئے کھانا کھالیا کرتے تھے۔ مجھے آپ کی اس سنت کی اتباع کرنی چاہئے۔ لہٰذا آپ کی اتباع میں کھانا کھاتا ہوں۔ پھر کھانا شروع کیا۔ اس طرح زاویہ نگاہ بدل دیا۔

بچوں کے ساتھ اللہ کے لئے محبت

اسی طرح گھر میں داخل ہوئے۔ دیکھا کہ بچہ کھیل رہا ہے اور وہ بچہ کھیلتا ہوا اچھا لگا اور دل چاہا کہ اس کو گود میں اٹھا کر اس کو پیار کروں۔ اس کے ساتھ کھیلوں۔ لیکن ایک لمحے کے لئے رک گئے اور یہ سوچا کہ اپنے نفس کے تقاضے سے بچے سے پیار نہیں کریں گے۔ پھر دوسرے لمحے دل میں خیال لائے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت یہ تھی کہ آپ بچوں سے محبت فرمایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے روز مسجد نبوی میں جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے، اتنے میں حضرت حسن یا حضرت حسین رضی اللہ عنہما گرتے پڑتے مسجد نبوی میں پہنچ گئے۔ جب آپ نے ان کو آتا دیکھا تو فوراً منبر سے اُترے اور ان کو گود میں اٹھالیا۔ ایک مرتبہ آپ نوافل پڑھ رہے تھے، حضرت امامہ رضی اللہ عنہا جو بچی تھیں وہ آکر آپ کے کندھے پر کسی طرح سوار ہوگئیں۔ جب آپ رکوع میں جانے لگے تو آپ نے ان کو آہستہ سے اٹھا کر نیچے اتار دیا۔ جب آپ سجدے میں گئے تو پھر وہ آپ کے اوپر سوار ہوگئیں۔ بہرحال، بچوں کے ساتھ پیار کرنا، محبت کرنا، ان کے ساتھ کھیلنا، یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ اس سنت کی اتباع میں میں بھی بچے سے پیار کرتا ہوں اور ان کے ساتھ کھیلتا ہوں۔ یہ تصور کرکے بچے کو اٹھا لیا اور سنت کا استحضار کرلیا۔ شروع شروع میں آدمی تکلف سے یہ کام کرتا ہے لیکن

بار بار کرنے کے نتیجے میں تکلف باقی نہیں رہتا بلکہ وہ کام طبیعت بن جاتا ہے اور پھر اس کے بعد ساری محبتیں اللہ کے لئے ہو جاتی ہیں۔ چاہے بیوی سے محبت ہو یا بچوں سے محبت ہو یا چاہے والدین سے محبت ہو۔

یہ نسخہ تو بہت آسان ہے۔ اس سے زیادہ آسان نسخہ اور کیا ہو گا کہ سب کام جو تم کرتے ہو اسی طرح کرتے رہو، صرف زاویہ نگاہ بدل لو اور نیتوں کے اندر تبدیلی لے آؤ۔ لیکن اس آسان نسخہ پر عمل اس وقت ہو گا جس انسان اس کے لئے تھوڑی سی محنت اور مشقت کرے اور ہر ہر قدم پر اس مشق کو کرنے کی کوشش کرے۔ پھر ایک وقت ایسا آئے گا کہ یہ ساری محبتیں اللہ کے لئے ہو جائیں گی۔

حب فی اللہ کی علامت

اب دیکھنا یہ ہے کہ اللہ کے لئے محبت ہونے کی علامت کیا ہے؟ اس کی علامت یہ ہے کہ اگر کسی وقت اللہ کی محبت کا یہ تقاضہ ہو کہ میں ان محبتوں کو خیرباد کہہ دوں اور چھوڑ دوں تو اس وقت انسان کی طبیعت پر ناقابل برداشت بوجھ نہ ہو۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ محبت اللہ کے لئے ہے۔

حضرت تھانویؒ کا ایک واقعہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک بات یاد آگئی۔ وہ یہ کہ ایک مرتبہ آپ نے حاضرین مجلس سے فرمایا کہ آج اللہ تعالیٰ نے اپنے امتحان کا ایک عجیب موقع عطا فرمایا۔ وہ یہ کہ جب میں گھر گیا اور اہلیہ سے بات ہوئی تو اہلیہ نے تلخ لہجے میں کوئی بات کہہ دی۔ اس وقت میرے منہ سے یہ نکلا کہ "بی بی مجھے اس لہجے کی برداشت نہیں اور اگر تم کہو تو میں یہ کرنے کے لئے تیار ہوں کہ اپنی چارپائی اٹھا کر خانقاہ میں ڈال لوں اور ساری عمر وہیں گزار دوں، لیکن مجھے اس لہجے کی برداشت نہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ میں نے اپنی اہلیہ سے یہ بات کہہ تو دی لیکن بعد میں میں نے

سوچا اور اپنا جائزہ لیا کہ بڑی بات کہہ دی کہ چارپائی اٹھا کر خانقاہ میں ڈال دوں اور ساری عمر اس طرح گزار دوں۔ کیا تم اس کام کے کرنے پر قادر بھی ہو؟ اگر اہلیہ کہہ دے کہ چلو ایسا کرلو تو کیا ایسا کرلوگے؟ اور ساری عمر خانقاہ میں گزار دو گے یا ویسے ہی جھوٹا دعوی کردیا؟ لیکن جائزہ لینے کے بعد یہ محسوس ہوا کہ الحمدللہ میں اس کام پر قادر ہوں۔ چونکہ ساری محبتیں اللہ کے لئے ہوگئی ہیں اس لئے اب اگر کسی وقت اللہ کی محبت کی خاطر دوسری محبت کو چھوڑنا پڑے تو اس وقت کوئی ناقابل برداشت بوجھ نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ محبت تبدیل ہو کر اللہ کے لئے محبت بن گئی ہے۔

لیکن یہ مقام اتنی آسانی سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے محنت اور مشق کرنی پڑتی ہے اور یہ محنت اور مشق ایسی چیز نہیں ہے جو ناممکن ہو بلکہ ہر انسان کرسکتا ہے۔ پھر اس محنت اور مشق کے نتیجے میں اللہ تعالی مقام عطا فرمادیتے ہیں وہ کرکے دیکھنے کی بات ہے۔ یہ سب "احب للہ" اللہ کے لئے محبت میں داخل ہے۔

چوتھی علامت

چوتھی علامت ہے "وابغض للہ" بغض اور غصہ بھی اللہ کے لئے ہو۔ یعنی جس کسی پر غصہ ہے یا جس کسی سے بغض ہے وہ اس کی ذات سے نہیں ہے بلکہ اس کے کسی برے عمل سے ہے یا اس کی کسی ایسی بات سے ہے جو مالک حقیقی کی ناراضگی کا سبب ہے تو یہ غصہ اور ناراضگی اللہ تعالی ہی کے لئے ہے۔

ذات سے نفرت نہ کریں

اس لئے بزرگوں نے ایک بات فرمائی ہے جو ہمیشہ یاد رکھنے کی ہے۔ وہ یہ کہ نفرت اور بغض کافر سے نہیں بلکہ اس کے کفر سے ہے، فاسق سے بغض نہیں بلکہ اس کے فسق سے بغض ہے۔ نفرت اور بغض گناہ گار سے نہیں بلکہ گناہ سے ہے۔

جو آدمی فسق و فجور اور گناہ کے اندر مبتلا ہے اس کی ذات غصہ کا محل نہیں بلکہ اس کا فعل غصہ کا محل ہے۔ اس لئے کہ ذات تو قابل رحم ہے۔ وہ بیچارہ بیمار ہے، کفر کی بیماری میں مبتلا ہے، فسق کی بیماری میں مبتلا ہے اور نفرت بیمار سے نہیں ہوتی بلکہ بیماری سے ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اگر بیمار سے نفرت کروگے تو پھر اس کی کون دیکھ بھال کریگا؟ لہٰذا فسق و فجور سے اور کفر سے نفرت ہوگی اس کی ذات سے نہیں ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ اگر اس کی ذات فسق و فجور سے باز آجائے تو وہ ذات گلے لگانے کے لائق ہے۔ اس لئے کہ ذات کے اعتبار سے اس سے کوئی پرخاش اور کوئی ضد نہیں۔

اس بارے میں حضور اقدس ﷺ کا طرز عمل

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کو دیکھئے: وہ ذات جس نے آپ کے محبوب چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا کلیجہ نکال کر کچا چبایا یعنی حضرت ہندہ رضی اللہ عنہا اور جو اس کے سبب بنے یعنی حضرت وحشی رضی اللہ عنہ، جب یہ دونوں اسلام کے دائرے میں داخل ہوگئے اور اسلام قبول کرلیا تو اب وہ آپ کے اسلامی بہن اور بھائی بن گئے۔ آج حضرت وحشی کے نام کے ساتھ "رضی اللہ تعالیٰ عنہ" کہتے ہیں۔ ہندہ جنہوں نے کلیجہ چبایا تھا آج ان کے نام کے ساتھ "رضی اللہ تعالیٰ عنہا" کہا جاتا ہے۔ بات اصل یہ تھی کہ ان کی ذات سے کوئی نفرت نہیں تھی بلکہ ان کے فعل اور ان کے اعتقاد سے نفرت تھی۔ پھر جب بھی توبہ کے ساتھ وہ برا فعل اور برا اعتقاد ختم ہوگیا تو اب ان سے نفرت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کا ایک واقعہ

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ، اولیاء اللہ میں اونچا مقام رکھتے ہیں۔ ان کے زمانے میں ایک بڑے عالم اور فقیہ اور مفتی مولانا حکیم ضیاء الدین

صاحب بھی موجود تھے۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء بحیثیت "صوفی" کے مشہور تھے اور یہ بڑے عالم "مفتی اور فقیہ" کی حیثیت سے مشہور تھے۔ حضرت خواجہ نظام الاولیاء رحمۃ اللہ علیہ "سماع" کو جائز کہتے تھے۔ بہت سے صوفیاء کے یہاں سماع کا رواج تھا۔ سماع کا مطلب ہے کہ موسیقی کے آلات کے بغیر حمد و نعت وغیرہ کے مضامین کے اشعار ترنم سے یا بغیر ترنم کے محض خوش آواز سے کسی کا پڑھنا اور دوسروں کا اسے خوش عقیدگی اور محبت سے سننا۔ بعض صوفیاء اس کی اجازت دیتے تھے اور بہت سے فقہاء اور مفتی حضرات اس سماع کو بھی جائز نہیں کہتے تھے بلکہ "بدعت" قرار دیتے تھے۔ چنانچہ ان کے زمانے کے مولانا حکیم ضیاء الدین صاحب نے بھی "سماع" کے ناجائز ہونے کا فتویٰ دیا تھا۔ اور حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ "سماع" سنتے تھے۔

جب مولانا حکیم ضیاء الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کا وقت قریب آیا تو حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ حضرت کی عیادت اور مزاج پرسی کے لئے تشریف لے گئے اور اطلاع کروائی کہ جاکر حکیم ضیاء الدین صاحب سے عرض کیا جائے کہ نظام الدین مزاج پرسی کے لئے حاضر ہوا ہے۔ اندر سے حکیم ضیاء الدین صاحب نے جواب دیا کہ ان کو باہر روک دیں، میں کسی بدعتی کی صورت دیکھنا نہیں چاہتا۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ نے جواب بھجوایا کہ ان سے عرض کرو کہ بدعتی بدعت سے توبہ کرنے کے لئے حاضر ہوا ہے۔ اسی وقت مولانا حکیم ضیاء الدین رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی پگڑی بھیجی کہ اسے بچھاکر خواجہ صاحب اس کے اوپر قدم رکھتے ہوئے آئیں اور جوتے سے قدم رکھیں، ننگے پاؤں نہ آئیں۔ خواجہ صاحب نے پگڑی کو اٹھاکر سر پر رکھا اور کہا کہ یہ میرے لئے دستار فضیلت ہے۔ اس شان سے اندر تشریف لے گئے۔ آکر مصافحہ کیا اور بیٹھ گئے اور حکیم ضیاء الدینؒ کی طرف متوجہ رہے۔ پھر خواجہ صاحب کی موجودگی میں حکیم ضیاء الدین کی وفات کا وقت آگیا۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ الحمدللہ حکیم ضیاء الدین

صاحبؒ کو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمایا کہ ترقی مدارج کے ساتھ ان کا انتقال ہوا۔

غصہ بھی اللہ کے لئے ہو

بہرحال جو بغض اور غصہ اللہ کے لئے ہوتا ہے وہ کبھی ذاتی دشمنیاں پیدا نہیں کرتا اور وہ عداوتیں پیدا نہیں کرتا وہ فتنے پیدا نہیں کرتا، کیونکہ جس آدمی سے بغض کیا جارہا ہے اور جس پر غصہ کیا جارہا ہے وہ بھی جانتا ہے کہ اس کو میری ذات سے دشمنی نہیں ہے بلکہ میرے خاص فعل سے اور خاص حرکت سے ہے۔ اسی وجہ سے وہ اس کی بات کا برا نہیں مانتا۔ اس لئے کہ جانتا ہے کہ یہ کچھ کہہ رہا ہے اللہ کے لئے کہہ رہا ہے۔ اس کو فرماتے ہیں:

﴿من احب للّٰہ وابغض للّٰہ﴾

یعنی جس سے تعلق اور محبت ہے تو وہ بھی اللہ کے لئے ہے اور جس سے بغض اور نفرت ہے تو وہ بھی اللہ کے لئے ہے۔ تو یہ غصہ کا بہترین محل ہے بشرطیکہ یہ غصہ شرعی حد کے اندر ہو۔ اللہ تعالیٰ یہ نعمت ہم کو عطا فرمادے کہ محبت ہو تو اللہ کے لئے ہو، غصہ اور بغض ہو تو وہ اللہ کے لئے ہو۔

لیکن یہ غصہ ایسا ہونا چاہئے کہ اس کے منہ میں لگام پڑی ہوئی ہو کہ جہاں اللہ کے لئے غصہ کرنا ہے وہاں تو ہو اور جہاں غصہ نہیں کرنا ہے وہاں لگام ڈال کر اس کو روک دو۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا واقعہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دیکھئے: ایک یہودی نے آپ کے سامنے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کا کلمہ کہہ دیا۔ العیاذ باللہ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کہاں برداشت کرسکتے تھے، فوراً اس کو پکڑ کر اوپر اٹھایا اور پھر زمین پر

پٹخ دیا اور اس کے سینے پر سوار ہو گئے۔ یہودی نے جب یہ دیکھا کہ اب میرا قابو تو ان کے اوپر نہیں چل رہا ہے تو اس نے لیٹے لیٹے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے منہ پر تھوک دیا۔ جیسے کہاوت ہے کہ "کھسیانی بلی کھمبا نوچے" لیکن جیسے ہی اس یہودی نے تھوکا، آپ فوراً اس کو چھوڑ کر الگ ہو گئے۔ لوگوں نے آپ سے کہا کہ حضرت! اس نے اور زیادہ گستاخی کا کام کیا کہ آپ کے منہ پر تھوک دیا۔ ایسے میں آپ اس کو چھوڑ کر الگ کیوں ہو گئے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بات اصل میں یہ ہے کہ پہلے اس پر جو میں نے حملہ کیا تھا اور اس کو مارنے کا ارادہ کیا تھا وہ حضور اقدس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں کیا تھا۔ اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی جس کی وجہ سے مجھے غصہ آگیا اور میں نے اس کو گرا دیا۔ پھر جب اس نے میرے منہ پر تھوک دیا تو اب مجھے اور زیادہ غصہ آیا لیکن اب اگر میں اس غصہ پر عمل کرتے ہوئے اس سے بدلہ لیتا تو یہ بدلہ لینا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے نہ ہوتا بلکہ اپنی ذات کے لئے ہوتا، اور اس وجہ سے ہوتا کہ چونکہ اس نے میرے منہ پر تھوکا ہے، لہٰذا میں اس کو اور زیادہ ماروں۔ تو اس صورت میں یہ غصہ اللہ اور اس کے رسول کے لئے نہ ہوتا بلکہ اپنی ذات کے لئے ہوتا۔ اس وجہ سے میں اس کو چھوڑ کر الگ ہو گیا۔

یہ درحقیقت اس حدیث من احب للّٰہ وابغض للّٰہ پر عمل فرما کر دکھا دیا۔ گویا کہ غصہ کے منہ میں لگام دے رکھی ہے کہ جہاں تک اس غصہ کا شرعی اور جائز موقع ہے، بس وہاں تک تو غصہ کرتا ہے۔ اور جہاں اس غصہ کا جائز موقع ختم ہو جائے تو اس کے بعد آدمی اس غصے سے اس طرح دور ہو جائے کہ جیسے اس سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ انہیں حضرات کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کان وقافا عند حدود اللّٰہ یعنی یہ اللہ کی حدود کے آگے ٹھہر جانے والے لوگ تھے۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا واقعہ

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ مسجد نبوی میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے گھر کا پرنالہ مسجد نبوی کی طرف لگا ہوا ہے، بارش وغیرہ کا پانی مسجد نبوی کے اندر گرتا تھا گویا کہ مسجد کی فضا میں وہ پرنالہ لگا ہوا تھا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے سوچا کہ مسجد تو اللہ تعالیٰ کا گھر ہے اور کسی شخص کے ذاتی گھر کا پرنالہ مسجد کے اندر آرہا ہو تو یہ اللہ کے حکم کے خلاف ہے۔ چنانچہ آپ نے اس پرنالے کو توڑنے کا حکم دے دیا اور وہ توڑ دیا گیا۔ اب دیکھئے کہ آپ نے اس پرنالے کو توڑنے کا جو حکم دیا یہ غصے کی وجہ سے تو دیا لیکن غصہ اس بات پر آیا کہ یہ کام مسجد کے احکام اور آداب کے خلاف ہے۔ جب حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو پتہ چلا کہ میرے گھر کا پرنالہ توڑ دیا گیا ہے تو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور ان سے فرمایا کہ آپ نے یہ پرنالہ کیوں توڑ دیا؟ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ جگہ تو مسجد کی ہے، کسی کی ذاتی جگہ نہیں ہے۔ مسجد کی جگہ میں کسی کا پرنالہ آنا شریعت کے حکم کے خلاف تھا اس لئے میں نے توڑ دیا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آپ کو پتہ بھی ہے کہ یہ پرنالہ یہاں پر کس طرح لگا تھا؟ یہ پرنالہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں لگا تھا اور آپ کی اجازت سے میں نے لگایا تھا۔ آپ اس کو توڑنے والے کون ہوتے ہیں؟ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کیا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی تھی؟ انہوں نے فرمایا کہ ہاں! اجازت دی تھی۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ خدا کے لئے میرے ساتھ آؤ۔ چنانچہ اس پرنالے کی جگہ کے پاس گئے اور وہاں جاکر خود رکوع کی حالت میں کھڑے ہوگئے اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اب میری کمر پر کھڑے ہو کر یہ پرنالہ دوبارہ لگاؤ۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں دوسروں سے لگوالوں گا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ عمر (رضی اللہ عنہ) کی یہ مجال کہ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لگائے ہوئے پرنالے کو توڑ دے۔ مجھ سے یہ اتنا بڑا جرم سرزد ہوا، اس کی کم سے کم سزا یہ ہے کہ میں رکوع میں کھڑا ہوتا ہوں اور تم میری کمر پر کھڑے ہو کر یہ پرنالہ لگاؤ۔ چنانچہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے ان کی کمر پر کھڑے ہو کر وہ پرنالہ اس کی جگہ پر واپس لگادیا۔ وہ پرنالہ آج بھی مسجد نبوی میں لگا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جزائے خیر دے جن لوگوں نے مسجد نبوی کی تعمیر کی ہے، انہوں نے اب بھی اس جگہ پر پرنالہ لگادیا ہے۔ اگرچہ اب اس پرنالے کا بظاہر کوئی مصرف نہیں ہے لیکن یادگار کے طور پر لگادیا ہے۔ یہ درحقیقت اس حدیث پر عمل ہے من احب للّٰہ وابغض للّٰہ پہلے جو غصہ اور بغض ہوا تھا وہ اللہ کے لئے ہوا تھا اور اب جو محبت ہے وہ بھی اللہ کے لئے ہے۔ جو شخص یہ کام کرلے اس نے اپنا ایمان کامل بنالیا۔ یہ ایمان کے کامل ہونے کی علامت ہے۔

مصنوعی غصہ کرکے ڈانٹ لیں

بہرحال، اس بغض فی اللہ کی وجہ سے بعض اوقات غصے کا اظہار کرنا پڑتا ہے۔ خاص طور سے ان لوگوں پر غصہ کا اظہار کرنا پڑتا ہے جو زیر تربیت ہوتے ہیں۔ جیسے استاد ہے اس کو اپنے شاگردوں پر غصہ کرنا پڑتا ہے۔ باپ کو اپنی اولاد پر غصہ کرنا پڑتا ہے۔ شیخ کو اپنے مریدوں پر غصہ کرنا پڑتا ہے۔ لیکن یہ غصہ اس حد تک ہونا چاہئے جتنا اس کی اصلاح کے لئے ضروری ہو۔ اس سے آگے نہ بڑھے۔ جیسا کہ ابھی عرض کیا کہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ جب انسان کی طبیعت میں اشتعال ہو، اس وقت غصہ نہ کرے۔ مثلاً استاد کو شاگرد پر غصہ آگیا اور اشتعال پیدا ہوگیا۔ اس اشتعال اور غصہ کے وقت ڈانٹ ڈپٹ اور مارپیٹ نہ کرے بلکہ جب طبیعت میں وہ اشتعال اور غصہ ختم ہوجائے اس وقت مصنوعی غصہ کرکے ڈانٹ ڈپٹ کرلے تاکہ

یہ ڈانٹ ڈپٹ حد سے متجاوز نہ ہو۔ یہ کام ذرا مشکل ہے کیونکہ انسان غصہ کے وقت بے قابو ہو جاتا ہے۔ لیکن جب تک اس کی مشق نہیں کریگا اس وقت تک اس غصہ کے مفاسد اور برائیوں سے نجات نہیں ملے گی۔

چھوٹوں پر زیادتی کا نتیجہ

اور پھر جو زیر تربیت افراد ہوتے ہیں جیسے اولاد، شاگرد، مرید، ان پر اگر غصہ کے وقت حد سے تجاوز ہو جائے تو بعض صورتوں میں یہ بات بڑی خطرناک ہو جاتی ہے کیونکہ جس پر غصہ کیا جارہا ہے وہ اگر آپ سے بڑا ہے یا برابر کا ہے تو آپ کے غصہ کرنے کے نتیجے میں اس کو جو ناگواری ہوگی اس کا اظہار بھی کردے گا اور وہ بتادیگا کہ تمہاری یہ بات مجھے اچھی نہیں لگی، یا کم از کم بدلہ لے لے گا لیکن جو تمہارا ماتحت اور چھوٹا ہے وہ تم سے بدلہ لینے پر تو قادر نہیں ہے بلکہ اپنی ناگواری کے اظہار پر بھی قادر نہیں۔ چنانچہ کوئی بیٹا اپنے باپ سے یا شاگرد اپنے استاد سے یا مرید اپنے شیخ سے یہ نہیں کہے گا کہ آپ نے فلاں وقت جو بات کہی تھی وہ مجھے ناگوار ہوئی۔ اس لئے آپ کو پتہ ہی نہیں چلے گا کہ آپ نے اس کی کتنی دل شکنی کی ہے، اور جب پتہ نہیں چلے گا تو معافی مانگنا بھی آسان نہیں ہوگا۔ اس لئے یہ بہت نازک معاملہ ہے اور خاص طور سے جو چھوٹے بچوں کو پڑھانے والے اساتذہ ہوتے ہیں، ان کے بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان کا معاملہ تو بہت ہی نازک ہے۔ اس لئے کہ وہ نابالغ بچے ہیں اور نابالغ کا معاملہ یہ ہے کہ اگر وہ معاف بھی کردے تو معافی نہیں ہوتی کیونکہ نابالغ کی معافی معتبر نہیں۔

خلاصہ

بہرحال، آج کی مجلس کا خلاصہ یہ ہے کہ اپنے غصہ پر قابو پانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اس لئے کہ یہ غصہ بے شمار برائیوں کی جڑ ہے اور اس کے ذریعہ بے شمار

باطنی امراض پیدا ہوتے ہیں۔ ابتداء میں تو یہ کوشش کرے کہ غصہ کا اظہار بالکل نہ ہو، بعد میں جب یہ غصہ قابو میں آجائے تو اس وقت یہ دیکھے کہ کہاں غصہ کا موقع ہے اور کہاں غصہ کا موقع نہیں۔ جہاں غصہ کا جائز محل ہو بس وہاں جائز حد تک غصہ کرے اس سے زیادہ نہ کرے۔

غصہ کا غلط استعمال

جیسا کہ ابھی میں نے بتایا کہ بغض فی اللہ یعنی اللہ کے لئے غصہ کرنا چاہئے۔ لیکن بعض لوگ اس کا انتہائی غلط استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ زبان سے تو یہ کہتے ہیں کہ ہمارا یہ غصہ اللہ کے لئے ہے لیکن حقیقت میں وہ غصہ نفسانیت اور تکبر اور دوسرے کی حقارت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ مثلاً جب اللہ تعالیٰ نے ذرا سی دین پر چلنے کی توفیق دے دی اور دین پر ابھی چلنا شروع کیا تو اب ساری دنیا کے لوگوں کو حقیر سمجھنے لگے۔ میرا باپ بھی حقیر ہے، میری ماں بھی حقیر ہے، میرا بھائی بھی حقیر ہے، میری بہن بھی حقیر ہے، میرے سارے گھر والے حقیر ہیں۔ ان سب کو حقیر سمجھنا شروع کردیا اور یہ سمجھنے لگا کہ یہ سب تو جہنمی ہیں، میں جنتی ہوں اور مجھے اللہ تعالیٰ نے ان جہنمیوں کی اصلاح کے لئے پیدا کیا ہے۔ اب ان کی اصلاح کے لئے ان پر غصہ کرنا اور ان کے لئے نازیبا الفاظ کا استعمال کرنا اور ان کی تحقیر کرنی اور ان کے حقوق تلف کرنا شروع کردیا۔ اور پھر شیطان یہ سبق پڑھاتا ہے کہ میں جو کچھ کررہا ہوں یہ بغض فی اللہ کے ماتحت کررہا ہوں حالانکہ حقیقت میں یہ سب نفسانیت کے تحت کرتا ہے۔

چنانچہ جو لوگ دین پر نئے نئے چلنے والے ہوتے ہیں۔ شیطان ان کو اس طرح بہکاتا ہے کہ ان کو بغض فی اللہ کا سبق پڑھا کر ان سے دوسرے مسلمانوں کی تحقیر اور تذلیل کراتا ہے، اور اس کے نتیجے میں لڑائیاں، جھگڑے اور فساد ہوتے ہیں۔ بات بات پر لوگوں پر غصہ کرتے ہیں۔ بات بات پر لوگوں کو ٹوک دیتے ہیں۔

اس کے نتیجے میں فساد پھیل رہا ہے۔

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کا ایک جملہ

حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک جملہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ حق بات، حق نیت سے، حق طریقے سے کہی جائے تو وہ کبھی بے اثر نہیں رہتی اور کبھی فتنہ و فساد پیدا نہیں کرتی۔ گویا کہ تین شرطیں بیان فرمادیں۔ نمبرایک بات حق ہو، نمبردو نیت حق ہو، نمبرتین طریقہ حق ہو۔ مثلاً ایک شخص کسی برائی کے اندر جتلا ہے اب اس پر ترس کھا کر نرمی اور شفقت سے اس کو سمجھائے تاکہ وہ اس برائی سے کسی طرح نکل جائے۔ یہ نیت ہو، اس میں اپنی بڑائی مقصود نہ ہو اور دوسروں کو ذلیل کرنا مقصود نہ ہو اور طریقہ بھی حق ہو یعنی نرمی اور محبت سے بات کہے۔ اگر یہ تین شرطیں پائی جائیں تو فتنہ پیدا نہیں ہوتا۔ اور جہاں کہیں یہ دیکھو کہ حق بات کہنے کے نتیجے میں فتنہ کھڑا ہوگیا تو غالب گمان یہ ہے کہ اس کا سبب یہ ہے کہ ان تینوں باتوں میں سے کوئی ایک بات موجود نہیں تھی یا تو بات حق نہ تھی یا نیت حق نہیں تھی یا طریقہ حق نہیں تھا۔

تم خدائی فوجدار نہیں ہو

یہ بات یاد رکھیں کہ تم خدائی فوجدار بن کر دنیا میں نہیں آئے۔ تمہارا کام صرف اتنا ہے کہ حق بات حق نیت اور حق طریقے سے دوسروں کو پہنچاؤ اور مناسب طریقے سے مسلسل پہنچاتے رہو۔ اس کام سے کبھی مت اکتاؤ۔ لیکن ایسا کوئی کام مت کرو جس سے فتنہ پیدا ہو۔

اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اور اپنے فضل و کرم سے ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

مسلمان تاجر کے فرائض

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱، لیاقت آباد کراچی ۱۹

تاریخ خطاب : ۲۰ر جولائی ۱۹۹۳ء

مقام خطاب : ایوانِ صنعت وتجارت کراچی

وقت خطاب : بعد نماز عصر تا مغرب

اصلاحی خطبات : جلد نمبر ۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

موجودہ دور میں
مسلمان تاجر کے فرائض

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره و نؤمن به ونتوكل عليه، ونعوذ بالله من شرور انفسنا ومن سيئات اعمالنا، من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادي له، ونشهد ان لا اله الا الله وحده لاشريك له، ونشهد ان سيدنا وسندنا ومولانا محمدًا عبده ورسوله، صلى الله تعالى عليه وعلى آله واصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيرًا كثيرا۔

اما بعد!

فاعوذ بالله من الشيطن الرجيم۔ بسم الله الرحمن الرحيم

﴿وابتغ فيما اتك الله الدار الاخرة ولا تنس نصيبك من الدنيا واحسن كما احسن الله اليك ولا تبغ الفساد في الارض۔ (سورة القصص: ۷۷)

امنت بالله صدق الله مولانا العظيم وصدق رسوله النبي الكريم. ونحن على ذلك من الشاهدين والشاكرين والحمد لله رب العالمين﴾

تمہید

معزز حاضرین کرام! یہ میرے لئے خوشی اور افتخار کا باعث ہے کہ آج آپ حضرات سے ایک دینی موضوع پر گفتگو کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ آپ کا یہ ادارہ جس کو "ایوان صنعت و تجارت" کہا جاتا ہے، یہاں عام طور پر جن لوگوں کو خطاب کرنے کی دعوت دی جاتی ہے، وہ لوگ یہاں آکر یا تو تجارت کے موضوع پر خطاب کرتے ہیں یا سیاست کے موضوع پر خطاب کرتے ہیں۔ میرا معاملہ یہ ہے کہ میرا سیاست سے بھی عملی طور پر کوئی تعلق نہیں ہے اور تجارت سے بھی کوئی عملی رابطہ نہیں ہے۔ میں دین کا طالب علم ہوں، اور جہاں کہیں کوئی بات کرنے کا موقع ملتا ہے تو اس کا موضوع دین ہی سے متعلق ہوتا ہے، لہٰذا آج کی اس نشست میں اسی موضوع پر چند گزارشات آپ کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اور دین ایسی چیز ہے کہ زندگی کا کوئی گوشہ اور کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں اس میں کوئی بات نہ کہی گئی ہو۔

آج کا موضوع

اللہ تبارک و تعالیٰ نے جو دین ہمیں عطا فرمایا ہے وہ صرف مسجد اور عبادت گاہوں کی حد تک محدود نہیں، بلکہ وہ زندگی کے ہر شعبے اور ہر گوشے پر حاوی ہے، چنانچہ آج کی گفتگو کے لئے مجھ سے یہ فرمائش کی گئی ہے کہ میں "موجودہ دور میں مسلمان تاجر کے فرائض" کے موضوع پر گفتگو کروں۔ چنانچہ اسی موضوع پر چند گزارشات آپ کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اخلاص کے ساتھ صحیح بات، حق طریقے سے، حق نیت سے کہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

دین صرف مسجد تک محدود نہیں

بات دراصل یہ ہے کہ جب سے ہماری امت پر سیاسی اور سماجی زوال کا آغاز ہوا، اس وقت سے یہ عجیب و غریب فضا بن گئی کہ دین کو ہم نے دوسرے مذاہب کی طرح صرف چند عبادتوں کی حد تک محدود کر دیا ہے، جب تک ہم مسجد میں ہیں، یا اپنے گھر میں عبادت انجام دے رہے ہیں، اس وقت تو ہمیں اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام یاد آجاتے ہیں۔ لیکن جب ہم زندگی کی عملی کشاکش میں داخل ہوتے ہیں اور بازار میں پہنچتے ہیں، یا سیاست کے ایوانوں میں پہنچتے ہیں، یا معاشرے کے دوسرے عملی گوشوں میں داخل ہوتے ہیں تو اس وقت دین کے احکام اور دین کی تعلیمات ہمارے ذہنوں میں نہیں رہتیں۔

تلاوت قرآن کریم سے آغاز

ہمارے درمیان یہ بڑا اچھا رواج جاری ہے کہ ہماری امت مسلمہ میں ہر مجلس کا آغاز تلاوت قرآن کریم سے ہوتا ہے، وہ چاہے اسمبلی کی محفل ہو، یا اقتدار کی کوئی تقریب ہو، یا ایوان و صنعت و تجارت کی کوئی تقریب ہو، الحمد للہ سب سے پہلے اللہ کا کلام پڑھا جاتا ہے۔ لیکن یہ کتنی ستم ظریفی ہے کہ جس وقت وہ کلام پڑھا جارہا ہے اس وقت تک تو اس کے احترام اور اس کی تعظیم و تکریم کا خیال ذہن میں آتا ہے، لیکن جونہی اس قرآن کریم کی تلاوت ختم ہوتی ہے اور اس کے بعد عملی جدوجہد کا آغاز ہوتا ہے، اس مرحلے پر وہ قرآن کریم یاد نہیں رہتا۔

قرآن کریم ہم سے فریاد کر رہا ہے

ہمارے دور کے ایک شاعر گزرے ہیں "ماہر القادری صاحب مرحوم" انہوں نے قرآن کریم کی فریاد پر ایک نظم کہی ہے، اس نظم میں انہوں نے قرآن کریم کو ایک

فریادی کی شکل میں دکھایا ہے۔ وہ اس طرح فریاد کررہا ہے کہ:

طاقوں میں سجایا جاتا ہوں
خوشبو میں بسایا جاتا ہوں
جب قول و قسم لینے کے لئے
تکرار کی نوبت آتی ہے
پھر میری ضرورت پڑتی ہے
ہاتھوں میں اٹھایا جاتا ہوں

یعنی مجھے ہر وقت طاقوں میں سجا کر رکھا ہوا ہے، خوشبو میں بسا کر رکھا ہوا ہے، اور ہر مجلس کا آغاز میری تلاوت سے ہوتا ہے، مجھ سے برکت حاصل کی جاتی ہے، اور جب لوگوں کے درمیان جھگڑے پیش آتے ہیں تو پھر مجھے ہاتھوں میں اٹھا کر قسمیں دی جاتی ہیں۔ میرے ساتھ یہ سب سلوک ہورہا ہے، اور زبان سے میری محبت اور تعظیم کے دعوے کئے جارہے ہیں، لیکن جس قانون پر لوگ چل رہے ہیں اور جس انداز زندگی کو اختیار کیا ہوا ہے، وہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اے قرآن! "معاذ اللہ" تیری ہدایت کی ہمیں ضرورت نہیں۔

اسلام میں پورے داخل ہو جاؤ

جن صاحب نے اس وقت جن آیات کی تلاوت فرمائی ہے، وہ بہ موقع تلاوت کی ہیں۔ ان آیات میں ارشاد ہے کہ:

﴿یا ایھا الذین امنوا ادخلوا فی السلم کافۃ﴾

(سورہ البقرہ: ۲۰۸)

"اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ"۔

یہ نہ ہو کہ مسجد میں جب تک ہو، اس وقت تو تم مسلمان ہو اور بازار میں

مسلمان نہ ہو، اور اقتدار کے ایوان میں مسلمان نہ ہو، بلکہ تم ہر جگہ مسلمان ہو۔

بہر حال، آج کی نشست کا موضوع یہ تجویز کیا گیا تھا کہ "موجودہ دور میں مسلمان تاجر کے فرائض کیا ہیں" اس موضوع کے سلسلے میں میں نے آپ کے سامنے قرآن کریم کی ایک آیت تلاوت کی ہے، اس کی تھوڑی تشریح پیش کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن تشریح کرنے سے پہلے موجودہ دور کا ایک تمہیدی جائزہ لینا مناسب ہوگا۔ اگر موجودہ حالات کے پس منظر میں جب اس آیت کی تشریح سمجھنے کی کوشش کی جائے گی تو شاید زیادہ فائدہ ہوگا۔

دو معاشی نظریے

ہم اور آپ اس وقت ایک ایسے دور میں جی رہے ہیں جس میں یہ کہا اور سمجھایا جارہا ہے کہ انسان کی زندگی کا سب سے بنیادی مسئلہ "معاش کا مسئلہ" ہے۔ اور اسی بنیاد پر اس دور میں دو معاشی نظریوں کے درمیان پہلے فکری اور پھر عملی تصادم رونما ہوا۔ ایک "سرمایہ دارانہ معیشت" کا نظریہ۔ اور دوسرا "اشتراکی معیشت کا نظریہ" ان دونوں نظریوں کے درمیان پچھلی نصف صدی سے زیادہ عرصے تک زبردست ٹکراؤ رہا، اور فکری اور عملی دونوں سطح پر یہ دونوں نظریے بر سرپیکار رہے۔ دونوں کے پیچھے ایک فلسفہ اور ایک نظریہ تھا۔ چوہتر ۷۴ سال گزرنے کے بعد ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اشتراکی معیشت کا جو نظر فریب ایوان تھا وہ بیٹھ گیا۔ اور دنیا نے پُرفریب نظریہ کی حقیقت کو عملی تجربہ گاہ میں پہچان لیا، اور اشتراکیت بحیثیت ایک انقلابی نظام کے فیل ہوگئی۔

اشتراکیت کے وجود میں آنے کے اسباب

لیکن یہ بات سوچنے کی ہے کہ اشتراکیت کیوں وجود میں آئی تھی؟ اور اس کے پیچھے کیا اسباب اور کیا عوامل کار فرما تھے؟ جن لوگوں نے دنیا کے مختلف معاشی

نظاموں کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ درحقیقت اشتراکیت ایک ردّ عمل تھا۔ سرمایہ دارانہ نظام کے اندر جو امیر اور غریب کے درمیان زبردست دیواریں حائل ہیں، اور اس میں دولت کی تقسیم کا نظام غیر منصفانہ ہے، اس غیر منصفانہ نظام کے ردّ عمل کے طور پر اشتراکیت وجود میں آئی۔ سرمایہ دارانہ نظام کے اندر فرد کو اتنی آزادی دی گئی کہ وہ جس طرح چاہے نفع کمائے، اس پر کسی طرح کی قید اور پابندی نہیں۔ آزاد معیشت اور آزاد تجارت کے نظریہ کے تحت اس کو کھلی چھٹی فراہم کی گئی، اور اس کھلی چھٹی کے نتیجے میں دولت کی تقسیم کا نظام ناہموار ہوگیا، اور امیر وغریب کے درمیان دیواریں کھڑی ہوگئیں۔ غریب کے حقوق پامال ہوئے، اس کے ردّ عمل کے طور پر اشتراکیت کا نظام وجود میں آیا۔ جس نے یہ کہا کہ "فرد کو کوئی آزادی نہیں ہونی چاہئے، اور سرکاری منصوبہ بندی کے تحت معیشت کو کام کرنا چاہئے"

سرمایہ دارانہ نظام میں خرابیاں موجود ہیں

یہ بات ٹھیک ہے کہ اشتراکی نظام ناکام اور فیل ہوگیا، لیکن سرمایہ دارانہ نظام کی جن خرابیوں کی وجہ سے اشتراکی نظام وجود میں آیا تھا، کیا وہ خرابیاں دور ہوگئیں؟ وہ ناانصافیاں جو سرمایہ دارانہ نظام کے اندر پائی جاتی تھیں کیا ان کا کوئی مناسب حل نکل آیا؟ اس سوال کا جواب نفی میں ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں جو خرابیاں تھیں وہ اپنی جگہ پر برقرار ہیں۔

سب سے زیادہ کمانے والا طبقہ

اور یہ مقام عبرت ہے کہ جس تاریخ میں سوویت یونین کا شیرازہ بکھرا، اور امریکی رسالے "ٹائم" (Time) کے جس شمارے میں یہ خبر اور اس پر تبصرے شائع ہوئے کہ سوویت یونین کا شیرازہ بکھر گیا اور اشتراکیت کا بت پاش پاش ہوگیا، ٹھیک

اسی شمارے میں امریکی نظام حیات کے بارے میں ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں اسی بات پر تبصرہ کیا گیا تھا کہ اس وقت امریکی نظام زندگی میں اپنی خدمات کے عوض سب سے زیادہ کمانے والا طبقہ کونسا ہے؟ اس مضمون میں یہ کہا گیا تھا کہ ہمارے معاشرے میں سب سے زیادہ کمانے والا طبقہ "ماڈل گرلز" کا طبقہ ہے، جو موڈلنگ کرکے پیسے کماتی ہیں۔ اور اس مضمون میں لکھا تھا کہ بعض ماڈل گرل ایسی ہیں جو ایک دن کی خدمات کا معاوضہ ۲۵ ملین ڈالر وصول کرتی ہیں۔ اس سے زیادہ کمانے والا طبقہ کوئی اور نہیں ہے۔ یہ ۲۵ ملین ڈالر جو ایک ماڈل گرل کو دیے جارہے ہیں، یہ کون ادا کررہا ہے؟ اور کس کی جیب سے یہ رقم جارہی ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ ۲۵ ملین ڈالر آخرکار صارفین سے وصول کیے جائیں گے۔ ایک ہی شمارے میں یہ دونوں باتیں پڑھ کر مجھے عبرت ہورہی تھی کہ ایک طرف تو یہ دعویٰ کرکے بغلیں بجائی جارہی ہیں کہ ہم نے اشتراکیت کے بت کو پاش پاش کردیا، لیکن جس چیز نے اشتراکیت کو جنم دیا تھا اس چیز کی طرف کسی کی نظر اور کسی کو فکر نہیں۔ آج آپ نے اشتراکیت کے ایک بت کو تو پاش پاش کردیا، لیکن اس کے اصل سبب اور محرک کو ختم نہیں کیا تو کل کو ایک اور اشتراکیت ابھر کر سامنے آجائے گی۔ پہلی اشتراکیت نے انسانیت کو زخم دیے، پھر دوسری اشتراکیت آکر اس سے زیادہ زخم لگائے گی۔

سرمایہ دارانہ نظام کی اصل خرابی

صحیح بات یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں نہ تو اس وجہ سے خرابی تھی کہ اس میں فرد کو منافع کمانے کی مکمل آزادی دی گئی ہے، اور نہ تو اس وجہ سے خرابی تھی کہ اس میں انفرادی ملکیت کو تسلیم کیا گیا ہے، بلکہ درحقیقت خرابی اس وجہ سے تھی کہ اس نظام معیشت میں حلال و حرام کی کوئی تقسیم نہیں تھی، جائز اور ناجائز کی کوئی تقسیم نہیں تھی۔ حالانکہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے رسول حضرت محمد صلی

اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جو دین اور معیشت کا جو نظام ہمیں عطا فرمایا ہے، اس کی بنیاد اس بات پر ہے کہ اگرچہ انسان اپنی معیشت اور تجارت میں آزاد ضرور ہے، لیکن اپنے خالق اور مالک کے بتائے ہوئے احکام کا پابند بھی ہے۔ لہٰذا اس کی تجارت، اس کی صنعت اور اس کی معیشت حلال و حرام کے اصولوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ اور جب تک حلال و حرام کے ان اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے تجارت و معیشت کی شاہراہ پر گامزن نہیں ہوگا اس وقت تک اسی قسم کی بے اعتدالیوں اور ناکامیوں کا راستہ کھلا رہے گا۔

ایک امریکی افسر سے ملاقات

جس زمانے میں سود کے بارے میں "فیڈرل شریعت کورٹ" کا فیصلہ منظر عام پر آیا، اس وقت پاکستان میں امریکی سفارت خانے کے معاشی امور کے انچارج میرے پاس آئے اور اس فیصلے کے بارے میں کچھ تفصیلات معلوم کیں۔ اس وقت اشتراکیت کی ناکامی کا تازہ تازہ واقعہ پیش آیا تھا۔ میں نے آخر میں ان سے گزارش کی کہ میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ آج امریکہ کا ڈنکا بج رہا ہے، اور بلاشبہ آپ لوگوں نے عالمی سطح پر اتنی بڑی کامیابی حاصل کی ہے کہ آج یہ کہا جارہا ہے کہ پوری دنیا میں اس وقت صرف ایک سپر طاقت ہے، دوسری کوئی طاقت نہیں۔ لیکن میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اشتراکیت کی اس ناکامی کے بعد کیا آپ نے کبھی اس پہلو پر غور کیا کہ جن اسباب کے نتیجے میں یہ اشتراکیت ابھری تھی، کیا وہ اسباب ختم ہوگئے ہیں؟ اور کیا اب دوبارہ ان اسباب پر غور کرنے کی ضرورت نہیں؟ لیکن یہ عجیب معاملہ ہے کہ اگر اس وقت کوئی شخص کھڑا ہوکر یہ کہتا ہے کہ اشتراکیت کی ناکامی اپنی جگہ پر ہے، لیکن سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیوں کا ایک حل ہمارے پاس موجود ہے، اور وہ یہ کہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے حلال و حرام کے اصولوں کی بنیاد پر اپنی معیشت کے اصولوں

کو استوار کرنا ہے، تو آپ کی طرف سے اس کو بنیاد پرستی کے طعنے دیے جاتے ہیں، اس کو فنڈامینٹلسٹ کہا جاتا ہے، اس کے خلاف پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے، اور اس کو یہ کہا جاتا ہے کہ یہ وقت کے تقاضوں کو نہیں سمجھتے۔ آپ یہ بتایئے کہ آپ کے خیال میں کیا کوئی تیسرا تصور وجود ہی میں نہیں آسکتا؟ آپ اس پر غور کرنے کے لئے کیوں تیار نہیں؟

وہ کافی توجہ سے میری بات سنتے رہے۔ بعد میں انہوں نے کہا کہ بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے جو ذرائع ابلاغ ہیں، انہوں نے بلاشبہ اسلامی احکام اور تعلیمات کو بڑا مسخ کرکے پیش کرنا شروع کردیا ہے، میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں۔ اور سود کے بارے میں جس طرح آپ نے وضاحت سے بتایا، اس طرح وضاحت کے ساتھ میں نے پہلی بار یہ مسئلہ سنا ہے، اور یہ سمجھتا ہوں کہ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے، لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے ذرائع ابلاغ پروپیگنڈے کے خوگر ہیں۔ اس وجہ سے جب بھی اس قسم کی کوئی بات سامنے آتی ہے تو وہ اس کے خلاف پروپیگنڈہ کرنا شروع کردیتے ہیں۔ اور یہ ان کا اچھا طرز عمل نہیں ہے۔

صرف اسلام کا نظام معیشت منصفانہ ہے

تو میں یہ عرض کررہا تھا کہ اگر دوسرے لوگ اسلامی تعلیمات اور اسلامی احکام کے بارے میں ایسی باتیں کریں تو ان کو معذور سمجھا جاسکتا ہے۔ اس لئے کہ انہوں نے "اسلام" کو سمجھا ہی نہیں، اسلام کو پڑھا ہی نہیں، اسلام پر ان کو اعتقاد ہی نہیں، اسلام ان کو کیا سکھاتا ہے اس سے ان کو کوئی دلچسپی ہی نہیں۔ لیکن ہم اور آپ جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، اور کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، اور اپنی ہر مجلس کا آغاز تلاوت قرآن کریم سے کرتے ہیں، ہمارے پاس اس بات کا کوئی جواز نہیں کہ ہم اسلام کے اس عظیم پہلو سے اپنے آپ کو غافل اور بے خبر رکھیں، اور اس بات کو سمجھنے کی کوشش نہ کریں کہ ہمارے

دین اسلام نے معیشت کے میدان میں ہمیں کیا تعلیم دی ہے؟ اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہ ایک ایسے معاشرے میں جہاں اشتراکیت ناکام ہو چکی ہے، اور سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیاں اپنی جگہ جوں کی توں باقی ہیں، ایسے معاشرے میں اگر کوئی نظام انسانیت کے لئے ایک اعتدال کی راہ پیش کر سکتا ہے تو وہ صرف اور صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کا نظام ہے۔ اس یقین کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر اس آیت کریمہ پر غور کیا جائے جو ابھی میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی ہے تو اس میں ہماری اور آپ کی رہنمائی کے لئے بہت بڑا سامان ہے۔

قارون اور اس کی دولت

یہ آیت کریمہ سورۃ قصص کی آیت ہے، اس آیت میں قارون کو خطاب کیا گیا ہے، یہ قارون حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں بہت دولت مند شخص تھا، چنانچہ قارون کا خزانہ بہت مشہور ہے، یہ اتنا بڑا دولت مند تھا کہ اس کی دولت کی کثرت کو بیان کرتے ہوئے قرآن کریم نے فرمایا:

﴿ ان مفاتحہ لتنوٓأ بالعصبۃ اولی القوۃ ﴾

(سورۃ القصص:٧٦)

یعنی اس کے خزانوں کی چابیاں بھی اتنی زیادہ تھیں کہ ایک بڑی جماعت مل کر ان چابیوں کو اٹھا پاتی تھی۔ اس زمانے میں چابیاں بھی بڑی وزنی ہوا کرتی تھیں۔ پھر اس کے خزانے بہت پھیلے ہوئے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واسطے سے اللہ تعالیٰ نے اس کو جو ہدایات دیں وہ اس آیت کریمہ میں بیان کی گئی ہیں جو میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی ہے۔ اگرچہ اس آیت میں براہ راست خطاب تو قارون کو ہے، لیکن اس کے واسطے سے ہر اس شخص کو خطاب ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے دولت سے نوازا ہو۔

قارون کو چار ہدایات

چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿وابتغ فیما اتاک اللّٰہ الدار الاخرۃ ولا تنس نصیبک من الدنیا واحسن کما احسن اللّٰہ الیک ولا تبغ الفساد فی الارض﴾

یہ چار جملے ہیں۔ پہلے جملے میں فرمایا کہ جو کچھ اللہ تبارک و تعالیٰ نے تم کو (دولت) عطا فرمائی ہے اس کے ذریعہ آخرت کی فلاح و بہبود کو طلب کرو۔ دوسرے جملے میں فرمایا کہ (یہ نہ ہو کہ آخرت کی فلاح طلب کرنے کے لئے ساری دولت لٹادو اور دنیا میں اپنے پاس دولت بالکل نہ رکھو بلکہ) دنیا کا جو حصہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے مقرر فرمایا ہے اس کو مت بھولو (اس کو اپنے پاس رکھو، اس کا حق ادا کرو) تیسرے جملے میں ارشاد فرمایا کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے تم پر (یہ دولت عطا کرکے) احسان کیا ہے، اسی طرح تم بھی دوسروں کے ساتھ احسان اور اچھائی کا معاملہ کرو۔ چوتھے جملے میں ارشاد فرمایا کہ اپنی اس دولت کے بل بوتے پر زمین میں فساد مت مچاؤ۔ (اور زمین میں فساد پھیلانے کی کوشش مت کرو) اس آیت میں یہ چار ہدایات قارون کو دیں۔ لیکن ذرا غور سے دیکھا جائے تو یہ چار ہدایات ایک تاجر کے لئے، ایک صنعت کار کے لئے اور ایک ایسے مسلمان کے لئے جس کو اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کے اندر کچھ بھی عطا فرمایا ہو، ایک پورا نظام عمل پیش کررہی ہیں۔

پہلی ہدایت

سب سے پہلی ہدایت یہ دی گئی کہ تم میں اور ایک غیر مسلم میں فرق یہ ہے کہ غیر مسلم جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتا، اس کا نظریہ یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ دولت مجھے حاصل ہے، یہ سب میری قوت بازو کا کرشمہ ہے، میں نے اپنی محنت سے، اپنی

صلاحیت سے اور اپنی جدوجہد سے اس کو کمایا اور حاصل کیا ہے، لہٰذا میں اس دولت کا بلاشرکت غیرمالک ہوں، اور کسی شخص کو میری دولت میں مداخلت کرنے کا حق حاصل نہیں۔ یہ دولت میری ہے، یہ مال میرا ہے، میں نے اپنی قوت بازو کے بل پر اسے کمایا ہے، اپنی صلاحیتوں کی بنیاد پر اس کو کمایا ہے۔ لہٰذا میں اس دولت کو کمانے کے طریقے میں بھی آزاد ہوں، اور اس کو خرچ کرنے کے طریقے میں بھی آزاد ہوں۔ کسی دوسرے کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ میرے معاملات میں دخل اندازی کرے۔

قوم شعیب اور سرمایہ دارانہ ذہنیت

حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم نے حضرت شعیب علیہ السلام سے یہ کہا تھا کہ:

﴿اصلوٰتک تامرک ان نترک ما یعبد آباؤنا او ان نفعل فی اموالنا ما نشٰؤا﴾ (سورۃ ھود: ۸۷)

(یعنی یہ جو آپ ہمیں منع کر رہے ہیں کہ کم مت ناپو، کم مت تولو، انصاف سے کام لو، حلال و حرام کی فکر کرو، تو یہ آپ نے ہمارے معاشی مسائل میں کہاں سے دخل اندازی شروع کردی۔ تم اگر نماز پڑھنا چاہو تو اپنے گھر جاکر نماز پڑھو) کیا تمہاری نماز تمہیں اس بات کا حکم دیتی ہے کہ ہم ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی ہمارے آباء و اجداد عبادت کیا کرتے تھے، یا ہمارا جو مال ہے اس میں ہم جو چاہیں کریں ______ حقیقت میں یہ سرمایہ دارانہ ذہنیت ہے کہ یہ مال ہمارا ہے، یہ دولت ہماری ہے، اس پر ہمارا سکہ چلے گا، تصرف ہمارا ہے، ہم جس طرح چاہیں گے کریں گے، جس طرح چاہیں گے کمائیں گے۔ اور جس طرح چاہیں گے خرچ کریں گے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کی بھی یہی ذہنیت تھی۔ اس کی تردید میں یہ بات کہی گئی کہ جو دولت تمہارے پاس ہے یہ کلی طور پر تمہاری نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ

تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وللہ ما فی السموات وما فی الارض﴾

(سورۃ النساء:۱۳۱)

آسمان و زمین میں جو کچھ ہے وہ اللہ کی ملکیت ہے، البتہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں عطا فرمادی ہے، اس لئے فرمایا: ما اتاک اللہ یعنی جو مال اللہ نے تمہیں دیا ہے اس کے ذریعہ آخرت طلب کرو، یہ نہیں فرمایا کہ وابتغ فی مالک اپنے مال کے ذریعہ آخرت طلب کرو۔

مال و دولت اللہ کی عطا ہے

لہٰذا پہلی بات یہ سمجھ لو کہ جو کچھ تمہارے پاس ہے، چاہے وہ نقد روپیہ ہو، چاہے وہ بینک بیلنس ہو۔ چاہے وہ صنعت ہو یا تجارت ہو، یہ سب اللہ تعالیٰ کی عطا ہے۔ بیشک اس کو حاصل کرنے میں تمہاری جدوجہد اور کوشش کو بھی دخل ہے، لیکن تمہاری یہ کوشش دولت حاصل کرنے کے لئے علت حقیقی کا درجہ نہیں رکھتی، اس لئے کہ کتنے لوگ ایسے ہیں جو محنت اور کوشش کرتے ہیں، مگر مال و دولت حاصل نہیں کرپاتے۔ کتنے لوگ ایسے ہیں جن کے پاس دولت ہے، لیکن محنت کے ذریعہ مزید دولت حاصل نہیں کرپاتے۔ یہ دولت اللہ تعالیٰ کی عطا ہے۔ لہٰذا یہ تصور ذہن سے نکال دو کہ یہ دولت تمہاری ہے، بلکہ یہ دولت اللہ کی ہے، اور اللہ نے اپنے فضل وکرم سے تمہیں عطا فرمائی ہے۔ اس آیت سے ایک ہدایت تو یہ دے دی۔

مسلم اور غیر مسلم میں تین فرق ہیں

مسلم اور غیر مسلم میں تین فرق ہیں۔ پہلا فرق یہ ہے کہ مسلمان اپنی دولت کو

اللہ تعالیٰ کی عطا سمجھتا ہے، جبکہ غیر مسلم اس دولت کو اللہ تعالیٰ کی عطا نہیں سمجھتا، بلکہ اس دولت کو اپنی قوت بازو کا کرشمہ سمجھتا ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ ایک مسلمان کا کام یہ ہے کہ وہ اس دولت کو آخرت کی فلاح و بہبود کا ذریعہ بنائے، اور دولت کو حاصل کرنے اور اس کو خرچ کرنے میں ایسا طرز عمل اختیار کرے کہ کوئی کام اللہ تعالیٰ کی مرضی اور اس کے حکم کے خلاف نہ ہو، تاکہ یہ دنیا اس کے لئے دین کا ذریعہ بن جائے اور آخرت کی فلاح و بہبود کا ذریعہ بن جائے۔ یہی دنیا ہے کہ اگر اس کے حصول میں انسان کی نیت درست ہو اور اللہ تعالیٰ کے عائد کئے ہوئے حلال و حرام کے احکام کی پابندی ہو تو یہی دنیا دین بن جاتی ہے، اور یہی دنیا آخرت کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ تیسرا فرق یہ ہے کہ ایک مسلمان بھی کماتا ہے اور کماتا ہے، اور ایک غیر مسلم بھی کماتا ہے اور کماتا ہے، لیکن غیر مسلم کے دل میں نہ تو اللہ تعالیٰ کا تصور ہوتا ہے اور نہ اس کے احکام کی پابندی کا خیال ہوتا ہے، اور مسلمان کے دل میں یہ چیزیں موجود ہوتی ہیں۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے یہ دنیا دین بنادی۔ اگر ایک تاجر اس نیت کے ساتھ تجارت کرے کہ میں دو وجہ سے تجارت کررہا ہوں۔ ایک تو اس لئے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے میرے ذمے کچھ حقوق عائد کئے ہوئے ہیں۔ میرے نفس کے بھی کچھ حقوق ہیں۔ میرے بچوں کے میرے ذمہ کچھ حقوق ہیں، میری بیوی کے میرے ذمہ کچھ حقوق ہیں، ان حقوق کی ادائیگی کے لئے یہ تجارت کررہا ہوں۔ دوسرے اس لئے میں تجارت کررہا ہوں کہ اس تجارت کے ذریعہ میں معاشرے میں ایک چیز فراہم کرنے کا ذریعہ بن جاؤں، اور مناسب طریقے سے ان کی اشیاء ضرورت ان تک پہنچاؤں۔ اگر تجارت کرتے وقت دل میں یہ دو نیتیں موجود ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ حلال طریقے کو اختیار کرے اور حرام طریقے سے بچے تو پھر یہ ساری تجارت عبادت ہے۔

تاجروں کی دو قسمیں

ایک حدیث میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿التاجر الصدوق الامین مع النبیین والصدیقین والشهداء﴾ (ترمذی، کتاب البیوع، باب ماجاء فی التجارۃ)

یعنی ایک امانت دار اور سچا تاجر قیامت کے دن انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔ لیکن اگر تجارت کے اندر نیت صحیح نہ ہو اور حلال و حرام کی فکر نہ ہو تو پھر ایسے تاجر کے بارے میں پہلی حدیث کے برخلاف دوسری حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿التجار یحشرون یوم القیامة فجارا الامن اتقی وبر وصدق﴾

یعنی تجار قیامت کے دن فجار بنا کر اٹھائے جائیں گے۔ "فجار" کے معنی ہیں: فاسق و فاجر، نافرمان، گناہ گار، سوائے اس تاجر کے جو تقویٰ اختیار کرے، نیکی اختیار کرے، اور سچائی اختیار کرے۔ اگر یہ تین شرطیں موجود نہیں ہیں تو وہ تاجر فجار میں شامل ہے۔ اور اگر یہ تین شرطیں موجود ہیں تو پھر وہ انبیاء اور صدیقین اور شہداء کی صف میں شامل ہے۔ ایسے تاجر کو اللہ تعالیٰ نے یہ مقام بخشا ہے۔

بہرحال، پہلا مرحلہ نیت کی درستی ہے۔ اور دوسرا مرحلہ عمل کے اندر حلال و حرام کا امتیاز ہے۔ یہ نہ ہو کہ مسجد کی حد تک تو وہ مسلمان ہے، لیکن مسجد سے باہر نکلنے کے بعد اس کو اس بات کی کوئی پرواہ نہ ہو کہ میں جو کاروبار کرنے جارہا ہوں وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق ہے یا نہیں؟ اس دوسرے مرحلے پر مسلمان اور غیر مسلم میں کوئی امتیاز نہیں۔ ایک غیر مسلم سودی کاروبار کر رہا ہے تو مسلمان بھی سودی کاروبار کر رہا ہے، غیر مسلم قمار کا کام کر رہا ہے تو مسلمان بھی کر رہا ہے، اگر کسی مسلمان تاجر کے اندر یہ بات ہے تو پھر ایسا تاجر اس وعید کے اندر داخل ہے

جو دوسری حدیث میں اوپر عرض کی۔ اور اگر یہ بات نہیں تو پھر وہ تاجر پہلی حدیث میں بیان کی گئی بشارت کا مستحق ہے۔

دوسری ہدایت

اب دل میں یہ خیال پیدا ہو سکتا تھا کہ اسلام نے ہماری تجارت کا راستہ بھی بند کر دیا اور یہ فرمادیا کہ بس آخرت ہی کو دیکھو، دنیا کو مت دیکھو، اور دنیا کے اندر اپنی ضروریات کا خیال نہ کرو۔ اس خیال کی تردید کے لئے قرآن کریم نے فوراً دوسرے جملے میں دوسری ہدایت یہ فرمائی کہ:

﴿ولا تنس نصيبك من الدنيا﴾

یعنی ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ تم دنیا کو بالکل چھوڑ کر بیٹھ جاؤ، بلکہ تمہارا دنیا کا جو حصہ ہے اس کو مت بھولو، اس کے لئے جائز اور حلال طریقے اختیار کرنے کی کوشش کرو۔

یہ دنیا ہی سب کچھ نہیں

لیکن قرآن کریم کے انداز بیان نے ایک بات اور واضح کر دی کہ تمہارا بنیادی مسئلہ اس زندگی کے اندر "معاش کا مسئلہ" نہیں۔ بیشک قرآن و حدیث میں اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے معاش کے مسئلے کو تسلیم کیا ہے، لیکن یہ معاش کا مسئلہ تمہاری زندگی کا بنیادی مسئلہ نہیں ہے۔ ایک کافر اور مؤمن میں یہی فرق ہے کہ کافر اپنی ساری زندگی کا بنیادی مسئلہ اس کو سمجھتا ہے کہ میری پیدائش سے لے کر مرتے دم تک میرے کھانے کمانے کا کیا انتظام ہے، اس سے آگے اس کی سوچ اور فکر نہیں جاتی۔ لیکن ایک مسلمان کو قرآن و حدیث یہ تعلیم دیتے ہیں کہ بیشک معاشی سرگرمیوں کی تمہیں اجازت ہے، لیکن یہ تمہاری زندگی کا بنیادی

مقصد نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ زندگی تو خدا جانے کتنے دنوں کی ہے، آج بھی ختم ہو سکتی ہے، کل بھی ختم ہو سکتی ہے۔ ہر لمحے اس زندگی کے ختم ہونے کا امکان موجود ہے۔ آج تک کوئی انسان ایسا پیدا نہیں ہوا جس نے موت سے انکار کیا ہو، خدا کا انکار کرنے والے دنیا میں موجود ہیں لیکن موت سے انکار کرنے والا کوئی نہیں۔ اس دنیا سے ضرور جانا ہے۔ اور اگر تم مسلمان ہو تو یقیناً تمہارا یہ اعتقاد ہو گا کہ مرنے کے بعد ایک دوسری زندگی آنے والی ہے۔ وہ زندگی کبھی ختم ہونے والی نہیں، وہ ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی ہوگی۔

کیا انسان ایک معاشی جانور ہے؟

ذرا سی عقل رکھنے والے انسان کو بھی یہ بات سوچنی چاہئے کہ اس کو اپنی جدوجہد اور اپنی زندگی کا بنیادی مقصد اس چند روزہ زندگی کو بنانا چاہئے، یا اس آنے والی دائمی زندگی کو اپنا مقصد بنانا چاہئے؟ ایک مسلمان جو اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام پر ایمان رکھتا ہے، ظاہر ہے کہ اس کی زندگی کا بنیادی مقصد صرف کمائی کر پورا نہیں ہو جاتا، صرف زیادہ سے زیادہ روپیہ پیسہ جمع کر کے پورا نہیں ہو جاتا، کیونکہ اگر ایسا ہو جائے تو پھر انسان اور جانور میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔ انسان کی تعریف میں یہ جو کہا گیا ہے کہ انسان ایک معاشی جانور (Economic animal) ہے۔ یہ تعریف درست نہیں، اس لئے کہ اگر انسان صرف (Economic animal) ہوتا تو پھر انسان میں اور بیل، گدھے، کتے میں کوئی فرق نہ ہوتا۔ اس لئے کہ یہ جانور کھانے پینے کے لئے پیدا ہوئے ہیں، اگر انسان بھی صرف کھانے پینے کے لئے پیدا کیا گیا ہے تو انسان میں اور جانور میں کوئی فرق نہ رہے گا۔ اللہ تعالیٰ نے سارے جانوروں کے لئے رزق کے دروازے کھولے ہیں، وہ بھی کھاتے پیتے ہیں، لیکن انسان کو جانوروں سے جو امتیاز عطا فرمایا ہے، وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل دی ہے، اور اس عقل کے ذریعہ وہ یہ سوچے کہ

آئندہ آنے والی زندگی ایک دائمی زندگی ہے۔ اور وہ زندگی اس موجودہ زندگی پر فوقیت رکھتی ہے۔

بہرحال، اس دوسرے جملے میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتادیا کہ دنیا سے اپنا حصہ مت بھولو، لیکن یہ یاد رکھو کہ زندگی کا اصل مقصود دار آخرت ہے۔ اور یہ جتنی معاشی سرگرمیاں ہیں، یہ راستے کی منزل ہیں، یہ خود منزل مقصود نہیں۔

تیسری ہدایت

پھر تیسرے جملے میں یہ ہدایت دی کہ:

﴿واحسن کما احسن اللّٰہ الیک﴾

یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے تمہیں یہ دولت عطا کرکے تم پر احسان کیا ہے، تم بھی دوسروں پر احسان کرو۔ اس آیت میں ایک طرف تو یہ بتادیا کہ حلال و حرام میں فرق کرو، اور حرام کے ذریعہ مال حاصل نہ کرو۔ اور دوسری طرف یہ بھی بتادیا کہ جو چیز حلال طریقے سے حاصل کی ہے، اس کے بارے میں بھی یہ مت سمجھو کہ میں اس کا بلا شرکت غیر مالک ہوں۔ بلکہ اس کے ذریعہ تم دوسروں پر احسان کا معاملہ کرو۔ اور احسان کرنے کے لئے زکوٰۃ اور صدقات و خیرات کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔

چوتھی ہدایت

چوتھے جملے میں یہ ہدایت دی کہ:

﴿ولا تبغ الفساد فی الارض﴾

زمین میں فساد مت پھیلاؤ، یعنی دولت کے بل بوتے پر دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ مت ڈالو۔ دوسروں کے حقوق غصب مت کرو۔ اگر تم نے ان چار ہدایات پر عمل کرلیا تو تمہاری یہ دولت، تمہارا یہ سرمایہ اور تمہاری یہ معاشی سرگرمیاں

تمہارے لئے مبارک ہیں۔ اور تم انبیاء، صدیقین، اور شہداء کی فہرست میں شامل ہو۔ اور اگر تم نے ان ہدایات پر عمل نہ کیا تو پھر تمہاری ساری معاشی سرگرمیاں بیکار ہیں۔ اور آخرت میں اس کا نتیجہ سزا اور عذاب کی صورت میں سامنے آجائے گا۔

دنیا کے سامنے نمونہ پیش کریں

بہرحال، اس وقت ہمارے مسلمان تاجروں کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ قرآن کریم کی ان چار ہدایتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے دنیا کے سامنے ایک عملی نمونہ پیش کریں۔ اس دنیا کے سامنے جو سرمایہ داری سے بھی زخم کھائی ہوئی ہے، اور اشتراکیت سے بھی زخم کھائی ہوئی ہے۔ اور ایسا نمونہ پیش کریں جو دوسروں کے لئے باعث کشش ہو۔ جو شخص ایسا کرے گا تو وہ اس دور کی سب سے بڑی ضرورت کو پورا کرے گا۔

کیا ایک آدمی معاشرے میں تبدیلی لا سکتا ہے؟

آجکل یہ عذر پیش کیا جاتا ہے کہ جب تک نظام نہ بدلے، اور جب تک سب لوگ نہ بدلیں، اس وقت تک اکیلا آدمی کیسے تبدیلی لا سکتا ہے؟ اور اکیلا آدمی ان چار ہدایتوں پر کس طرح عمل کر سکتا ہے؟ یاد رکھئے! نظام اور معاشرہ افراد کے مجموعے کا نام ہے، اگر ہر فرد اپنی جگہ یہ سوچتا رہے کہ جب تک معاشرہ نہیں بدلے گا، اس وقت تک میں بھی نہیں بدلوں گا، تو پھر معاشرے میں کبھی تبدیلی واقع نہیں ہو سکتی۔ تبدیلی ہمیشہ اس طرح آیا کرتی ہے کہ کوئی اللہ کا بندہ فرد بن کر اپنی زندگی میں تبدیلی لاتا ہے، پھر اس چراغ کو دیکھ کر دوسرا چراغ جلتا ہے، اور پھر دوسرے سے تیسرا چراغ جلتا ہے، اسی طرح افراد کے سنورنے سے معاشرہ سنورتا ہے، اور افراد سے قوموں کی تعمیر ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ عذر کہ میں تنہا کچھ نہیں کر سکتا، یہ معقول عذر نہیں۔

حضور ﷺ کس طرح تبدیلی لائے

جب نبی کریم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں تشریف لائے، اس وقت معاشرے کی خرابیاں اور برائیاں اپنی انتہاء کو پہنچی ہوئی تھیں، اس وقت اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ سوچتے کہ اتنا بڑا معاشرہ الٹی سمت کی طرف جارہا ہے میں تنہا کیا کرسکوں گا، اور یہ سوچ کر آپ ہمت ہار کر بیٹھ جاتے تو آج ہم اور آپ یہاں پر مسلمان بیٹھے ہوئے نہ ہوتے۔ آپ نے دنیا کی مخالفتوں کے سیلاب کا مقابلہ کرتے ہوئے ایک راہ ڈالی، نیا راستہ نکالا، اور اس راستے پر گامزن ہوئے۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ آپ کو اس راستے میں قربانیاں بھی دینی پڑیں، آپ کو پریشانیاں بھی پیش آئیں۔ مشکلات بھی سامنے آئیں، لیکن آپ نے ان سب کو گوارہ کیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج دنیا کی ایک تہائی آبادی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نام لیوا اور ان کی غلام ہے۔ لیکن اگر آپ یہ سوچ کر بیٹھ جاتے کہ جب تک معاشرہ نہیں بدلے گا، اس وقت تک تنہا میں کیا کرسکتا ہوں تو یہ صورت حال نہ ہوتی۔

ہر شخص اپنے اندر تبدیلی لائے

اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کی ذمہ داری اس کے اپنے اوپر ڈالی ہے۔ لہٰذا اس بات کو دیکھے بغیر کہ دوسرے لوگ کیا کررہے ہیں، ہر انسان پر فرض ہے کہ وہ اپنے طرز عمل کو درست کرے۔ اور کم از کم اس بات کی طلب ہمارے دلوں میں پیدا ہوجائے کہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں معیشت کے میدان میں اور تجارت و صنعت کے میدان میں کن احکام کا پابند کیا ہے؟ ان احکام پر ہم کس طرح عمل کرسکتے ہیں۔ اس کی معلومات حاصل کرکے اس پر عمل کرنے کا جذبہ اور عزم پیدا ہوجائے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ مجلس انشاء اللہ بڑی مبارک اور مفید ہے۔ ورنہ نشستن و گفتن و برخاستن والی مجلسیں تو بہت ہوتی رہتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے یہ جذبہ اور یہ تصور اور یہ خیال اور یہ عزم ہمارے دلوں کے اندر پیدا فرمادے جو اس وقت کی بڑی اہم ضرورت ہے، اور اللہ تعالیٰ ہماری دنیا و آخرت دونوں سنواردے۔ اور ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین
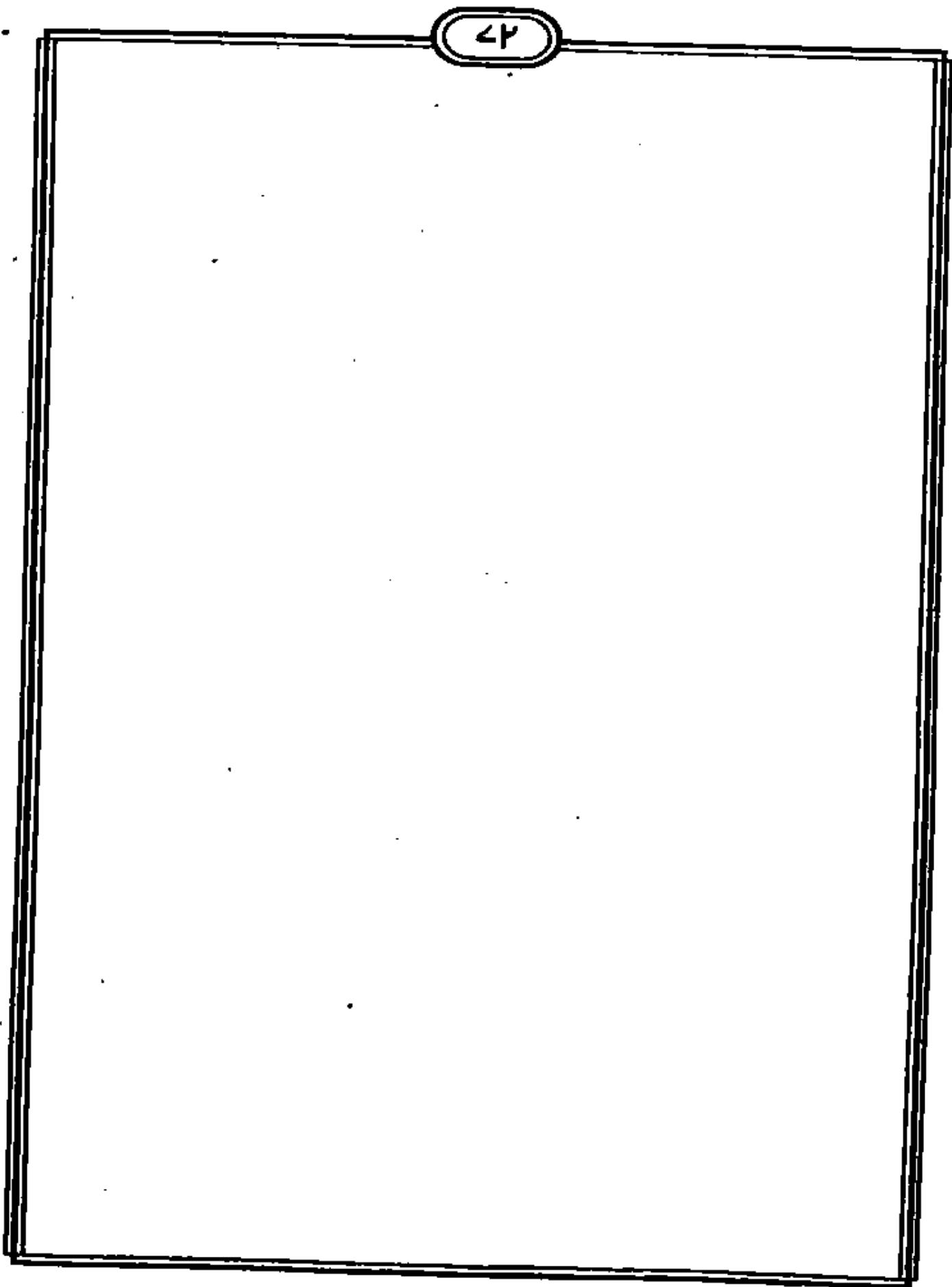
اپنے معاملات صاف رکھیں

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

تاریخ خطاب : ۲۵ر اکتوبر ۱۹۹۶ء

مقام خطاب : جامع مسجد بیت المکرم
گلشن اقبال کراچی

وقت خطاب : بعد نماز عصر تا مغرب

اصلاحی خطبات : جلد نمبر ۹

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اپنے معاملات صاف رکھیں

الحمد للّٰه نحمده ونستعينه ونستغفره و نؤمن به ونتوكل عليه، ونعوذ باللّٰه من شرور انفسنا ومن سيئات اعمالنا، من يهده اللّٰه فلا مضل له ومن يضلله فلا هادی له، ونشهد ان لا اله الا اللّٰه وحده لاشریک له، ونشهد ان سیدنا وسندنا ومولانا محمداً عبده ورسوله، صلی اللّٰه تعالٰی علیه وعلٰی اٰله واصحابه وبارک وسلم تسلیماً کثیراً کثیرا۔

اما بعد!

فاعوذ باللّٰه من الشیطٰن الرجیم۔ بسم اللّٰه الرحمن الرحیم
﴿یایها الذین اٰمنوا لاتاکلوا اموالکم بینکم بالباطل الا ان تکون تجارة عن تراض منکم﴾ (النساء:۲۹) آمنت باللّٰه صدق اللّٰه مولانا العظیم، وصدق رسوله النبی الکریم، ونحن علی ذلک من الشاهدین والشاکرین، والحمد للّٰه رب العالمین۔

معاملات کی صفائی ـــــ دین کا اہم رکن

یہ آیت جو میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی ہے، یہ دین کے ایک بہت اہم رکن سے متعلق ہے، وہ دین کا اہم رکن "معاملات کی درستی اور اس کی صفائی" ہے۔ یعنی انسان کا معاملات میں اچھا ہونا اور خوش معاملہ ہونا، یہ دین کا بہت اہم

باب ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ یہ دین کا جتنا اہم باب ہے، ہم لوگوں نے اتنا ہی اس کو اپنی زندگی سے خارج کررکھا ہے۔ ہم نے دین کو صرف چند عبادات مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، عمرہ، وظائف اور اوراد میں منحصر کرلیا ہے، لیکن روپے پیسے کے لین دین کا جو باب ہے، اس کو ہم نے بالکل آزاد چھوڑا ہوا ہے، گویا کہ دین سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں۔ حالانکہ اسلامی شریعت کے احکام کا جائزہ لیا جائے تو نظر آئے گا کہ عبادات سے متعلق جو احکام ہیں وہ ایک چوتھائی ہیں، اور تین چوتھائی احکام معاملات اور معاشرت سے متعلق ہیں۔

تین چوتھائی دین معاملات میں ہے

فقہ کی ایک مشہور کتاب ہے جو ہمارے تمام مدارس میں پڑھائی جاتی ہے، اور اس کتاب کو پڑھ کر لوگ عالم بنتے ہیں۔ اس کا نام ہے "ھدایہ" اس کتاب میں طہارت سے لے کر میراث تک شریعت کے جتنے احکام ہیں، وہ سب اس کتاب میں جمع ہیں۔ اس کتاب کی چار جلدیں ہیں، پہلی جلد عبادات سے متعلق ہے جس میں طہارت کے احکام، نماز کے احکام، زکوٰۃ، روزے، اور حج کے احکام بیان کئے گئے ہیں۔ اور باقی تین جلدیں معاملات یا معاشرت کے احکام سے متعلق ہیں۔ اس سے اندازہ لگائیں کہ دین کے احکام کا ایک چوتھائی حصہ عبادات سے متعلق ہے اور تین چوتھائی حصہ معاملات سے متعلق ہے۔

معاملات کی خرابی کا عبادت پر اثر

پھر اللہ تعالیٰ نے ان معاملات کا یہ مقام رکھا ہے کہ اگر انسان روپے پیسے کے معاملات میں حلال و حرام کا، اور جائز و ناجائز کا امتیاز نہ رکھے تو عبادات پر بھی اس کا اثر یہ واقع ہوتا ہے کہ چاہے وہ عبادات ادا ہوجائیں لیکن ان کا اجر و ثواب اور ان کی قبولیت موقوف ہوجاتی ہے، دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔ ایک حدیث میں حضور

اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے سامنے بڑی عاجزی کا مظاہرہ کررہے ہوتے ہیں اس حال میں کہ ان کے بال بکھرے ہوئے ہیں، گڑگڑا کر اور رو رو کر پکارتے ہیں کہ یا اللہ! میرا یہ مقصد پورا کردیجئے، فلاں مقصد پورا کردیجئے، بڑی عاجزی سے، الحاح و زاری کے ساتھ یہ دعائیں کررہے ہوتے ہیں، لیکن کھانا ان کا حرام، پینا ان کا حرام، لباس ان کا حرام، اور ان کا جسم حرام آمدنی سے پرورش پایا ہوا، فانی یستجاب لہ الدعاء ایسے آدمی کی دعا کیسے قبول ہو؟ ایسے آدمی کی دعا قبول نہیں ہوتی۔

معاملات کی تلافی بہت مشکل ہے

دوسری جتنی عبادات ہیں، اگر ان میں کوتاہی ہوجائے تو اس کی تلافی آسان ہے مثلاً نمازیں چھوٹ گئیں، تو اب اپنی زندگی میں قضا نمازیں ادا کرلو، اور اگر زندگی میں ادا نہ کرسکے تو وصیت کرجاؤ کہ اگر میں مرجاؤں اور میری نمازیں ادا نہ ہوئی ہوں تو میرے مال میں سے اس کا فدیہ ادا کردیا جائے اور توبہ کرلو۔ انشاء اللہ۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں تلافی ہوجائے گی۔ لیکن اگر کسی دوسرے کا مال ناجائز طریقے پر کھالیا تو اس کی تلافی اس وقت تک نہیں ہوگی جب تک صاحب حق معاف نہ کرے۔ چاہے تم ہزار توبہ کرتے رہو، ہزار نفلیں پڑھتے رہو۔ اس لئے معاملات کا باب بہت اہمیت رکھتا ہے۔

حضرت تھانویؒ اور معاملات

اسی وجہ سے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں تصوف اور طریقت کی تعلیمات میں معاملات کو سب سے زیادہ اولیت حاصل تھی۔ فرمایا کرتے تھے کہ اگر مجھے اپنے مریدین میں سے کسی کے بارے میں یہ پتہ چلے کہ اس نے اپنے معمولات، نوافل اور اوراد و وظائف پورے نہیں کئے تو

اس کی وجہ سے رنج ہوتا ہے اور اس مرید سے کہہ دیتا ہوں کہ ان کو پورا کرلو۔ لیکن اگر کسی مرید کے بارے میں یہ معلوم ہو کہ اس نے روپے پیسے کے معاملات میں گڑبڑ کی ہے تو مجھے اس مرید سے نفرت ہوجاتی ہے۔

ایک سبق آموز واقعہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مرید تھے، جن کو آپ نے خلافت بھی عطا فرمادی تھی اور ان کو بیعت اور تلقین کرنے کی اجازت دیدی تھی۔ ایک مرتبہ وہ سفر کرکے حضرت والا کی خدمت میں تشریف لائے، ان کے ساتھ ان کا بچہ بھی تھا، انہوں نے آکر سلام کیا اور ملاقات کی، اور بچے کو بھی ملوایا کہ حضرت یہ میرا بچہ ہے، اس کے لئے دعا فرمادیجئے۔ حضرت والا نے بچے کے لئے دعا فرمائی، اور پھر ویسے ہی پوچھ لیا کہ اس بچے کی عمر کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ حضرت اس کی عمر ۱۳ سال ہے، حضرت نے پوچھا کہ آپ نے ریل گاڑی کا سفر کیا ہے تو اس بچے کا آدھا ٹکٹ لیا تھا یا پورا ٹکٹ لیا تھا؟ انہوں نے جواب دیا کہ حضرت آدھا ٹکٹ لیا تھا۔ حضرت نے فرمایا: کہ آپ نے آدھا ٹکٹ کیسے لیا جب کہ بارہ سال سے زائد عمر کے بچے کا تو پورا ٹکٹ لگتا ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ قانون تو یہی ہے کہ بارہ سال کے بعد ٹکٹ پورا لینا چاہئے، اور یہ بچہ اگرچہ ۱۳ سال کا ہے لیکن دیکھنے میں ۱۲ سال کا لگتا ہے، اس وجہ سے میں نے آدھا ٹکٹ لے لیا۔ حضرت نے فرمایا: انا للہ وانا الیہ راجعون، معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو تصوف اور طریقت کی ہوا بھی نہیں لگی، آپ کو ابھی تک اس بات کا احساس اور ادراک نہیں کہ بچے کو جو سفر آپ نے کرایا، یہ حرام کرایا۔ جب قانون یہ ہے کہ ۱۲ سال سے زائد عمر کے بچے کا ٹکٹ پورا لگتا ہے اور آپ نے آدھا ٹکٹ لیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے ریلوے کے آدھے ٹکٹ کے پیسے غصب کرلئے اور آپ نے چوری کرلی۔ اور جو شخص چوری اور غصب کرے ایسا شخص تصوف اور طریقت میں کوئی مقام نہیں رکھ سکتا۔ لہٰذا آج

سے آپ کی خلافت اور اجازت بیعت واپس لی جاتی ہے۔ چنانچہ اس بات پر ان کی خلافت سلب فرمالی۔ حالانکہ اپنے اوراد و وظائف میں، عبادات اور نوافل میں، تہجد اور اشراق میں، ان میں سے ہر چیز میں بالکل اپنے طریقے پر مکمل تھے، لیکن یہ غلطی کی کہ بچے کا ٹکٹ پورا نہیں لیا، صرف اس غلطی کی بناء پر خلافت سلب فرمالی۔

حضرت تھانویؒ کا ایک واقعہ

حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے اپنے سارے مریدین اور متعلقین کو یہ ہدایت تھی کہ جب کبھی ریلوے میں سفر کرو، اور تمہارا سامان اس مقدار سے زائد ہو جتنا ریلوے نے تمہیں مفت لیجانے کی اجازت دی ہے، تو اس صورت میں اپنے سامان کا وزن کراؤ اور زائد سامان کا کرایہ ادا کرو، پھر سفر کرو۔ خود حضرت والا کا اپنا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ ریلوے میں سفر کے ارادے سے اسٹیشن پہنچے، گاڑی کے آنے کا وقت قریب تھا، آپ اپنا سامان لے کر اس دفتر میں پہنچے جہاں پر سامان کا وزن کرایا جاتا تھا اور جاکر لائن میں لگ گئے۔ اتفاق سے گاڑی میں ساتھ جانے والا گارڈ وہاں آگیا اور حضرت والا کو دیکھ کر پہچان لیا، اور پوچھا کہ حضرت آپ یہاں کیسے کھڑے ہیں؟ حضرت نے فرمایا کہ میں سامان کا وزن کرانے آیا ہوں۔ گارڈ نے کہا کہ آپ کو سامان کا وزن کرانے کی ضرورت نہیں، آپ کے لئے کوئی مسئلہ نہیں، میں آپ کے ساتھ گاڑی میں جارہا ہوں، آپ کو زائد سامان کا کرایہ دینے کی ضرورت نہیں۔ حضرت نے پوچھا کہ تم میرے ساتھ کہاں تک جاؤ گے؟ گارڈ نے کہا کہ میں فلاں اسٹیشن تک جاؤں گا۔ حضرت نے پوچھا کہ اس اسٹیشن کے بعد کیا ہوگا؟ گارڈ نے کہا کہ اس اسٹیشن پر دوسرا گارڈ آئے گا، میں اس کو بتادوں گا کہ یہ حضرت کا سامان ہے، اس کے بارے میں کچھ پوچھ کچھ مت کرنا۔ حضرت نے پوچھا کہ وہ گارڈ میرے ساتھ کہاں تک جائے گا؟ گارڈ نے کہا کہ وہ تو اور آگے جائے گا، اس سے پہلے ہی آپ کا اسٹیشن آجائے گا۔ حضرت نے فرمایا کہ میں تو اور آگے

جاؤں گا یعنی آخرت کی طرف جاؤں گا اور اپنی قبر میں جاؤں گا، وہاں پر کونسا گارڈ میرے ساتھ جائے گا؟ جب وہاں آخرت میں مجھ سے سوال ہوگا کہ ایک سرکاری گاڑی میں سامان کا کرایہ ادا کئے بغیر جو سفر کیا اور جو چوری کی اس کا حساب دو۔ تو وہاں پر کونسا گارڈ میری مدد کرے گا؟

معاملات کی خرابی سے زندگی حرام

چنانچہ وہاں یہ بات مشہور تھی کہ جب کوئی شخص ریلوے کے دفتر میں اپنے سامان کا وزن کرا رہا ہوتا تو لوگ سمجھ جاتے تھے کہ یہ شخص تھانہ بھون جانے والا ہے، اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلقین میں سے ہے۔ حضرت والا کی بہت سی باتیں لوگوں نے لے کر مشہور کر دیں، لیکن یہ پہلو کہ ایک پیسہ بھی شریعت کے خلاف کسی ذریعہ سے ہمارے پاس نہ آئے، یہ پہلو نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ آج کتنے لوگ اس قسم کے معاملات کے اندر مبتلا ہیں اور ان کو خیال بھی نہیں آتا کہ ہم یہ معاملات شریعت کے خلاف اور ناجائز کر رہے ہیں۔ اگر ہم نے غلط کام کرکے چند پیسے بچا لئے تو وہ چند پیسے حرام ہو گئے، اور وہ حرام مال ہمارے دوسرے مال کے ساتھ ملنے کے نتیجے میں اس کے برے اثرات ہمارے مال میں پھیل گئے۔ پھر اسی مال سے ہم کھانا کھا رہے ہیں، اسی سے کپڑے بنا رہے ہیں، اسی سے لباس تیار ہو رہا ہے، جس کے نتیجے میں ہماری پوری زندگی حرام ہو رہی ہے۔ اور ہم چونکہ بے حس ہو گئے ہیں، اس لئے حرام مال اور حرام آمدنی کے برے نتائج کا ہمیں ادراک بھی نہیں۔ یہ حرام مال ہماری زندگی میں کیا فساد مچا رہا ہے۔ اس کا ہمیں احساس نہیں۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ احساس عطا فرماتے ہیں، ان کو پتہ لگتا ہے کہ حرام چیز کیا ہوتی ہے۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کا چند مشکوک لقمے کھانا

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے جلیل القدر استاذ تھے، اور دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس تھے، وہ فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ میں ایک دعوت میں چلا گیا اور وہاں جاکر کھانا کھالیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ اس شخص کی آمدنی مشکوک ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں مہینوں تک ان چند لقموں کی ظلمت اپنے دل میں محسوس کرتا رہا، اور مہینوں تک میرے دل میں گناہ کرنے کے جذبات پیدا ہوتے رہے، اور طبیعت میں یہ داعیہ بار بار پیدا ہوتا تھا کہ فلاں گناہ کرلوں، فلاں گناہ کرلوں۔ حرام مال سے یہ ظلمت پیدا ہوجاتی ہے۔

حرام کی دو قسمیں

یہ جو آج ہمارے دلوں سے گناہوں کی نفرت مٹتی جارہی ہے، اور گناہ کے گناہ ہونے کا احساس ختم ہورہا ہے، اس کا ایک بہت بڑا سبب یہ ہے کہ ہمارے مال میں حرام مال کی ملاوٹ ہوچکی ہے۔ پھر ایک تو وہ حرام ہے جو کھلا حرام ہے جس کو ہر شخص جانتا ہے کہ یہ حرام ہے۔ جیسے رشوت کا مال، سود کا مال، جوا کا مال، دھوکے کا مال، چوری کا مال وغیرہ۔ لیکن حرام کی دوسری قسم وہ حرام ہے جس کے حرام ہونے کا ہمیں احساس ہی نہیں ہے، حالانکہ وہ بھی حرام ہے اور وہ حرام چیز ہمارے کاروبار میں مل رہی ہے۔ اس دوسری قسم کی تفصیل سنئے۔

ملکیت متعین ہونی چاہئے

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم یہ ہے کہ معاملات چاہے بھائیوں کے درمیان ہوں، باپ بیٹے کے درمیان ہوں، شوہر اور بیوی کے درمیان ہوں۔ وہ

معاملات بالکل صاف اور بے غبار ہونے چاہئیں اور ان میں کوئی غبار نہ ہونا چاہئے۔ اور ملکیتیں آپس میں متعین ہونی چاہئیں کہ کونسی چیز باپ کی ملکیت ہے اور کونسی چیز بیٹے کی ملکیت ہے۔ کونسی چیز شوہر کی ملکیت ہے اور کونسی چیز بیوی کی ملکیت ہے۔ کونسی چیز ایک بھائی کی ہے اور کونسی چیز دوسرے بھائی کی ہے۔ یہ ساری بات واضح اور صاف ہونی چاہئے، یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿تعاشروا کالاخوان، تعاملوا کالاجانب﴾

یعنی بھائیوں کی طرح رہو، لیکن آپس کے معاملات اجنبیوں کی طرح کرو۔ مثلاً اگر قرض کا لین دین کیا جارہا ہے تو اس کو لکھ لو کہ یہ قرض کا معاملہ ہے، اتنے دن کے بعد اس کی واپسی ہوگی۔

باپ بیٹوں کے مشترک کاروبار

آج ہمارا سارا معاشرہ اس بات سے بھرا ہوا ہے کہ کوئی بات صاف ہی نہیں۔ اگر باپ بیٹوں کے درمیان کاروبار ہے تو وہ کاروبار ویسے ہی چل رہا ہے، اس کی کوئی وضاحت نہیں ہوتی کہ بیٹے باپ کے ساتھ جو کام کررہے ہیں وہ آیا شریک کی حیثیت میں کررہے ہیں، یا ملازم کی حیثیت میں کررہے ہیں، یا ویسے ہی باپ کی مفت مدد کررہے ہیں، اس کا کچھ پتہ نہیں، مگر تجارت ہورہی ہے، ملیں قائم ہورہی ہیں، دکانیں بڑھتی جارہی ہیں، مال اور جائیداد بڑھتا جارہا ہے۔ لیکن یہ پتہ نہیں ہے کہ کس کا کتنا حصّہ ہے۔ اگر ان سے کہا بھی جائے کہ اپنے معاملات کو صاف کرو، تو جواب یہ دیا جاتا ہے کہ یہ تو غیریت کی بات ہے۔ بھائیوں بھائیوں میں صفائی کی کیا ضرورت ہے؟ یا باپ بیٹوں میں صفائی کی کیا ضرورت ہے؟ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب شادیاں ہوجاتی ہیں اور بچے ہوجاتے ہیں، اور شادی میں کسی نے زیادہ خرچ

کرلیا اور کسی نے کم خرچ کیا۔ یا ایک بھائی نے مکان بنالیا اور دوسرے نے ابھی تک مکان نہیں بنایا۔ بس اب دل میں شکایتیں اور ایک دوسرے کی طرف سے کینہ پیدا ہونا شروع ہوگیا، اور اب آپس میں جھگڑے شروع ہوگئے کہ فلاں زیادہ کھا گیا اور مجھے کم ملا۔ اور اگر اس دوران باپ کا انتقال ہوجائے تو اس کے بعد بھائیوں کے درمیان جو لڑائی اور جھگڑے ہوتے ہیں وہ لامتناہی ہوتے ہیں، پھر ان کے حل کا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔

باپ کے انتقال پر میراث کی تقسیم فوراً کریں

جب باپ کا انتقال ہوجائے تو شریعت کا حکم یہ ہے کہ فوراً میراث تقسیم کرو، میراث تقسیم کرنے میں تاخیر کرنا حرام ہے۔ لیکن آج کل یہ ہوتا ہے کہ باپ کے انتقال پر میراث تقسیم نہیں ہوتی، اور جو بڑا بیٹا ہوتا ہے وہ کاروبار پر قابض ہوجاتا ہے۔ اور بیٹیاں خاموش بیٹھی رہتی ہیں، ان کو کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ ہمارا کیا حق ہے اور کیا نہیں ہے؟ یہاں تک کہ اسی حالت میں دس سال اور بیس سال گزر گئے۔ اور پھر اس دوران کسی اور کا بھی انتقال ہوگیا، یا کسی بھائی نے اس کاروبار میں اپنا پیسہ ملا دیا، پھر سالہا سال گزرنے کے بعد جب ان کی اولاد بڑی ہوئی تو اب جھگڑے کھڑے ہوگئے۔ اور جھگڑے ایسے وقت میں کھڑے ہوئے جب ڈور الجھی ہوئی ہے۔ اور جب وہ جھگڑے انتہاء کی حد تک پہنچے تو اب مفتی صاحب کے پاس چلے آرہے ہیں کہ اب آپ بتائیں کہ ہم کیا کریں۔ مفتی صاحب بیچارے ایسے وقت میں کیا کریں گے۔ اب اس وقت یہ معلوم کرنا مشکل ہوتا ہے کہ جس وقت کاروبار کے اندر شرکت تھی، اور بیٹے اپنے باپ کے ساتھ مل کر کاروبار کررہے تھے، اس وقت بیٹے کس حیثیت میں کام کررہے تھے؟

مشترک مکان کی تعمیر میں حصہ داروں کا حصہ

یا مثلاً ایک مکان بن رہا ہے، تعمیر کے دوران کچھ پیسے باپ نے لگادیئے، کچھ پیسے ایک بیٹے نے لگادیئے کچھ دوسرے بیٹے نے لگادیئے، کچھ تیسرے بیٹے نے لگادیئے۔ لیکن یہ پتہ نہیں کہ کون کس حساب سے کس طرح سے کس تناسب سے لگارہا ہے، اور یہ بھی پتہ نہیں کہ جو پیسے تم لگارہے ہو وہ آیا بطور قرض کے دے رہے ہو اور اس کو واپس لوگے، یا مکان میں حصہ دار بن رہے ہو، یا بطور امداد اور تعاون کے پیسے دے رہے ہو، اس کا کچھ پتہ نہیں۔ اب مکان تیار ہوگیا اور اس میں رہنا شروع کردیا۔ اب جب باپ کا انتقال ہوا یا آپس میں دوسرے مسائل پیدا ہوئے تو اب مکان پر جھگڑے کھڑے ہوگئے۔ اب مفتی صاحب کے پاس چلے آرہے ہیں کہ فلاں بھائی یہ کہتا ہے کہ میرا اتنا حصہ ہے، مجھے اتنا ملنا چاہئے۔ دوسرا کہتا ہے مجھے اتنا ملنا چاہئے۔ جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ بھائی! جب تم نے اس مکان کی تعمیر میں پیسے دیئے تھے، اس وقت تمہاری کیا نیت تھی؟ کیا تم نے بطور قرض دیے تھے؟ یا تم مکان میں حصہ دار بننا چاہتے تھے؟ یا باپ کی مدد کرنا چاہتے تھے؟ اس وقت کیا بات تھی؟ تو یہ جواب ملتا ہے کہ ہم نے تو پیسے دیتے وقت کچھ سوچا ہی نہیں تھا، نہ تو ہم نے مدد کے بارے میں سوچا تھا، اور نہ حصہ داری کے بارے میں سوچا تھا، اب آپ کوئی حل نکالیں۔ جب ڈور الجھ گئی اور سرا ہاتھ نہیں آرہا ہے تو اب مفتی صاحب کی مصیبت آئی کہ وہ اس کا حل نکالیں کہ کس کا کتنا حصہ بنتا ہے۔ یہ سب اس لئے ہوا کہ معاملات کے بارے میں حضور اقدس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم پر عمل نہیں کیا۔ نفلیں ہورہی ہیں، تہجد کی نماز ہورہی ہے، اشراق کی نماز ہورہی ہے، لیکن معاملات میں سب الم غلم ہورہا ہے، کسی چیز کا کچھ پتہ نہیں۔ یہ سب کام حرام ہورہا ہے۔ جب یہ معلوم نہیں کہ میرا حق کتنا ہے اور دوسرے کا حق کتنا ہے، تو اس صورت میں جو کچھ تم اس میں سے کھارہے ہو، اس کے حلال ہونے میں بھی

شبہ ہے۔ جائز نہیں۔

حضرت مفتی صاحب ؒ اور ملکیت کی وضاحت

میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین۔ ان کا ایک مخصوص کمرہ تھا اس میں آرام فرمایا کرتے تھے۔ ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی، اسی پر آرام کیا کرتے تھے۔ اسی پر لکھنے پڑھنے کا کام کیا کرتے تھے۔ وہیں پر لوگ آکر ملاقات کیا کرتے تھے۔ میں یہ دیکھتا تھا کہ جب اس کمرے میں کوئی سامان باہر سے آتا تو فوراً واپس بھجوادیتے تھے۔ مثلاً حضرت والد صاحب نے پانی منگوایا، میں گلاس میں پانی بھر کر پلانے چلا گیا۔ جب آپ پانی پی لیتے تو فوراً فرماتے کہ یہ گلاس واپس رکھ آؤ جہاں سے لائے تھے۔ جب گلاس واپس لیجانے میں دیر ہوجاتی تو ناراض ہوجاتے۔ اگر پلیٹ آجاتی تو فوراً فرماتے کہ یہ پلیٹ واپس باورچی خانے میں رکھ آؤ۔ ایک دن میں نے کہا کہ حضرت! اگر سامان واپس لیجانے میں تھوڑی دیر ہوجایا کرے تو معاف فرمادیا کریں۔ فرمانے لگے تم بات سمجھتے نہیں ہو۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں نے اپنے وصیت نامہ میں لکھا ہوا ہے کہ اس کمرے میں جو سامان بھی ہے وہ میری ملکیت ہے، اور باقی کمروں میں اور گھر میں جو سامان ہے وہ تمہاری والدہ کی ملکیت ہے۔ اس لئے میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ کبھی دوسرے کمروں کا سامان یہاں پر آجائے، اور اسی حالت میں میرا انتقال ہوجائے تو اس وصیت نامہ کے مطابق تم یہ سمجھو گے کہ یہ میری ملکیت ہے، حالانکہ وہ میری ملکیت نہیں۔ اس وجہ سے میں کوئی چیز دوسروں کی اپنے کمرے میں نہیں رکھتا، واپس کروادیتا ہوں۔

حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحب ؒ کی احتیاط

جب حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہوگئی، تو میرے شیخ حضرت

ڈاکٹر عبد الحئی صاحب قدس اللہ سرہ تعزیت کے لئے تشریف لائے۔ حضرت والد صاحب سے حضرت ڈاکٹر صاحب کو بہت ہی والہانہ تعلق تھا، جس کا ہم اور آپ تصور نہیں کرسکتے، چونکہ آپ ضعیف تھے، اس وجہ سے اس وقت آپ پر کمزوری کے آثار نمایاں تھے، مجھے اس وقت خیال آیا کہ حضرت والا پر اس وقت بہت ضعف اور غم ہے۔ تو اندر سے میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا خمیرہ لے آیا جو آپ تناول فرمایا کرتے تھے۔ اور حضرت والا کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے کہا کہ حضرت آپ خمیرہ کا ایک چمچہ تناول فرمالیں۔ حضرت والا نے اس خمیرہ کو دیکھتے ہی کہا کہ تم یہ خمیرہ کیسے لے آئے، یہ خمیرہ تو اب میراث کا اور ترکہ کا ایک حصہ بن گیا ہے، اب تمہارے لئے یہ جائز نہیں کہ اس طرح یہ خمیرہ اٹھا کر کسی کو دیدو، اگرچہ وہ ایک چمچہ کے برابر ہی کیوں نہ ہو۔ میں نے کہا کہ حضرت! حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے جتنے ورثاء ہیں، وہ سب الحمد للہ بالغ ہیں اور وہ سب یہاں موجود ہیں۔ اور سب اس بات پر راضی ہیں کہ آپ یہ خمیرہ تناول فرمالیں۔ تب حضرت نے وہ خمیرہ تناول فرمایا:

حساب اسی دن کرلیں

اس کے ذریعہ حضرت والا نے یہ سبق دے دیا کہ یہ بات ایسی بات نہیں ہے کہ آدمی روا روی میں گزر جائے۔ فرض کریں کہ اگر تمام ورثاء میں ایک وارث بھی نابالغ ہوتا یا موجود نہ ہوتا اور اس کی رضامندی شامل نہ ہوتی تو اس خمیرہ کا ایک چمچہ بھی حرام ہوجاتا۔ اس لئے شریعت کا یہ حکم ہے کہ جونہی کسی کا انتقال ہوجائے تو جلد از جلد اس کی میراث تقسیم کردو، یا کم از کم حساب کرکے رکھ لو کہ فلاں کا اتنا حصہ ہے اور فلاں کا اتنا حصہ ہے، اس لئے کہ بعض اوقات تقسیم میں کچھ تاخیر ہوجاتی ہے، بعض اشیاء کی قیمت لگانی پڑتی ہے اور بعض اشیاء کو فروخت کرنا پڑتا ہے، لیکن حساب اسی دن ہوجانا چاہئے۔ آج اس وقت ہمارے معاشرے میں جتنے

جھگڑے پھیلے ہوئے ہیں، ان جھگڑوں کا ایک بڑا بنیادی سبب حساب کتاب کا صاف نہ ہونا اور معاملات کا صاف نہ ہونا ہے۔

امام محمدؒ اور تصوف پر کتاب

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ جو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں۔ یہ وہ بزرگ ہیں جنہوں نے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے سارے فقہی احکام اپنی تصانیف کے ذریعہ ہم تک پہنچائے۔ ان کا احسان ہمارے سروں پر اتنا ہے کہ ساری عمر تک ہم ان کے احسان کا صلہ نہیں دے سکتے۔ ان کی لکھی ہوئی کتابیں کئی اونٹوں کے بوجھ کے برابر تھیں۔ کسی نے ان سے پوچھا کہ حضرت! آپ نے بہت ساری کتابیں لکھیں ہیں لیکن تصوف اور زہد کے موضوع پر کوئی کتاب نہیں لکھی؟ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں فرمایا کہ تم کیسے کہتے ہو کہ میں نے تصوف پر کتاب نہیں لکھی، میں نے جو "کتاب البیوع" لکھی ہے، وہ تصوف ہی کی تو کتاب ہے۔ مطلب یہ تھا کہ خرید و فروخت کے احکام اور لین دین کے احکام حقیقت میں تصوف ہی کے احکام ہیں، اس لئے کہ زھد اور تصوف در حقیقت شریعت کی ٹھیک ٹھیک پیروی کا نام ہے۔ اور شریعت کی ٹھیک ٹھیک پیروی خرید و فروخت اور لین دین کے احکام پر عمل کرنے سے ہوتی ہے۔

دوسروں کی چیز اپنے استعمال میں لانا

اسی طرح دوسرے کی چیز استعمال کرنا حرام ہے مثلاً کوئی دوست ہے یا بھائی ہے، اس کی چیز اس کی اجازت کے بغیر استعمال کرلی تو یہ جائز نہیں ہے بلکہ حرام ہے۔ البتہ اگر آپ کو یہ یقین ہے کہ اس کی چیز استعمال کرنے سے وہ خوش ہوگا اور خوشی سے اس کی اجازت دے دے گا، تب تو استعمال کرنا جائز ہے۔ لیکن جہاں ذرا بھی اس کی اجازت میں شک ہو، چاہے وہ حقیقی بھائی ہی کیوں نہ ہو، یا چاہے وہ بیٹا ہو اور

اپنے باپ کی چیز استعمال کر رہا ہو، جب تک اس بات کا اطمینان نہ ہو کہ خوش دلی سے وہ اجازت دے دے گا، یا میرے استعمال کرنے سے وہ خوش ہوگا، اس وقت تک اس کا استعمال جائز نہیں۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿لا یحل مال امری مسلم الا بطیب نفس منہ﴾

(کنز العمال، حدیث: ۳۹۷)

کسی مسلمان کا مال تمہارے لئے حلال نہیں جب تک وہ خوش دلی سے نہ دے۔ اس حدیث میں "اجازت" کا لفظ استعمال نہیں فرمایا بلکہ "خوش دلی" کا لفظ استعمال فرمایا۔ مطلب یہ ہے کہ صرف اجازت کافی نہیں بلکہ وہ اس طرح اجازت دے کہ اس کا دل خوش ہو، تب تو وہ چیز حلال ہے۔ اگر آپ دوسرے کی چیز استعمال کر رہے ہیں، لیکن آپ کو اس کی خوش دلی کا یقین نہیں ہے، تو آپ کے لئے وہ چیز استعمال کرنا جائز نہیں۔

ایسا چندہ حلال نہیں

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ مدرسوں کے چندے اور انجمنوں کے چندے کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ یہ چندے اس طرح وصول کرنا کہ دوسرا شخص دباؤ کے تحت چندہ دیدے، ایسا چندہ حلال نہیں۔ مثلاً آپ نے مجمع عام میں چندہ لینا شروع کر دیا، اس مجمع میں ایک آدمی شرما شرمی میں یہ سوچ کر چندہ دے رہا ہے کہ اتنے سارے لوگ چندہ دے رہے ہیں اور میں چندہ نہ دوں تو میری ناک کٹ جائے گی، اور دل کے اندر چندہ دینے کی خواہش نہیں تھی، تو یہ چندہ خوش دلی کے بغیر دیا گیا، یہ "چندہ" لینے والے کے لئے حلال نہیں۔ اس موضوع پر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے، اور اس میں یہ احکام لکھے ہیں کہ کس حالت میں چندہ لینا جائز ہے اور کس حالت میں چندہ لینا جائز نہیں۔

ہر ایک کی ملکیت واضح ہونی چاہئے

بہرحال۔ یہ اصول ذہن میں رکھو کہ جب تک دوسرے کی خوش دلی کا اطمینان نہ ہو، اس وقت تک۔دوسرے کی چیز استعمال کرنا حلال نہیں، چاہے وہ بیٹا کیوں نہ ہو، باپ کیوں نہ ہو، بھائی اور بہن کیوں نہ ہو، چاہے بیوی اور شوہر کیوں نہ ہو۔ اس اصول کو فراموش کرنے کی وجہ سے ہمارے مال میں حرام کی آمیزش ہوجاتی ہے۔ اگر کوئی شخص کہے کہ میں تو کوئی غلط کام نہیں کرتا، رشوت میں نہیں لیتا، سود میں نہیں کھاتا، چوری میں نہیں کرتا، ڈاکہ میں نہیں ڈالتا، اس لئے میرا مال تو حلال ہے۔ لیکن اس کو یہ نہیں معلوم کہ اس اصول کا لحاظ نہ رکھنے کی وجہ سے مال حرام کی آمیزش ہوجاتی ہے۔ اور مال حرام کی آمیزش حلال مال کو بھی تباہ کردیتی ہے اور اس کی برکتیں زائل ہوجاتی ہیں، اس کا نفع ختم ہوجاتا ہے۔ اور الٹا اس حرام مال کے نتیجے میں انسان کی طبیعت گناہوں کی طرف چلتی ہے، روحانیت کو نقصان ہوتا ہے۔ اس لئے معاملات کو صاف رکھنے کی فکر کریں کہ کسی معاملے میں کوئی الجھاؤ نہ رہے، ہر چیز صاف اور واضح ہونی چاہئے۔ ہر چیز کی ملکیت واضح ہونی چاہئے کہ یہ چیز میری ملکیت ہے، یہ فلاں کی ملکیت ہے۔ البتہ ملکیت واضح ہوجانے کے بعد آپس میں بھائیوں کی طرح رہو۔ دوسرے شخص کو تمہاری چیز استعمال کرنے کی ضرورت پیش آئے تو دیدو، لیکن ملکیت واضح ہونی چاہئے، تاکہ کل کو کوئی جھگڑا کھڑا نہ ہوجائے۔

مسجد نبوی کے لئے زمین مفت قبول نہ کی

جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کرکے مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ کے پیش نظر سب سے پہلا کام یہ تھا کہ یہاں پر کوئی مسجد بنائی جائے۔ وہ مسجد نبوی جس میں ایک نماز کا ثواب پچاس ہزار نمازوں کے برابر ہے۔ چنانچہ ایک جگہ

آپ کو پسند آگئی جو خالی پڑی ہوئی تھی۔ آپ نے اس جگہ کے بارے میں معلوم کرایا کہ یہ کس کی جگہ ہے؟ تو پتہ چلا کہ یہ بنی نجار کے لوگوں کی جگہ ہے۔ جب بنو نجار کے لوگوں کو پتہ چلا کہ آپ اس جگہ پر مسجد بنانا چاہتے ہیں تو انہوں نے آکر عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! یہ تو ہماری بڑی خوش قسمتی کی بات ہے کہ ہماری جگہ پر مسجد بنائی جائے۔ ہم یہ جگہ مسجد کے لئے مفت دیتے ہیں تاکہ آپ یہاں پر مسجد نبوی کی تعمیر فرمائیں۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں، میں مفت نہیں لوں گا، تم اس کی قیمت بتاؤ، قیمت کے ذریعہ لوں گا۔ حالانکہ بظاہر یہ معلوم ہو رہا تھا کہ وہ لوگ اپنی سعادت اور خوش نصیبی سمجھ کر یہ چاہ رہے تھے کہ ان کی جگہ مسجد نبوی کی تعمیر میں استعمال ہو جائے، لیکن اس کے باوجود آپ نے مفت لینا گوارہ نہیں کیا۔

تعمیر مسجد کے لئے دباؤ ڈالنا

علماء کرام نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ ویسے تو جب بنی نجار کے لوگ مسجد کے لئے چندہ کے طور پر مفت زمین دے رہے تھے تو یہ زمین لینا جائز تھا، اس میں کوئی گناہ کی بات نہیں تھی۔ لیکن چونکہ مدینہ منورہ میں اسلام کی یہ پہلی مسجد تعمیر ہو رہی تھی۔ اگرچہ قبا میں ایک مسجد تعمیر ہو چکی تھی۔ اور یہ وہ مسجد تھی جس کو آئندہ حرم مکہ کے بعد دوسرا مقام حاصل ہونا تھا۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو پسند نہیں فرمایا کہ یہ زمین اس طرح مفت قیمت کے بغیر لے لی جائے۔ ورنہ آئندہ کے لئے لوگوں کے سامنے یہ نظیر بن جائے گی کہ جب مسجد بنانی ہو تو مسجد کے لئے زمین قیمتاً خریدنے کے بجائے لوگ مفت اپنی زمینیں دیں۔ اور اس لئے یہ زمین مفت قبول نہیں کی تاکہ لوگوں پر یہ واضح فرمادیں کہ یہ بات درست نہیں کہ مسجد کی تعمیر کی خاطر دوسروں پر دباؤ ڈالا جائے۔ یا دوسروں کی املاک پر نظر رکھی جائے۔ اس وجہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے پیسے دے کر وہ زمین خریدی اور پھر مسجد نبوی کی تعمیر فرمائی تاکہ معاملہ صاف رہے اور کسی

قسم کی کوئی الجھن برقرار نہ رہے۔

پورے سال کا نفقہ دینا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات، جو حقیقت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریک حیات بننے کی وہی مستحق تھیں، اور اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں سے دنیا کی محبت نکالی ہوئی تھی، اور آخرت کی محبت ان کے دلوں میں بھری ہوئی تھی۔ لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ یہ تھا کہ سال کے شروع میں اپنی تمام ازواج مطہرات کا نفقہ اکٹھا دے دیا کرتے تھے، اور ان سے فرما دیتے کہ یہ تمہارا نفقہ ہے تم جو چاہو کرو۔ اب وہ ازواج مطہرات بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات تھیں، ان کے یہاں تو ہر وقت صدقہ خیرات کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ چنانچہ وہ ازواج مطہرات بقدر ضرورت اپنے پاس رکھتیں، باقی سب خیرات کر دیتی تھیں۔ لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مثال قائم فرمائی کہ پورے سال کا نفقہ اکٹھا دے دیا۔

ازواج مطہرات سے برابری کا معاملہ کرنا

اللہ تعالیٰ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے پابندی اٹھالی تھی کہ وہ اپنی ازواج مطہرات میں برابری کریں۔ بلکہ آپ کو یہ اختیار دیدیا تھا کہ جس کو چاہیں زیادہ دیں اور جس کو چاہیں کم دیں، اس معاملے میں ہم آپ سے مواخذہ نہیں کریں گے۔ اس اختیار کے نتیجے میں ازواج مطہرات کے درمیان برابری کرنا آپ کے ذمہ فرض نہیں رہا تھا۔ جب کہ امت کے تمام افراد کے لئے برابری کرنا فرض ہے۔ لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری عمر اس اختیار اور اجازت پر عمل نہیں فرمایا بلکہ ہر چیز میں برابری فرمائی، اور ان کی ملکیت کو واضح اور نمایاں فرمادیا تھا۔ اور ان کے حقوق پوری طرح زندگی بھر ادا فرمائے۔

خلاصہ

بہرحال۔ ان احادیث اور آیات میں جو بنیادی اصول بیان فرمایا، جس کو ہم فراموش کرتے جارہے ہیں۔ وہ "معاملات کی صفائی" اور معاملات کی درستی ہے یعنی معاملہ صاف اور واضح ہو، اس میں کوئی اجمال اور ابہام نہ رہے۔ چاہے وہ مرد ہو یا عورت، ہر ایک اپنے معاملات کو صاف رکھے۔ اس کے بغیر آمدنی اور اخراجات شریعت کی حدود میں نہیں رہتے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اور اپنے فضل و کرم سے اس حقیقت اور اس حکم کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین

اسلام کا مطلب کیا ہے؟

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

تاریخ خطاب : ۲۲ر نومبر ۱۹۹۱ء

مقام خطاب : جامع مسجد بیت المکرم
گلشن اقبال کراچی

وقت خطاب : بعد نماز عصر تا مغرب

اصلاحی خطبات : جلد نمبر ۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام کا مطلب کیا؟

الحمد للّٰہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ و نؤمن بہ ونتوکل علیہ، ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیات اعمالنا، من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ، ونشھد ان لا الہ الا اللّٰہ وحدہ لاشریک لہ، ونشھدان سیدنا وسندنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ، صلی اللّٰہ تعالٰی علیہ وعلی آلہ واصحابہ وبارک وسلم تسلیماً کثیرًا کثیرا۔

اما بعد!

فاعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم۔ بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

﴿یایھا الذین آمنوا ادخلوا فی السلم کافۃ ولا تتبعوا خطوٰت الشیطن انہ لکم عدو مبین ۞﴾ (سورۃ البقرۃ: ۲۰۸)

آمنت باللہ صدق اللّٰہ مولانا العظیم، وصدق رسولہ النبی الکریم و نحن علی ذلک من الشاھدین۔

تمہید

میرے محترم بزرگو اور دوستو! سب سے پہلے میں آپ حضرات کے اس جذبے پر مبارک باد پیش کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے اپنے اوقات میں سے کچھ وقت دین کی بات سننے کے لئے نکالا، اور اس غرض کے لئے یہاں جمع ہوئے کہ اللہ اور اللہ کے

رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام اور تعلیمات کی کچھ باتیں سن جائیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے اس جذبے کو قبول فرمائے، اور اس کے کہنے والے اور سننے والے سب کو عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ــــ اس وقت میں نے آپ حضرات کے سامنے قرآن کریم کی ایک آیت تلاوت کی ہے۔ اس آیت کی تھوڑی سی تشریح آپ حضرات کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مؤمنوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہوجاؤ اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی مت کرو اور اس کے پیچھے مت چلو۔

کیا ایمان اور اسلام علیحدہ ہیں

یہاں سب سے پہلی بات جو سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان الفاظ سے خطاب کیا کہ "اے ایمان والو" یعنی ان لوگوں سے خطاب ہورہا ہے جو ایمان لاچکے، جو کلمہ طیبہ اور کلمہ شہادت پر اپنے اعتقاد کا اظہار کرچکے اور "اشهد ان لا اله الا الله واشهد ان محمدا رسول الله" کہہ چکے، ان سے خطاب کر کے کہا جارہا ہے کہ اے ایمان والو! اسلام میں داخل ہوجاؤ۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب ایمان لاچکے تو ایمان لانے کے بعد اسلام میں داخل ہونے کے کیا معنی؟ عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ جب ایک شخص ایمان لے آیا تو وہ اسلام میں بھی داخل ہوگیا، ایمان اور اسلام ایک ہی چیز سمجھی جاتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ اے ایمان والو، اسلام میں داخل ہوجاؤ، جس سے یہ سمجھ میں آرہا ہے کہ ایمان کچھ اور چیز ہے اور اسلام کچھ اور چیز ہے۔ اور ایمان لانے کے بعد اسلام میں داخل ہونا بھی ضروری ہے۔

"اسلام" لانے کا مطلب

پہلی بات تو سمجھنے کی یہ ہے کہ اسلام کیا ہے؟ اور ایمان والوں کو اسلام میں داخل ہونے کی جو دعوت دی جارہی ہے، اس سے کیا مراد ہے اور اسلام کس کو کہتے ہیں؟ "اسلام" عربی زبان کا لفظ ہے، اسلام کے معنی ہیں اپنے آپ کو کسی کے آگے جھکا دینا، یعنی کسی بڑی طاقت کے سامنے اپنا سر تسلیم خم کردینا اور اپنے آپ کو اس کا تابع بنا لینا کہ جیسا وہ کہے اس کے مطابق انسان کرے، یہ ہیں "اسلام" کے معنی۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ صرف زبان سے کلمہ طیبہ پڑھ لینا اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر اور یوم آخرت پر ایمان لے آنا، یہ باتیں اسلام میں داخل ہونے کے لئے کافی نہیں، بلکہ اسلام میں داخل ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ انسان اپنے پورے وجود کو اللہ تعالیٰ کے حکم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے آگے جھکا دے۔ جب تک یہ نہیں ہوگا اس وقت تک انسان صحیح معنی میں اسلام کے اندر داخل نہیں ہوگا۔

بیٹے کے ذبح کا حکم عقل کے خلاف تھا

یہی لفظ "اسلام" اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی سورۃ صافات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں بھی استعمال فرمایا ہے۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلاۃ والسلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم ہوا تھا کہ وہ اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ الصلاۃ والسلام کو ذبح کردیں، جس کی یادگار ہم اور آپ ہر سال عید الاضحیٰ کے موقع پر مناتے ہیں۔ بیٹا بھی وہ جو امنگوں اور مرادوں سے طلب کیا ہوا، جس کے لئے آپ نے دعائیں کی تھیں کہ یا اللہ! مجھے بیٹا عنایت فرما دیجئے، جب وہ بیٹا ذرا چلنے پھرنے اور آنے جانے کے لائق ہوا اور باپ کا ہاتھ بٹانے کے لائق ہوا تو اس وقت یہ حکم آیا کہ اس کے گلے پر چھری پھیر کر اس کو ختم کردو۔ اب اگر

اس حکم کو عقل کی میزان میں تول کر دیکھا جائے اور اس کی حکمت اور مصلحت پر غور کیا جائے تو کوئی عقلی حکمت، عقلی مصلحت، کوئی عقلی جواز اس بات کا نظر نہیں آئے گا کہ کوئی باپ اپنے بیٹے کے گلے پر چھری پھیر دے، نہ تو کوئی باپ ایسا کر سکتا ہے اور نہ ہی دنیا کا کوئی انسان اس عمل کو عقل اور انصاف کے مطابق قرار دے سکتا ہے۔

بیٹے کا بھی امتحان ہو گیا

لیکن جب اللہ تعالیٰ کا حکم آگیا کہ اپنے بیٹے کو قربان کردو تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام سے فرمایا:

﴿انی اری فی المنام انی اذبحک فانظر ماذا تری﴾

(الصافات: ۱۰۲)

بیٹا! میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تمہیں ذبح کر رہا ہوں۔ بتاؤ تمہاری کیا رائے ہے؟ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ یہ سوال اس لئے نہیں کیا کہ ان کے دل میں اس حکم پر عمل کرنے میں تردد تھا بلکہ اس لئے سوال کیا کہ بیٹے کا بھی امتحان لیا جائے کہ دیکھیں بیٹا اس کے بارے میں کیا جواب دیتا ہے۔ وہ بیٹا بھی خلیل اللہ کا بیٹا تھا اور جس کی صلب سے نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لانے والے تھے۔ اس بیٹے نے بھی پلٹ کر یہ نہیں کہا کہ ابا جان میں نے کون سا ایسا جرم کیا ہے، کیا خطا مجھ سے سرزد ہوئی ہے، کیا غلطی میں نے کی ہے جس کی پاداش میں مجھے زندگی سے محروم کیا جارہا ہے اور مجھے قتل کیا جارہا ہے۔ بلکہ جواب میں بیٹے نے یہ کہا کہ:

﴿یا ابت افعل ما تؤمر ستجدنی ان شاء اللہ من الصبرین﴾ (ایضاً)

ابا جان! جو حکم آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوا ہے، اس کو کر گزریے اور میری فکر نہ کیجئے، اس لئے کہ اس حکم پر عمل کرنے میں مجھے تکلیف پہنچے گی تو انشاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اللہ تعالیٰ سے یہ نہیں پوچھا کہ اے اللہ! آپ نے جو مجھے میرے چہیتے بیٹے کو قربان کرنے کا حکم دیا ہے اس میں کیا حکمت اور مصلحت ہے؟ بس دونوں نے یہ دیکھا کہ یہ حکم ہمارے خالق اور ہمارے مالک کی طرف سے آیا ہے اسی وقت دونوں باپ اور بیٹے اس حکم کی تعمیل پر تیار ہو گئے۔

چلتی چھری نہ رُک جائے

قرآن کریم نے اس واقعہ کو بڑے پیارے انداز میں ذکر فرمایا ہے، یعنی جب باپ اور بیٹا اس حکم کو پورا کرنے کے لئے تیار ہو گئے اور باپ کے ہاتھ میں چھری ہے اور بیٹا زمین پر لٹا دیا گیا ہے اور قریب ہے کہ وہ چھری گلے پر چل جائے اور بیٹے کا کام تمام کر دے۔ اس واقعہ کو ذکر کرنے کے لئے قرآن کریم نے جو الفاظ استعمال فرمائے ہیں وہ یہ ہیں:

﴿فلما اسلما وتله للجبين﴾ (الصافات: ۱۰۳)

یعنی جب باپ اور بیٹے دنوں اسلام لے آئے اور دونوں نے اللہ کے حکم کے آگے اپنے آپ کو جھکا دیا اور باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل لٹا دیا۔ پیشانی کے بل اس لئے لٹایا کہ اگر سیدھا لٹائیں تو کہیں ایسا نہ ہو کہ بیٹے کی صورت دیکھ کر اور اس صورت پر ظاہر ہونے والے کرب اور تکلیف کے اثرات دیکھ کر چھری چلنے کی رفتار میں کمی آجائے اور کہیں اللہ تعالیٰ کے حکم کو پورا کرنے میں رُکاوٹ پیدا ہو جائے، اس لئے الٹا لٹایا۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے لفظ "اسلما" استعمال فرمایا، یعنی دونوں اللہ تعالیٰ کے حکم کے آگے جھک گئے۔

اللہ کے حکم کے تابع بن جاؤ

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کی اصطلاح میں "اسلام" کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے آپ کو اور اپنے پورے وجود کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے آگے جھکا دے اور جب اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم آجائے تو یہ نہ پوچھے کہ اس میں عقلی حکمت اور مصلحت کیا ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کا حکم آنے کے بعد اس کی تعمیل کی فکر کرے۔ یہ ہے "اسلام" اور اسی اسلام میں داخل ہونے کے لئے قرآن کریم کی آیت یا یھا الذین آمنوا ادخلوا فی السلم کافۃ میں حکم دیا گیا ہے، یعنی اے ایمان والو! تم نے کلمہ طیبہ اور کلمہ شہادت تو پڑھ لیا لیکن اب اسلام میں داخل ہونے کی ضرورت ہے، وہ یہ کہ اپنے پورے وجود کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع بنا دو اور جو حکم بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے اس کو قبول کرو اور اس کو تسلیم کرو اور اس پر عمل کرو۔

ورنہ عقل کے غلام بن جاؤ گے

اب سوال یہ ہے کہ اللہ کے حکم کو بے چون وچرا کیوں مان لیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر تم اللہ کے حکم کو اس طرح بے چون وچرا نہیں مانو گے بلکہ اپنی عقل اور سمجھ استعمال کر کے یہ کہو گے کہ یہ حکم تو بے کار اور بے فائدہ ہے یا یہ حکم تو انصاف کے خلاف ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم اپنی عقل کے غلام بن کر رہ جاؤ گے اور اللہ کی غلامی اور بندگی کو چھوڑ کر عقل کی غلامی میں مبتلا ہو جاؤ گے۔

علم حاصل کرنے کے ذرائع

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس دنیا میں علم حاصل کرنے کے کچھ ذرائع عطا فرمائے ہیں، ان ذرائع کے ذریعہ انسان علم حاصل کرتا ہے۔ مثلاً سب سے پہلا ذریعہ علم "آنکھ" ہے۔ آنکھ کے ذریعہ چیزوں کو دیکھ کر ان کے بارے میں انسان علم حاصل

کرتا ہے۔ دوسرا ذریعہ علم "زبان" ہے۔ اس زبان کے ذریعہ انسان بہت سی چیزوں کو چکھ کر ان کے بارے میں علم حاصل کرتا ہے۔ تیسرا ذریعہ علم "کان" ہے۔ اس کان کے ذریعہ بہت سی چیزوں کے بارے میں سن کر انسان علم حاصل کرتا ہے۔ ایک ذریعہ علم "ہاتھ" ہے۔ اس کے ذریعہ انسان بہت سی چیزوں کو چھو کر علم حاصل کرتا ہے۔ مثلاً یہ سامنے مائیکروفون ہے۔ اب مجھے آنکھ کے ذریعہ دیکھ کر اس کے بارے میں مجھے یہ علم حاصل ہوا کہ یہ ایک آلہ ہے اور گول بنا ہوا ہے۔ اور ہاتھ لگانے سے پتہ چلا کہ یہ ٹھوس ہے، اور کان کے ذریعہ مجھے پتہ چلا کہ یہ آلہ میری آواز کو دور تک پہنچا رہا ہے۔ دیکھئے! کچھ علم آنکھ کے ذریعہ دیکھ کر حاصل ہوا، کچھ علم کان کے ذریعہ سن کر حاصل ہوا، اور کچھ علم ہاتھ کے ذریعہ چھو کر حاصل ہوا۔

ان ذرائع کا دائرہ کار متعین ہے

لیکن اللہ تعالیٰ نے ان ذرائع علم کا ایک دائرہ کار مقرر کردیا ہے۔ اس دائرہ کے اندر وہ ذریعہ علم کام دے گا۔ اگر اس دائرہ سے باہر اس ذریعہ کو استعمال کرو گے تو وہ ذریعہ کام نہیں دے گا۔ —— مثلاً آنکھ کا دائرہ کار یہ مقرر کردیا ہے کہ وہ دیکھ کر علم عطا کرتی ہے لیکن سن کر علم نہیں دیتی، اس کے اندر سننے کی طاقت موجود نہیں، وہ کام کان کا ہے، اور کان سن سکتا ہے مگر دیکھ نہیں سکتا، زبان چکھ سکتی ہے لیکن اس کے اندر سننے اور دیکھنے کی صلاحیت موجود نہیں۔ اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ میں اپنی آنکھیں تو بند کرلوں اور اپنے کانوں کے ذریعہ یہ دیکھوں کہ میرے سامنے کیا منظر ہے تو وہ احمق اور بیوقوف ہے، اس لئے کہ کان اس کو کوئی منظر نہیں دکھا سکے گا کیونکہ اس نے کان کو اس کے دائرہ کار سے باہر استعمال کیا، کان دیکھنے کے لئے وضع ہی نہیں کئے گئے ہیں۔ یا اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ میں کان کو تو بند کرلوں اور آنکھ کے ذریعہ یہ سنوں کہ میرے سامنے والا شخص کیا بات کہہ رہا ہے تو وہ شخص بھی

بیوقوف ہے، اس لئے کہ یہ سننے کا کام آنکھ انجام نہیں دے سکتی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ آنکھ بیکار ہے، یہ آنکھ بڑی کار آمد ہے، لیکن اس وقت تک کار آمد ہے جب تک اس کو اس کے دائرہ کار میں اور دیکھنے کے کام میں استعمال کیا جائے، اگر سننے میں استعمال کروگے تو یہ آنکھ کوئی کام نہیں دے گی۔

ایک اور ذریعہ علم "عقل"

لیکن ایک مرحلہ ایسا آتا ہے جہاں یہ ظاہری حواس خمسہ آنکھ، کان، ناک، زبان اور ہاتھ معلومات فراہم کرنا چھوڑ دیتے ہیں، کام دینا بند کردیتے ہیں، اس مرحلے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک اور ذریعہ علم عطا فرمایا ہے، وہ ہے انسان کی عقل۔ یہ عقل ان چیزوں کا علم انسان کو عطا کرتی ہے جن کا علم آنکھ کے ذریعہ دیکھ کر حاصل نہیں ہوسکتا، مثلاً یہ مائیکروفون ہے، میں نے ہاتھ کے ذریعہ چھوکر اور آنکھ کے ذریعہ دیکھ کر یہ تو پتہ لگالیا کہ یہ ٹھوس ہے، لوہے کا بنا ہوا ہے، لیکن اس کو کس نے بنایا؟ اور کس طرح یہ وجود میں آیا؟ یہ بات نہ آنکھ دیکھ کر بتاسکتی ہے، نہ کان سن کر بتاسکتا ہے۔ نہ زبان چکھ کر بتاسکتی ہے۔ اس کو معلوم کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ہمیں عقل عطا فرمائی ہے، اس عقل کے ذریعہ ہمیں پتہ چلا کہ اتنا خوبصورت اور شاندار بنا ہوا آلہ جو اتنا اہم کام انجام دے رہا ہے کہ ہماری آواز کو دور تک پہنچا رہا ہے، یہ آلہ خود بخود نہیں بن سکتا، ضرور کسی کاریگر نے اس کو بنایا ہے اور ایسے کاریگر نے بنایا ہے جو بڑا ماہر ہے اور اس فن کو جاننے والا ہے۔ لہٰذا جس جگہ پر یہ حواس خمسہ اپنا کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں، وہاں اللہ تعالیٰ نے ہمیں علم حاصل کرنے کے لئے عقل کا ذریعہ عطا فرمایا ہے۔

عقل کا دائرہ کار

لیکن جس طرح آنکھ، کان اور زبان وغیرہ کا کام غیر محدود نہیں تھا بلکہ ایک دائرہ

کار کے اندر اپنا کام کرتے تھے، اس سے باہر یہ اپنا کام کرنا چھوڑ دیتے تھے، اسی طرح عقل کا کام بھی غیر محدود نہیں بلکہ اس کا بھی ایک دائرہ کار ہے، اس دائرہ کار سے باہر نکل کر وہ بھی انسان کی رہنمائی نہیں کرتی، ایک مرحلہ ایسا آتا ہے جہاں پر عقل بھی خاموش ہوجاتی ہے، جواب دے جاتی ہے اور انسان کی صحیح رہنمائی نہیں کر سکتی۔

ایک اور ذریعہ علم "وحی الٰہی"

اور جس جگہ پر عقل انسان کی صحیح رہنمائی کرنے سے عاجز ہوجاتی ہے، وہاں پر انسان کی رہنمائی کے لئے اللہ تعالیٰ نے تیسرا ذریعہ علم عطا فرمایا ہے، اس تیسرے ذریعہ علم کا نام ہے "وحی الٰہی" یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ "وحی" جو انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوتی ہے۔ یہ "وحی" اسی جگہ پر انسان کی رہنمائی کرتی ہے جس جگہ پر انسان کی تنہا عقل کافی نہیں ہوتی۔ لہٰذا جن باتوں کا ادراک عقل کے ذریعہ ممکن نہیں تھا، ان باتوں کو بتانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی، اس وحی کے ذریعہ ہمیں بتایا کہ یہ کام اس طرح ہے۔

عقل کے آگے "وحی الٰہی"

مثلاً یہ بات کہ اس کائنات کے ختم ہونے کے بعد اور انسان کے مرنے کے بعد ایک زندگی اور آنے والی ہے، جس میں انسان کو اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونا ہے اور اس کو وہاں پر اپنے تمام اعمال کا جواب دینا ہے، اور وہاں پر ایک عالم جنت ہے اور ایک عالم جہنم ہے۔ یہ ساری باتیں ایسی ہیں کہ اگر ان کے بارے میں وحی نازل نہ ہوتی، اور وحی کے ذریعہ انبیاء علیہم السلام کو نہ بتایا جاتا، تو محض عقل کی بنیاد پر ہم اور آپ یہ پتہ نہیں لگاسکتے تھے کہ مرنے کے بعد کیسی زندگی آنے والی ہے اور اس میں کیسے حالات پیش آنے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے سامنے کس طرح جواب دینا ہے۔ اس مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک تیسرا ذریعہ علم ہمیں عطا فرمایا، جس کا

نام "وحی الٰہی" ہے۔

وحی الٰہی کو عقل سے مت تولو

یہ "وحی الٰہی" آتی ہی اس جگہ پر ہے جہاں عقل کام نہیں دے سکتی تھی اور انسان کی رہنمائی نہیں کر سکتی تھی، اس وجہ سے اس جگہ پر "وحی الٰہی" ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں وحی الٰہی کی بات اس وقت تک نہیں مانوں گا جب تک وہ بات میری عقل میں نہ آجائے۔ وہ شخص ایسا ہی بیوقوف ہے جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ میں یہ بات اس وقت تک تسلیم نہیں کروں گا جب تک مجھے اپنے کان سے یہ چیز نظر نہ آنے لگے۔ ایسا شخص بیوقوف ہے، اس لئے کہ کان دیکھنے کے لئے بنایا ہی نہیں گیا۔ اسی طرح وہ شخص بھی بیوقوف ہے جو یہ کہے کہ میں وحی الٰہی کی بات اس وقت تک تسلیم نہیں کروں گا جب تک میری عقل نہ مان لے۔ اس لئے کہ وحی الٰہی تو آتی ہی اس جگہ پر ہے جہاں عقل کی پرواز ختم ہو جاتی ہے، جیسے میں نے آپ کو جنت اور جہنم کی مثال دی۔ اب لوگ یہ کہتے ہیں کہ جنت اور جہنم کی بات ہماری عقل میں نہیں آتی۔ حالانکہ یہ چیزیں عقل کے اندر کیسے آسکتی ہیں؟ اس لئے کہ یہ چیزیں عقل کی محدود پرواز اور محدود دائرے سے باہر ہیں، اسی وجہ سے ان کو بیان کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام پر وحی نازل فرمائی۔

اچھائی اور بُرائی کا فیصلہ "وحی" کرے گی

اسی طرح یہ بات کہ کونسی چیز اچھی ہے اور کون سی چیز بری ہے؟ کیا کام اچھا ہے اور کیا کام بُرا ہے؟ کیا چیز حلال ہے اور کیا چیز حرام ہے؟ کون سا کام جائز ہے اور کون سا کام ناجائز ہے؟ یہ کام اللہ تعالیٰ کو پسند اور یہ کام اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے، یہ فیصلہ وحی پر چھوڑا گیا، محض انسان کی عقل پر نہیں چھوڑا گیا، اس لئے کہ تنہا انسان

کی عقل یہ فیصلہ نہیں کر سکتی تھی کہ کون سا کام اچھا ہے اور کون سا کام بُرا ہے، کون سا حلال ہے اور کون سا حرام ہے۔

انسانی عقل غلط رہنمائی کرتی ہے

اس دنیا کے اندر جتنی بڑی سے بڑی بُرائیاں پھیلی ہیں اور غلط سے غلط نظریات اس دنیا کے اندر آئے وہ سب عقل کی بنیاد پر آئے۔ مثلاً ہم اور آپ بحیثیت مسلمان کے یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ سور کا گوشت حرام ہے۔ اگر اس کے بارے میں وحی کی رہنمائی سے ہٹ کر صرف عقل کی بنیاد پر سوچیں گے تو عقل غلط رہنمائی کرے گی، جیسا کہ غیر مسلموں نے صرف عقل کی بنیاد پر یہ کہہ دیا کہ ہمیں تو سور کا گوشت کھانے میں بڑا مزہ آتا ہے، اس کے کھانے میں کیا حرج ہے؟ اس میں کیا عقلی خرابی ہے؟۔ اسی طرح ہم اور آپ کہتے ہیں کہ شراب پینا حرام ہے، شراب بری چیز ہے، لیکن جو شخص وحی الٰہی پر ایمان نہیں رکھتا، وہ یہ کہے گا کہ شراب پینے میں کیا قباحت ہے، کیا بُرائی ہے، ہمیں تو اس میں کوئی بُرائی نظر نہیں آتی، لاکھوں افراد شراب پی رہے ہیں، ان کو اس کے پینے سے کوئی خاص نقصان نہیں ہو رہا ہے، اور ہماری عقل میں تو اس کے بارے میں کوئی خرابی سمجھ میں نہیں آتی۔ حتیٰ کہ بعض لوگوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ مرد و عورت کے درمیان بدکاری میں کیا حرج ہے؟ اگر ایک مرد اور ایک عورت اس کام پر رضامند ہیں تو اس کام میں عقلی خرابی کیا ہے؟ اور عقلی اعتبار سے ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ بُرا کام ہے؟ اور اگر رضامندی کے ساتھ مرد و عورت نے یہ کام کر لیا تو تیسرے آدمی کو کیا اختیار ہے کہ اسکے اندر رکاوٹ ڈالے؟۔ دیکھئے! اسی عقل کے بل بوتے پر بد سے بدتر بُرائی کو جائز اور صحیح قرار دیا گیا، اس لئے کہ جب عقل کو اس کے دائرہ کار سے آگے بڑھایا تو یہ عقل اپنا جواب غلط دینے لگی۔ لہٰذا جب انسان عقل کو اس جگہ پر استعمال کرے گا جہاں پر اللہ تعالیٰ کی وحی آچکی ہے تو وہاں پر عقل غلط جواب دینے لگے گی

اور غلط راستے پر لے جائے گی۔

اشتراکیت کی بنیاد عقل پر تھی

دیکھئے روس کے اندر چوہتر (۷۴) سال تک اس عقل کی بنیاد پر اشتراکیت، سوشلزم اور کمیونزم کا بازار گرم رہا، اور پوری دنیا میں مساوات اور غریبوں کی ہمدردی کے نام پر شور مچایا گیا، کمیونزم اور اشتراکیت کا پوری دنیا میں ڈنکا بجتا رہا، اور یہ کہہ دیا کہ عنقریب ساری دنیا پر اس کی حکومت قائم ہو جائے گی، اور یہ سب کچھ عقل کی بنیاد پر تھا۔ اگر اس وقت کوئی اٹھ کر اس کے خلاف کوئی آواز نکالتا کہ یہ نظریہ غلط ہے، تو اس کو سرمایہ داروں کا ایجنٹ کہا جاتا، جاگیرداروں کا ایجنٹ کہا جاتا، اس کو رجعت پسند کہا جاتا تھا۔ لیکن آج چوہتر سال کے بعد ساری دنیا اس کا تماشہ دیکھ رہی ہے، لینن جس کی پوجا کی جارہی تھی، اس کے بت خود اس کے ماننے والے گرا کر توڑ رہے ہیں۔ جو نظریہ وحی الٰہی سے آزاد ہو کر صرف عقل کی بنیاد پر قائم کیا جاتا ہے، اس کا یہی انجام ہوتا ہے۔

وحی الٰہی کے آگے سر جھکالو

اس لئے اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ اگر زندگی ٹھیک گزارنی ہے تو اس کا راستہ صرف یہ ہے کہ جہاں اللہ کا اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم آجائے اور وحی الٰہی کا پیغام آجائے وہاں انسان اپنے آپ کو اس کے تابع بنالے، اس کے آگے جھک جائے، اور اس کے خلاف عقل کے گھوڑے نہ دوڑائے، چاہے بظاہر وہ عقل کے خلاف اور اپنی خواہشات کے خلاف اور مصلحت کے خلاف نظر آتا ہو۔ بس اللہ تعالیٰ کا حکم آجانے کے بعد اپنا سر اس کے آگے جھکادے۔ یہ ہے اسلام میں داخل ہونے کا مطلب۔ لہٰذا جو آیت میں نے تلاوت کی، اس کے پہلے جملے کا مطلب یہ ہوا کہ اے ایمان والو! اسلام میں داخل ہو جاؤ، یعنی اپنے آپ کو

اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مکمل تابع کردو۔

پورے داخل ہونے کا مطلب

اس آیت کے دوسرے جملے میں ارشاد فرمایا کہ "پورے کے پورے داخل ہوجاؤ" یعنی یہ نہ ہو کہ ایمان اور عقیدے اور عبادات کی حد تک تو اسلام میں داخل ہوگئے کہ کلمہ طیبہ پڑھ لیا، نماز پڑھ لی، روزہ رکھ لیا، زکوۃ دے دی، حج کرلیا، عبادتیں انجام دے دیں، اور جب مسجد میں پہنچے تو مسلمان، لیکن جب بازار پہنچے، جب دفتر پہنچے، یا گھر پہنچے تو وہاں مسلمان نہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "اسلام" محض عبادتوں کا نام نہیں کہ صرف عبادتیں انجام دے دیں تو مسلمان ہوگیا، بلکہ اپنی پوری زندگی کو اللہ کے حکم کے تابع بنانے کا نام "اسلام" ہے۔ لہٰذا مسلمان وہ ہے جو بازار میں بھی مسلمان ہو، دفتر میں بھی مسلمان ہو، گھر میں بیوی بچوں کے ساتھ بھی مسلمان ہو، دوست واحباب کے ساتھ بھی مسلمان ہو۔

اسلام کے پانچ حصے

اس "دین اسلام" کے اللہ تعالیٰ نے پانچ حصے بنائے ہیں، ان پانچ حصوں پر دین مشتمل ہے:

① **عقائد:** یعنی عقیدہ درست ہونا چاہئے۔

② **عبادات:** یعنی نماز، روزہ، حج، زکوۃ کی پابندی ہونی چاہئے۔

③ **معاملات:** یعنی خرید و فروخت کے معاملات اور بیع و شراء کے معاملات اللہ کے حکم کے مطابق ہوں، ناجائز اور حرام طریقے سے پیسے نہ کمائے۔

④ **معاشرت:** یعنی باہمی میل جول اور ایک دوسرے کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے

اور زندگی گزارنے اور رہن سہن کے طریقے میں اللہ تعالیٰ نے جو احکام دیے ہیں ان احکام کو انسان پورا کرے۔

⑤ **اخلاق:** یعنی اس کے باطنی اخلاق، جذبات اور خیالات درست ہوں۔
آج ہم مسجد میں مسلمان ہیں، لیکن جب بازار پہنچے تو لوگوں کو دھوکہ دے رہے ہیں، امانت میں خیانت کر رہے ہیں، دوسروں کو تکلیف پہنچا رہے ہیں، ان کی دل آزاری کر رہے ہیں۔ یہ تو اسلام میں پورا داخل ہونا نہ ہوا، اس لئے کہ اسلام کا ایک چوتھائی حصّہ عبادات ہیں اور تین چوتھائی حصّہ حقوق العباد سے متعلق ہے۔ لہٰذا جب تک انسان بندوں کے حقوق کا لحاظ نہیں رکھے گا، پورا اسلام میں داخل نہ ہوگا۔

ایک سبق آموز واقعہ

ایک مرتبہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سفر پر تھے، زاد راہ جو ساتھ تھا وہ ختم ہوگیا، آپ نے دیکھا کہ جنگل میں بکریوں کا گلہ چر رہا ہے، اور اہل عرب کے اندر یہ رواج تھا کہ لوگ مسافروں کو راستے میں مہمان نوازی کے طور پر مفت دودھ پیش کردیا کرتے تھے۔ چنانچہ آپ چرواہے کے پاس گئے اور اس سے جاکر فرمایا کہ میں مسافر ہوں اور کھانے پینے کا سامان ختم ہوگیا ہے، تم ایک بکری کا دودھ نکال کر مجھے دے دیدو تاکہ میں پی لوں۔ چرواہے نے کہا کہ آپ مسافر ہیں، میں آپ کو دودھ ضرور دے دیتا لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ بکریاں میری نہیں ہیں، ان کا مالک دوسرا شخص ہے، اور ان کے چرانے کی خدمت میرے سپرد ہے۔ اس لئے یہ بکریاں میرے پاس امانت ہیں، اور ان کا دودھ بھی امانت ہے، لہٰذا شرعی اعتبار سے میرے لئے ان کا دودھ آپ کو دینا جائز نہیں ہے۔
اس کے بعد حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کا امتحان لینا چاہا اور

اس سے فرمایا کہ دیکھو بھائی! میں تمہیں ایک فائدے کی بات بتاتا ہوں، جس میں تمہارا بھی فائدہ ہے اور میرا بھی فائدہ ہے، وہ یہ کہ تم ایسا کرو کہ ان میں سے ایک بکری مجھے فروخت کردو اور اس کی قیمت مجھ سے لے لو، اس میں تمہارا فائدہ یہ ہے کہ تمہیں پیسے مل جائیں گے، اور میرا فائدہ یہ ہوگا کہ مجھے بکری مل جائے گی، راستے میں اس کا دودھ استعمال کرتا رہوں گا۔ رہا مالک! تو مالک سے کہہ دینا کہ ایک بکری بھیڑیا کھا گیا، اور اس کو تمہاری بات پر یقین بھی آجائے گا، کیونکہ جنگل میں بھیڑیے بکریاں کھاتے رہتے ہیں، اس طرح ہم دونوں کا کام بن جائے گا۔ جب چرواہے نے یہ تدبیر سنی تو فوراً اس نے جواب میں کہا: یا هذا! فاین الله؟ اے بھائی! اگر میں یہ کام کرلوں تو اللہ کہاں گیا؟ یعنی یہ کام میں یہاں تو کرلوں گا، اور مالک کو بھی جواب دیدوں گا، وہ بھی شاید مطمئن ہوجائے گا، لیکن مالک کا بھی ایک اور مالک ہے، اس کے پاس جاکر کیا جواب دوں گا؟ اس لئے میں یہ کام کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ظاہر ہے کہ فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کا امتحان لینا چاہتے تھے، جب اس چرواہے کا جواب سنا تو آپ نے فرمایا کہ جب تک تجھ جیسے انسان اس روئے زمین پر موجود ہیں، اس وقت تک کوئی ظالم دوسرے شخص پر ظلم کرنے پر آمادہ نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ جب تک دل میں اللہ کا خوف، آخرت کی فکر، اللہ کے سامنے کھڑے ہونے کا احساس موجود رہے گا، اس وقت تک جرائم اور مظالم چل نہیں سکیں گے۔ یہ ہے اسلام میں پورا کا پورا داخل ہونا۔ جنگل کی تنہائی میں بھی اس کو یہ فکر ہے کہ میرا کوئی کام اللہ کی مرضی کے خلاف نہ ہو۔

یہ دین کا لازمی حصہ ہے جس کے بغیر مسلمان مسلمان نہیں ہوسکتا۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لا ایمان لمن لا امانة له" جس کے دل میں امانت نہیں اس کا ایمان نہیں۔

ایک چرواہے کا عجیب واقعہ

غزوہ خیبر کے موقع پر ایک چرواہا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا، وہ یہودیوں کی بکریاں چرایا کرتا تھا، اس چرواہے نے جب دیکھا کہ خیبر سے باہر مسلمانوں کا لشکر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے تو اس کے دل میں خیال آیا کہ میں جاکر ان سے ملاقات کروں اور دیکھوں کہ یہ مسلمان کیا کہتے ہیں اور کیا کرتے ہیں؟ چنانچہ بکریاں چراتا ہوا مسلمانوں کے لشکر میں پہنچا اور ان سے پوچھا کہ تمہارے سردار کہاں ہیں؟ صحابہ کرام نے اس کو بتایا کہ ہمارے سردار محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس خیمے کے اندر ہیں۔ پہلے تو اس چرواہے کو ان کی باتوں پر یقین نہیں آیا، اس نے سوچا کہ اتنے بڑے سردار ایک معمولی سے خیمے میں کیسے بیٹھ سکتے ہیں۔ اس کے ذہن میں یہ تھا کہ جب آپ اتنے بڑے بادشاہ ہیں تو بہت ہی شان و شوکت اور ٹھاٹ باٹ کے ساتھ رہتے ہوں گے، لیکن وہاں تو کھجور کے پتوں کی چٹائی سے بنا ہوا خیمہ تھا۔ خیر وہ اس خیمے کے اندر آپ سے ملاقات کے لئے داخل ہو گیا اور آپ سے ملاقات کی۔ اور پوچھا کہ آپ کیا پیغام لے کر آئے ہیں؟ اور کس بات کی دعوت دیتے ہیں؟ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے سامنے اسلام اور ایمان کی دعوت رکھی اور اسلام کا پیغام دیا۔ اس نے پوچھا کہ اگر میں اسلام کی دعوت قبول کرلوں تو میرا کیا انجام ہوگا؟ اور کیا رتبہ ہوگا؟ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

> "اسلام لانے کے بعد تم ہمارے بھائی بن جاؤ گے اور ہم تمہیں گلے سے لگائیں گے"۔

اس چرواہے نے کہا کہ آپ مجھ سے مذاق کرتے ہیں، میں کہاں اور آپ کہاں! میں ایک معمولی سا چرواہا ہوں، اور میں ایک سیاہ فام انسان ہوں، میرے بدن سے

بدبو آرہی ہے، ایسی حالت میں آپ مجھے کیسے گلے سے لگائیں گے؟ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

"ہم تمہیں ضرور گلے سے لگائیں گے، اور تمہارے جسم کی سیاہی کو اللہ تعالیٰ تابانی سے بدل دیں گے، اور اللہ تعالیٰ تمہارے جسم سے اٹھنے والی بدبو کو خوشبو سے تبدیل کردیں گے"۔

یہ باتیں سن کر وہ فوراً مسلمان ہوگیا، اور کلمہ شہادت:

﴿اشهد ان لا اله الا الله واشهدان محمدا رسول الله﴾

پڑھ لیا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! اب میں کیا کروں؟ آپ نے فرمایا کہ:

"تم ایسے وقت میں اسلام لائے ہو کہ نہ تو اس وقت کسی نماز کا وقت ہے کہ تم سے نماز پڑھواؤں، اور نہ ہی روزہ کا زمانہ ہے کہ تم سے روزے رکھواؤں، اور زکوٰۃ تم پر فرض نہیں ہے، اس وقت تو صرف ایک ہی عبادت ہورہی ہے جو تلوار کی چھاؤں میں انجام دی جاتی ہے، وہ ہے جہاد فی سبیل اللہ"۔

اس چرواہے نے کہا کہ یا رسول اللہ! میں اس جہاد میں شامل ہوجاتا ہوں، لیکن جو شخص جہاد میں شامل ہوتا ہے، اس کے لئے دو میں ایک صورت ہوتی ہے، یا غازی یا شہید۔ تو اگر میں اس جہاد میں شہید ہوجاؤں تو آپ میری کوئی ضمانت لیجئے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

"میں اس بات کی ضمانت لیتا ہوں کہ اگر تم اس جہاد میں شہید ہوگئے تو اللہ تعالیٰ تمہیں جنت میں پہنچادیں گے، اور تمہارے

جسم کی بدبو کو خوشبو سے تبدیل فرمادیں گے، اور تمہارے چہرے کی سیاہی کو سفیدی میں تبدیل فرمادیں گے"۔

بکریاں واپس کر کے آؤ

چونکہ وہ چرواہا یہودیوں کی بکریاں چراتا ہوا وہاں پہنچا تھا، اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

"تم یہودیوں کی جو بکریاں لے کر آئے ہو، ان کو جاکر واپس کرو، اس لئے کہ یہ بکریاں تمہارے پاس امانت ہیں"۔

اس سے اندازہ لگائیں کہ جن لوگوں کے ساتھ جنگ ہو رہی ہے، جن کا محاصرہ کیا ہوا ہے، ان کا مال مال غنیمت ہے، لیکن چونکہ وہ چرواہا بکریاں معاہدے پر لے کر آیا تھا، اس لئے آپ نے حکم دیا کہ پہلے وہ بکریاں واپس کر کے آؤ، پھر آکر جہاد میں شامل ہونا۔ چنانچہ اس چرواہے نے جاکر بکریاں واپس کیں، اور واپس آکر جہاد میں شامل ہوا، اور شہید ہو گیا ـــــ اس کا نام ہے "اسلام"۔

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ مشہور صحابی ہیں، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے راز دار ہیں۔ جب یہ اور ان کے والد حضرت یمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ مسلمان ہوئے، تو مسلمان ہونے کے بعد حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مدینہ طیبہ آرہے تھے، راستے میں ان کی ملاقات ابوجہل اور اس کے لشکر سے ہو گئی، اس وقت ابوجہل اپنے لشکر کے ساتھ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑنے کے لئے جارہا تھا۔ جب حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ملاقات ابوجہل سے ہوئی تو اس نے پکڑ لیا، اور پوچھا کہ کہاں جارہے ہو؟ انہوں نے بتایا کہ ہم

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مدینہ طیبہ جارہے ہیں۔ ابوجہل نے کہا کہ پھر تو ہم تمہیں نہیں چھوڑیں گے، اس لئے کہ تم مدینہ جاکر ہمارے خلاف جنگ میں حصہ لوگے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارا مقصد تو صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات اور زیارت ہے، ہم جنگ میں حصہ نہیں لیں گے۔ ابوجہل نے کہا کہ اچھا ہم سے وعدہ کرو کہ وہاں جاکر صرف ملاقات کروگے، لیکن جنگ میں حصہ نہیں لوگے۔ انہوں نے وعدہ کرلیا۔ چنانچہ ابوجہل نے آپ کو چھوڑ دیا۔ آپ جب مدینہ منورہ پہنچے، تو اس وقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کرام کے ساتھ غزوۂ بدر کے لئے مدینہ منورہ سے روانہ ہوچکے تھے، لہٰذا ان کی راستے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ہوگئی۔

حق وباطل کا پہلا معرکہ "غزوۂ بدر"

اب اندازہ لگائیے کہ اسلام کا پہلا حق وباطل کا معرکہ (غزوۂ بدر) ہورہا ہے۔ اور یہ وہ معرکہ ہے جس کو قرآن کریم نے "یوم الفرقان" فرمایا، یعنی حق و باطل کے درمیان فیصلہ کردینے والا معرکہ، یہ وہ معرکہ ہو رہا ہے جس میں جو شخص شامل ہوگیا وہ "بدری" کہلایا، اور صحابہ کرام میں "بدری" صحابہ کا بہت اونچا مقام ہے۔ اور "اسمائے بدریین" بطور وظیفے کے پڑھے جاتے ہیں۔ ان کے نام پڑھنے سے اللہ تعالیٰ دعائیں قبول فرماتے ہیں۔ وہ "بدریین" ہیں جن کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پیشن گوئی فرمادی کہ اللہ تعالیٰ نے سارے اہل بدر جنہوں نے بدر کی لڑائی میں حصہ لیا، بخشش فرمادی ہے، ایسا معرکہ ہونے والا ہے۔

گردن پر تلوار رکھ کر لیا جانے والا وعدہ

بہرحال، جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ہوئی تو حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سارا قصہ سنادیا کہ اس طرح راستے میں ہمیں ابوجہل نے پکڑ

لیا تھا، اور ہم نے یہ وعدہ کر کے بمشکل جان چھڑائی کہ ہم لڑائی میں حصّہ نہیں لیں گے۔ اور پھر درخواست کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! یہ بدر کا معرکہ ہونے والا ہے، آپ اس میں تشریف لے جارہے ہیں، ہماری بڑی خواہش ہے کہ ہم بھی اس میں شریک ہوجائیں، اور جہاں تک اس وعدہ کا تعلق ہے، وہ تو انہوں نے ہماری گردن پر تلوار رکھ کر ہم سے یہ وعدہ لیا تھا کہ ہم جنگ میں حصّہ نہیں لیں گے، اگر ہم وعدہ نہ کرتے تو وہ ہمیں نہ چھوڑتے، اس لئے ہم نے وعدہ کرلیا، لہٰذا آپ ہمیں اجازت دے دیں کہ ہم اس جنگ میں حصّہ لے لیں، اور فضیلت اور سعادت ہمیں حاصل ہوجائے۔ (الاصابہ جلد ا صفحہ ۳۲۶)

تم وعدہ کر کے زبان دے کر آئے ہو

لیکن سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا کہ نہیں، تم وعدہ کر کے آئے ہو اور زبان دے کر آئے ہو، اور اسی شرط پر تمہیں رہا کیا گیا ہے کہ تم وہاں جاکر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کرو گے، لیکن ان کے ساتھ جنگ میں حصّہ نہیں لو گے، اس لئے میں تم کو جنگ میں حصّہ لینے کی اجازت نہیں دیتا۔

یہ وہ مواقع ہیں جہاں انسان کا امتحان ہوتا ہے کہ وہ اپنی زبان اور اپنے وعدے کا کتنا پاس کرتا ہے۔ اگر ہم جیسا آدمی ہوتا تو ہزار تاویلیں کرلیتا، مثلاً یہ تاویل کرلیتا کہ ان کے ساتھ جو وعدہ کیا تھا، وہ سچے دل سے تو نہیں کیا تھا، وہ تو ہم سے زبردستی لیا گیا تھا۔ اور خدا جانے کیا کیا تاویلیں ہمارے ذہنوں میں آجاتیں۔ یا یہ تاویل کرلیتا کہ یہ حالت عذر ہے اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد میں شامل ہونا ہے اور کفر کا مقابلہ کرنا ہے۔ جب کہ وہاں ایک ایک آدمی کی بڑی قیمت ہے، کیونکہ مسلمانوں کے لشکر میں صرف ۳۱۳ نہتے افراد ہیں، جن کے پاس صرف ۷۰ اونٹ، ۲ گھوڑے اور ۸ تلواریں ہیں۔ باقی افراد میں سے کسی نے

لاٹھی اٹھالی ہے، کسی نے ڈنڈے، اور کسی نے پتھر اٹھا لئے ہیں۔ یہ لشکر ایک ہزار مسلح سورماؤں کا مقابلہ کرنے کے لئے جارہا ہے، اس لئے ایک ایک آدمی کی جان قیمتی ہے ـــ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو بات کہہ دی گئی ہے، اور جو وعدہ کر لیا گیا ہے، اس وعدہ کی خلاف ورزی نہیں ہوگی۔ اس کا نام ہے "اسلام"۔

جہاد کا مقصد حق کی سربلندی

اس لئے کہ یہ جہاد کوئی ملک حاصل کرنے کے لئے نہیں ہو رہا تھا، کوئی اقتدار حاصل کرنے کے لئے نہیں ہو رہا تھا، بلکہ یہ جہاد حق کی سربلندی کے لئے ہو رہا تھا۔ اور حق کو پامال کر کے جہاد کیا جائے؟ گناہ کا ارتکاب کر کے اللہ تعالیٰ کے دین کا کام کیا جائے؟ یہ نہیں ہو سکتا۔ آج ہم لوگوں کی یہ ساری کوششیں بیکار جارہی ہیں، اور ساری کوششیں بے اثر ہو رہی ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ گناہ کر کے اسلام کی تبلیغ کریں، گناہ کر کے اسلام کو نافذ کریں، ہمارے دل و دماغ پر ہر وقت ہزاروں تاویلیں مسلط رہتی ہیں، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اس وقت مصلحت کا یہ تقاضہ ہے، چلو، شریعت کے اس حکم کو نظر انداز کر دو۔ اور یہ کہا جاتا ہے کہ اس وقت مصلحت اس کام کے کرنے میں ہے، چلو، یہ کام کر لو۔

یہ ہے وعدہ کا ایفاء

لیکن وہاں تو ایک ہی مقصود تھا، یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہونا، نہ مال مقصود ہے، نہ فتح مقصود ہے، نہ بہادر کہلانا مقصود ہے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ راضی ہو جائے، اور اللہ تعالیٰ کی رضا اس میں ہے کہ جو وعدہ کر لیا گیا ہے، اس کو نبھاؤ۔ چنانچہ حضرت حذیفہ اور ان کے والد حضرت یمان رضی اللہ تعالیٰ عنہما دونوں کو غزوۂ بدر جیسی فضیلت سے محروم رکھا گیا، اس لئے کہ یہ دونوں جنگ میں

شرکت نہ کرنے پر زبان دے کر آئے تھے۔ یہ ہے "اسلام" جس کے بارے میں فرمایا کہ اس اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔

حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان صحابہ کرام میں سے ہیں جن کے بارے میں لوگوں نے معلوم نہیں کیا کیا غلط قسم کے پروپیگنڈے کئے ہیں، اللہ تعالیٰ بچائے ـــــ آمین ـــــ لوگ ان کی شان میں گستاخیاں کرتے ہیں۔ ان کا ایک قصہ سن لیجئے۔

فتح حاصل کرنے کے لئے جنگی تدبیر

حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ چونکہ شام میں تھے، اس لئے روم کی حکومت سے ان کی ہر وقت جنگ رہتی تھی، ان کے ساتھ بر سرپیکار رہتے تھے۔ اور روم اس وقت کی سپر پاور سمجھی جاتی تھی، اور بڑی عظیم الشان عالمی طاقت تھی۔ ایک مرتبہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کے ساتھ جنگ بندی کا معاہدہ کر لیا، اور ایک تاریخ متعین کر لی کہ اس تاریخ تک ہم ایک دوسرے سے جنگ نہیں کریں گے، ابھی جنگ بندی کے معاہدے کی مدت ختم نہیں ہوئی تھی، اس وقت حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دل میں خیال آیا کہ جنگ بندی کی مدت تو درست ہے لیکن اس مدت کے اندر میں اپنی فوجیں رومیوں کی سرحد پر لیجا کر ڈال دوں، تاکہ جس وقت جنگ بندی کی مدت ختم ہو، اس وقت میں فوراً حملہ کر دوں، اس لئے کہ دشمن کے ذہن میں تو یہ ہوگا کہ جب جنگ بندی کی مدت ختم ہوگی، پھر کہیں جاکر لشکر روانہ ہوگا، اور یہاں آنے میں وقت لگے گا، اس لئے معاہدہ کی مدت ختم ہوتے ہی فوراً مسلمانوں کا لشکر حملہ آور نہیں ہوگا، لہٰذا وہ اس حملے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔ اس لئے اگر میں اپنا لشکر سرحد پر ڈال دوں اور مدت ختم ہوتے ہی

فوراً حملہ کردوں تو جلدی فتح حاصل ہو جائے گی۔

یہ معاہدے کی خلاف ورزی ہے

چنانچہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی فوجیں سرحد پر ڈال دیں، اور فوج کا کچھ حصہ سرحد کے اندر ان کے علاقے میں ڈال دیا، اور حملہ کے لئے تیار ہو گئے۔ اور جیسے ہی جنگ بندی کے معاہدے کی آخری تاریخ کا سورج غروب ہوا، فوراً حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے لشکر کو پیش قدمی کا حکم دے دیا، چنانچہ جب لشکر نے پیش قدمی کی تو یہ چال بڑی کامیاب ثابت ہوئی، اس لئے کہ وہ لوگ اس حملے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اور حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا لشکر شہر کے شہر، بستیاں کی بستیاں فتح کرتا ہوا چلا جارہا تھا، اب فتح کے نشے کے اندر پورا لشکر آگے بڑھتا جارہا تھا کہ اچانک دیکھا کہ پیچھے سے ایک گھوڑا سوار دوڑتا چلا آرہا ہے، اس کو دیکھ کر حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کے انتظار میں رک گئے کہ شاید یہ امیر المؤمنین کا کوئی نیا پیغام لے کر آیا ہو، جب وہ گھوڑا سوار قریب آیا تو اس نے آوازیں دینا شروع کردیں:

﴿ اللّٰه اکبر، اللّٰه اکبر، قفوا عباد اللّٰه قفوا عباد اللّٰه ﴾

اللہ کے بندو ٹھہر جاؤ، اللہ کے بندو ٹھہر جاؤ، جب وہ اور قریب آیا تو حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دیکھا کہ وہ حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ:

﴿ وفاء لا غدر، وفاء لا غدر ﴾

مؤمن کا شیوہ وفاداری ہے، غداری نہیں ہے، عہد شکنی نہیں ہے۔ حضرت

معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ میں نے تو کوئی عہد شکنی نہیں کی ہے، میں نے تو اس وقت حملہ کیا ہے جب جنگ بندی کی مدت ختم ہو گئی تھی۔ حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اگرچہ جنگ بندی کی مدت ختم ہو گئی تھی، لیکن آپ نے اپنی فوجیں جنگ بندی کی مدت کے دوران ہی سرحد پر ڈال دی تھیں، اور فوج کا کچھ حصہ سرحد کے اندر بھی داخل کر دیا تھا، اور یہ جنگ بندی کے معاہدے کی خلاف ورزی تھی۔ اور میں نے اپنے ان کانوں سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ:

﴿من كان بينه وبين قوم عهد فلا يحلنه ولا يشدنه الى ان يمضى اجل له او ينبذ اليهم على سواء﴾

(ترمذی، ابواب السیر، باب فی الغدر، حدیث نمبر ۱۵۸۰)

یعنی جب تمہارا کسی قوم کے ساتھ معاہدہ ہو، تو اس وقت تک عہد نہ کھولے اور نہ باندھے جب تک کہ اس کی مدت نہ گزر جائے، یا ان کے سامنے پہلے کھلم کھلا یہ اعلان نہ کر دے کہ ہم نے وہ عہد ختم کر دیا۔ لہٰذا مدت گزرنے سے پہلے یا عہد کے ختم کرنے کا اعلان کئے بغیر ان کے علاقے کے پاس لے جا کر فوجوں کو ڈال دینا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے مطابق آپ کے لئے جائز نہیں تھا۔

سارا مفتوحہ علاقہ واپس کر دیا

اب آپ اندازہ لگایئے کہ ایک فاتح لشکر ہے، جو دشمن کا علاقہ فتح کرتا ہوا جا رہا ہے، بہت بڑا علاقہ فتح کر چکا ہے، اور فتح کے نشے میں چور ہے۔ لیکن جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کان میں پڑا کہ اپنے عہد کی پابندی مسلمان کے ذمے لازم ہے۔ اسی وقت حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حکم دے دیا کہ جتنا علاقہ فتح کیا ہے، وہ سب واپس کر دو، چنانچہ پورا علاقہ واپس کر دیا اور اپنی سرحد میں

دوبارہ واپس آ گئے ــــ پوری دنیا کی تاریخ میں کوئی قوم اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتی کہ اس نے صرف عہد شکنی کی بناء پر اپنا مفتوحہ علاقہ اس طرح واپس کر دیا ہو۔ لیکن یہاں پر چونکہ کوئی زمین کا حصہ پیش نظر نہیں تھا، کوئی اقتدار اور سلطنت مقصود نہیں تھی، بلکہ مقصود اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا تھا، اس لئے جب اللہ تعالیٰ کا حکم معلوم ہو گیا کہ وعدہ کی خلاف ورزی درست نہیں ہے، اور چونکہ یہاں وعدہ کی خلاف ورزی کا تھوڑا سا شائبہ پیدا ہو رہا تھا، اس لئے واپس لوٹ گئے ــــ یہ ہے "اسلام" جس کے بارے میں حکم دیا گیا کہ "ادخلوا فی السلم کافۃ" کہ پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ۔

حضرت فاروق اعظمؓ اور معاہدہ

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب بیت المقدس فتح کیا تو اس وقت وہاں پر جو عیسائی اور یہودی تھے، ان سے یہ معاہدہ ہوا کہ ہم تمہاری حفاظت کریں گے، تمہارے جان و مال کی حفاظت کریں گے، اور اس کے معاوضے میں تم ہمیں جزیہ ادا کرو گے ــــ "جزیہ" ایک ٹیکس ہوتا ہے جو غیر مسلموں سے وصول کیا جاتا ہے ــــ چنانچہ جب معاہدہ ہو گیا تو وہ لوگ ہر سال جزیہ ادا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ مسلمانوں کا دوسرے دشمنوں کے ساتھ معرکہ پیش آ گیا، جس کے نتیجے میں وہ فوج جو بیت المقدس میں متعین تھی ان کی ضرورت پیش آئی۔ کسی نے یہ مشورہ دیا کہ اگر فوج کی کمی ہے تو بیت المقدس میں فوجیں بہت زیادہ ہیں، اس لئے وہاں سے ان کو محاذ پر بھیج دیا جائے۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ یہ مشورہ اور تجویز بہت اچھی ہے، لہٰذا فوجیں وہاں سے اٹھا کر محاذ پر بھیج دو، لیکن اس کے ساتھ ایک کام اور بھی کرو، وہ یہ کہ بیت المقدس کے جتنے عیسائی اور یہودی ہیں، ان سب کو ایک جگہ جمع کرو، اور ان سے کہو کہ ہم نے آپ کی جان و مال کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا، اور یہ معاہدہ کیا تھا کہ آپ کے جان و مال کی

حفاظت کریں گے، اور اس کام کے لئے ہم نے وہاں فوج ڈالی ہوئی تھی، لیکن اب ہمیں دوسری جگہ فوج کی ضرورت پیش آگئی ہے، اس لئے ہم آپ کی حفاظت نہیں کر سکتے، لہٰذا اس سال آپ نے ہمیں جو جزیہ بطور ٹیکس ادا کیا ہے، وہ ہم آپ کو واپس کر رہے ہیں، اور اس کے بعد ہم اپنی فوجوں کو یہاں سے لے جائیں گے۔ اور اب آپ لوگ اپنی حفاظت کا انتظام خود کریں۔

یہ ہے "اسلام" یہ نہیں کہ صرف نماز پڑھ لی اور روزہ رکھ لیا اور بس مسلمان ہوگئے، بلکہ جب تک اپنا پورا وجود، اپنی زبان، اپنی آنکھ، اپنے کان، اپنی زندگی کا طرز عمل پورا کا پورا اللہ کی مرضی کے مطابق نہیں ہوگا اس وقت تک کامل مسلمان نہیں ہوں گے۔

دوسروں کو تکلیف پہنچانا اسلام کے خلاف ہے

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرما دیا کہ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں، اور دوسرے مسلمان کو تکلیف پہنچانا گناہ کبیرہ ہے اور حرام ہے، اور یہ ایسا ہی بڑا گناہ ہے جیسے شراب پینا گناہ ہے۔ جیسے بدکاری کرنا گناہ ہے۔ جیسے سور کھانا گناہ ہے۔ اور تکلیف پہنچانے کے جتنے راستے ہیں، وہ سب گناہ کبیرہ ہیں۔ مسلمان کا فرض یہ ہے کہ اپنی ذات سے کسی دوسرے کو تکلیف نہ پہنچائے۔ مثلاً آپ گاڑی لے کر جارہے ہیں اور کسی جگہ جاکر گاڑی کھڑی کرنے کی ضرورت پیش آئی تو آپ نے ایسی جگہ جاکر گاڑی کھڑی کردی جو جگہ دوسرے لوگوں کے لئے گزرنے کی جگہ تھی، آپ کے گاڑی کھڑی کرنے کی وجہ سے دوسرے لوگوں کو گزرنا مشکل ہوگیا، اب آپ تو یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم نے زیادہ سے زیادہ ٹریفک کے قانون کی خلاف ورزی کی ہے، آپ اس کو دین کی خلاف ورزی اور گناہ نہیں سمجھتے، حالانکہ یہ صرف بد اخلاقی کی بات نہیں، بلکہ گناہ کبیرہ ہے۔ یہ ایسا ہی گناہ ہے جیسے شراب پینا گناہ ہے، اس لئے کہ حضور اقدس صلی اللہ

علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے یعنی اس کے پورے وجود سے دوسرے انسان محفوظ رہیں، ان کو تکلیف نہ پہنچے۔ آپ نے اپنی گاڑی غلط جگہ پارک کر کے دوسروں کو تکلیف پہنچائی۔ آج ہم نے دین اسلام کو عبادت کی حد تک اور نماز روزے کی حد تک اور مسجد کی حد تک، اور وظائف اور تسبیحات کی حد تک محدود کرلیا ہے، اور بندوں کے جو حقوق اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں ان کو ہم نے دین سے بالکل خارج کردیا۔

حقیقی مفلس کون؟

حدیث شریف میں ہے کہ ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے پوچھا کہ بتاؤ مفلس کون ہے؟ صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہم لوگ تو اس شخص کو مفلس سمجھتے ہیں جس کے پاس روپیہ پیسہ نہ ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حقیقی مفلس وہ نہیں جس کے پاس روپیہ پیسہ نہ ہو، بلکہ حقیقی مفلس وہ ہے جو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے جب حاضر ہوگا تو اس طرح حاضر ہوگا کہ اس کے اعمال نامے میں بہت سارے روزے ہوں گے، بہت سی نمازیں اور وظیفے ہوں گے، تسبیحات اور نوافل کا ڈھیر ہوگا، لیکن دوسری طرف کسی کا مال کھایا ہوگا، کسی کو دھوکہ دیا ہوگا، کسی کی دل آزاری کی ہوگی، کسی کو تکلیف پہنچائی ہوگی، اور اس طرح اس نے بہت سے انسانوں کے حقوق غصب کئے ہوں گے ـــــ اب اصحاب حقوق اللہ تعالیٰ سے فریاد کریں گے کہ یا اللہ! اس شخص نے ہمارا حق غصب کیا تھا، اس سے ہمارا حق دلوائیے۔ اب وہاں پر روپے پیسے تو چلیں گے نہیں کہ ان کو دے کر حساب کتاب برابر کرلیا جائے، وہاں کی کرنسی تو نیکیاں ہیں، چنانچہ صاحب حقوق کو اس کی نیکیاں دینی شروع کی جائیں گی، کسی کو نماز دیدی جائے گی، کسی کو روزے دیدیئے جائیں گے، اس طرح ایک ایک صاحب حق اس کی نیکیاں لے کر چلتے جائیں گے یہاں تک

کہ اس کی ساری نیکیاں ختم ہوجائیں گی اور یہ شخص خالی ہاتھ رہ جائے گا، نماز روزے کے جتنے ڈھیر لایا تھا، وہ سب ختم ہوجائیں گے، لیکن حق والے اب بھی باقی رہ جائیں گے۔ تو اب اللہ تعالیٰ حکم فرمائیں گے کہ اب حق دلوانے کا طریقہ یہ ہے کہ صاحب حق کے اعمال میں جو گناہ ہیں وہ اس شخص کے نامۂ اعمال میں ڈال دیئے جائیں۔ چنانچہ وہ شخص نیکیوں کا انبار لے کر آیا تھا، لیکن بعد میں نیکیاں تو ساری ختم ہوجائیں گی، اور دوسرے لوگوں کے گناہوں کے انبار لے کر واپس جائے گا، یہ شخص حقیقی مفلس ہے۔

آج ہم پورے اسلام میں داخل نہیں

اس سے اندازہ لگائیں کہ حقوق العباد کا معاملہ کتنا سنگین ہے، لیکن ہم لوگوں نے اس کو دین سے بالکل خارج کردیا ہے، قرآن کریم تو کہہ رہا ہے کہ اے ایمان والو! اسلام میں داخل ہوجاؤ، آدھے نہیں، بلکہ پورے کے پورے داخل ہوجاؤ۔ تمہارا وجود، تمہاری زندگی، تمہاری عبادت، تمہارے معاملات، تمہاری معاشرت، تمہارے اخلاق، ہر چیز اسلام کے اندر داخل ہونی چاہئے، اس کے ذریعہ تم صحیح معنی میں مسلمان بن سکتے ہو۔ یہی وہ چیز تھی جس کے ذریعہ درحقیقت اسلام پھیلا ہے۔ اسلام محض تبلیغ سے نہیں پھیلا، بلکہ انسانوں کی سیرت اور کردار سے پھیلا ہے، مسلمان جہاں بھی گئے انہوں نے اپنی سیرت اور کردار کا لوہا منوایا، اس سے اسلام کی طرف رغبت اور کشش پیدا ہوئی۔ اور آج ہماری سیرت اور کردار دیکھ کر لوگ اسلام سے متنفر ہورہے ہیں۔

پورے داخل ہونے کا عزم کریں

آج ہم لوگ جو دین کی باتیں سننے کے لئے اس محفل میں جمع ہوئے ہیں، اس سے کچھ فائدہ اٹھائیں اور وہ فائدہ یہ ہے کہ ہم یہ عزم کریں کہ اپنی زندگی میں

اسلام کو داخل کریں گے، زندگی کے ہر شعبے میں اسلام کو داخل کریں گے، عبادات بھی، معاملات بھی، معاشرت بھی، اخلاق بھی، ہر چیز اسلام کے مطابق بنانے کی کوشش کریں گے۔

دین کی معلومات حاصل کریں

ایک گزارش آپ حضرات سے یہ کرتا ہوں کہ چوبیس گھنٹوں میں سے کچھ وقت دین کی معلومات حاصل کرنے کے لئے نکال لیں، مستند کتابیں چھپی ہوئی ہیں، ان کو اپنے گھروں کے اندر پڑھنے کا معمول بنائیں، جس کے ذریعہ دینی تعلیمات سے واقفیت ہو۔ آج مصیبت یہ ہے کہ ہم لوگ دین کی تعلیمات سے واقف نہیں۔ اگر ہم یہ فائدہ حاصل کرسکیں اور اس کے ذریعہ ہمارے دلوں میں دین پر چلنے کا جذبہ پیدا ہوجائے تو یہ انشاء اللہ یہ مجلس مفید ہوگی، ورنہ کہنے سننے کی مجلسیں تو بہت ہوتی رہتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے مجھے بھی اور آپ سب کو بھی ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

آپ زکوٰۃ کس طرح ادا کریں؟

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبد اللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

تاریخ خطاب : ۲۸ دسمبر ۱۹۹۷ء

مقام خطاب : عالمگیر مسجد بہادر آباد کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر

اصلاحی خطبات : جلد نمبر ۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آپ زکوٰۃ کس طرح ادا کریں؟

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره و نؤمن به ونتوكل عليه، ونعوذ بالله من شرور انفسنا ومن سيات اعمالنا، من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادى له. ونشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له، ونشهد ان سيدنا وسندنا ومولانا محمدا عبده ورسوله، صلى الله تعالى عليه وعلى اله واصحابه وبارك وسلم تسليما كثيرا كثيرا۔

اما بعد!

فاعوذ بالله من الشيطن الرجيم- بسم الله الرحمن الرحيم
﴿الذين يكنزون الذهب والفضة ولا ينفقونها في سبيل الله فبشرهم بعذاب اليم ○ يوم يحمى عليها في نار جهنم فتكوى بها جباههم وجنوبهم و ظهورهم هذا ما كنزتم لانفسكم فذوقوا ما كنتم تكنزون﴾ (التوبۃ: ۳۴ - ۳۵)

آمنت بالله صدق الله مولانا العظيم وصدق رسوله النبى الكريم ونحن على ذلك من الشاهدين والشاكرين، والحمد لله رب العالمين۔

تمہید

بزرگان محترم اور برادران عزیز! آج کا یہ اجتماع اسلام کے ایک اہم رکن یعنی زکوٰۃ کے موضوع پر منعقد کیا گیا ہے، اور رمضان کے مبارک مہینے سے چند روز پہلے یہ اس لئے رکھا گیا ہے کہ عام طور پر لوگ رمضان المبارک کے مہینے میں زکوٰۃ نکالتے ہیں۔ لہٰذا اس اجتماع کا مقصد یہ ہے کہ زکوٰۃ کی اہمیت، اس کے فضائل اور اس کے ضروری احکام اس اجتماع کے ذریعہ ہمارے علم میں آجائیں تاکہ اس کے مطابق زکوٰۃ نکالنے کا اہتمام کریں۔

زکوٰۃ نہ نکالنے پر وعید

اس مقصد کے لئے میں نے قرآن کریم کی دو آیتیں آپ حضرات کے سامنے تلاوت کی ہیں، ان آیات مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں پر بڑی سخت وعید بیان فرمائی ہے جو اپنے مال کی کماحقہ زکوٰۃ نہیں نکالتے، ان کے لئے بڑے سخت الفاظ میں عذاب کی خبر دی ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ جو لوگ اپنے پاس سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے تو (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم) آپ ان کو ایک دردناک عذاب کی خبر دے دیجئے۔ یعنی جو لوگ اپنا پیسہ، اپنا روپیہ، اپنا سونا چاندی جمع کرتے جارہے ہیں اور ان کو اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے، ان پر اللہ تعالیٰ نے جو فریضہ عائد کیا ہے اس کو ادا نہیں کرتے، ان کو یہ خوشخبری سنا دیجئے کہ ایک دردناک عذاب ان کا انتظار کر رہا ہے۔ پھر دوسری آیت میں اس دردناک عذاب کی تفصیل بیان فرمائی کہ یہ دردناک عذاب اس دن ہوگا جس دن اس سونے اور چاندی کو آگ میں تپایا جائے گا اور پھر اس آدمی کی پیشانی، اس کے پہلو اور اس کی پشت کو داغا جائے گا اور اس کو یہ کہا جائے گا کہ:

﴿هذا ما كنزتم لانفسكم فذوقوا ما كنتم تكنزون﴾

یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا، آج تم خزانے کا مزہ چکھو جو تم اپنے لئے جمع کر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس انجام سے محفوظ رکھے آمین۔

یہ ان لوگوں کا انجام بیان فرمایا جو روپیہ پیسہ جمع کر رہے ہیں لیکن اس پر اللہ تعالیٰ نے جو فرائض عائد کئے ہیں ان کو ٹھیک ٹھیک بجا نہیں لاتے۔ صرف ان آیات میں نہیں بلکہ دوسری آیات میں بھی وعیدیں بیان فرمائی گئی ہیں چنانچہ سورۃ "ہمزہ" میں فرمایا:

﴿ویل لكل همزة لمزة ۝ الذی جمع مالا وعدده ۝ یحسب ان ماله اخلده ۝ كلا لینبذن فی الحطمة ۝ وما ادراك ما الحطمة ۝ نار الله الموقدة ۝ التی تطلع علی الافئدة ۝﴾

(سورۃ ہمزۃ: ۱ تا ۷)

یعنی اس شخص کے لئے دردناک عذاب ہے جو عیب نکالنے والا ہے اور طعنہ دینے والا ہے، جو مال جمع کر رہا ہے اور گن گن کر رکھ رہا ہے (ہر روز گنتا ہے کہ آج میرے مال میں کتنا اضافہ ہوگیا ہے اور اس کی گنتی کر کے خوش ہو رہا ہے) اور یہ سمجھتا ہے کہ یہ مال مجھے ہمیشہ کی زندگی عطا کر دے گا، ہرگز نہیں۔ یاد رکھو! یہ مال جس کو وہ گن گن کر رکھ رہا ہے اور اس پر جو واجبات ہیں ان کو ادا نہیں کر رہا ہے، اس کی وجہ سے) اس کو روندنے والی آگ میں پھینک دیا جائے گا۔ تمہیں کیا پتہ کہ "حطمة" کیا چیز ہوتی ہے؟ (یہ حطمة جس میں اس کو ڈالا جائے گا) یہ ایسی آگ ہے جو اللہ کی سلگائی ہوئی ہے (یہ کسی انسان کی سلگائی ہوئی آگ نہیں ہے جو پانی سے بجھ جائے یا مٹی سے بجھ جائے یا جس کو فائر بریگیڈ بجھا دے بلکہ یہ اللہ کی سلگائی ہوئی آگ ہے) جو انسان کے قلب و جگر تک جھانکتی ہوگی (یعنی انسان کے

قلب وجگر تک پہنچ جائے گی) اتنی شدید وعید اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے، اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس سے محفوظ رکھے آمین۔

یہ مال کہاں سے آرہا ہے

زکوٰۃ ادا نہ کرنے پر ایسی شدید وعید کیوں بیان فرمائی؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو کچھ مال تم اس دنیا میں حاصل کرتے ہو، چاہے تجارت کے ذریعہ حاصل کرتے ہو، چاہے ملازمت کے ذریعہ حاصل کرتے ہو، چاہے کاشت کاری کے ذریعہ حاصل کرتے ہو، یا کسی اور ذریعہ سے حاصل کرتے ہو، ذرا غور کرو کہ وہ مال کہاں سے آرہا ہے؟ کیا تمہارے اندر طاقت تھی کہ تم اپنے زور بازو سے وہ مال جمع کرسکتے؟ یہ تو اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا حکیمانہ نظام ہے، وہ اپنے اس نظام کے ذریعہ تمہیں رزق پہنچا رہا ہے۔

گاہک کون بھیج رہا ہے؟

تم یہ سمجھتے ہو کہ میں نے مال جمع کرلیا اور دکان کھول کر بیٹھ گیا اور اس مال کو فروخت کردیا تو اس کے نتیجے میں مجھے پیسہ مل گیا، یہ نہ دیکھا کہ جب دکان کھول کر بیٹھ گئے تو تمہارے پاس گاہک کس نے بھیجا؟ اگر تم دکان کھول کر بیٹھے ہوتے اور کوئی گاہک نہ آتا تو اس وقت کوئی بکری ہوتی؟ کوئی آمدنی ہوتی؟ یہ کون ہے جو تمہارے پاس گاہک بھیج رہا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے نظام ہی ایسا بنایا ہے کہ ایک دوسرے کی حاجتیں، ایک دوسرے کی ضرورتیں ایک دوسرے کے ذریعہ پوری کی جاتی ہیں۔ ایک شخص کے دل میں ڈال دیا کہ تم جاکر دکان کھول کر بیٹھو اور دوسرے کے دل میں یہ ڈال دیا کہ اس دکان والے سے خریدو۔

ایک سبق آموز واقعہ

میرے ایک بڑے بھائی تھے جناب محمد ذکی کیفی رحمۃ اللہ علیہ، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے آمین، لاہور میں ان کی دینی کتابوں کی ایک دکان "ادارہ اسلامیات" کے نام سے تھی، اب بھی وہ دکان موجود ہے، وہ ایک مرتبہ کہنے لگے کہ تجارت میں اللہ تعالیٰ اپنی رحمت اور قدرت کے عجیب کرشمے دکھلاتا ہے، ایک دن میں صبح بیدار ہوا تو پورے شہر میں موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور بازاروں میں کئی کئی انچ پانی کھڑا تھا، میرے دل میں خیال آیا کہ آج بارش کا دن ہے، لوگ گھر سے نکلتے ہوئے ڈر رہے ہیں، سڑکوں پر پانی کھڑا ہے، ایسے حالات میں کون کتاب خریدنے آئے گا اور کتاب بھی کوئی دنیاوی یا کورس اور نصاب کی نہیں بلکہ دینی کتاب جس کے بارے میں ہمارا حال یہ ہے کہ جب دنیا کی ساری ضرورتیں پوری ہوجائیں تب جاکر یہ خیال آتا ہے کہ چلو کوئی دینی کتاب خرید کر پڑھ لیں، ان کتابوں سے نہ تو بھوک مٹتی ہے نہ پیاس بجھتی ہے نہ اس سے کوئی دنیا کی ضرورت پوری ہوتی ہے، اور آج کل کے حساب سے دینی کتاب ایک فالتو مد ہے، خیال یہ ہوتا ہے کہ فالتو وقت ملے گا تو دینی کتاب پڑھ لیں گے۔ تو ایسی موسلا دھار بارش میں کون دینی کتاب خریدنے آئے گا، لہٰذا آج دکان پر نہ جاؤں اور چھٹی کر لیتا ہوں۔

لیکن چونکہ بزرگوں کے صحبت یافتہ تھے حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت اٹھائی تھی۔ فرمانے لگے کہ اس کے ساتھ ساتھ میرے دل میں دوسرا خیال یہ آیا کہ ٹھیک ہے کوئی شخص کتاب خریدنے آئے یا نہ آئے لیکن اللہ تعالیٰ نے میرے لئے رزق کا یہ ذریعہ مقرر فرمایا ہے، اب میرا کام یہ ہے کہ میں جاؤں، جاکر دکان کھول کر بیٹھ جاؤں، گاہک بھیجنا میرا کام نہیں، کسی اور کا کام ہے، لہٰذا مجھے اپنے کام میں کوتاہی نہ کرنی چاہئے، چاہے بارش ہو رہی ہو یا سیلاب آرہا ہو، مجھے اپنی

دکان کھولنی چاہئے۔ چنانچہ یہ سوچ کر میں نے چھتری اٹھائی اور پانی سے گزرتا ہوا چلا گیا اور بازار جاکر دکان کھول کر بیٹھ گیا اور یہ سوچا کہ آج کوئی گاہک تو آئے گا نہیں، چلو بیٹھ کر تلاوت ہی کرلیں، چنانچہ ابھی میں قرآن شریف کھول کر تلاوت کرنے بیٹھا ہی تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ لوگ برساتیاں ڈال کر اور چھتریاں تان کر کتابیں خریدنے آرہے ہیں، میں حیران تھا کہ ان لوگوں کو ایسی کونسی ضرورت پیش آگئی ہے کہ اس طوفانی بارش میں اور بہتے ہوئے سیلاب میں میرے پاس آکر ایسی کتابیں خرید رہے ہیں جن کی کوئی فوری ضرورت نہیں۔ لیکن لوگ آئے اور جتنی بکری روزانہ ہوتی تھی اس دن بھی اتنی بکری ہوئی۔ اس وقت دل میں یہ بات آئی کہ یہ گاہک خود نہیں آرہے ہیں، حقیقت میں کوئی اور بھیج رہا ہے، اور یہ اس لئے بھیج رہا ہے کہ اس نے میرے لئے رزق کا سامان ان گاہک کو بنایا ہے۔

کاموں کی تقسیم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے

بہرحال، یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ جل شانہ کا بنایا ہوا نظام ہے جو تمہارے پاس گاہک بھیج رہا ہے، جو گاہک کے دل میں ڈال رہا ہے کہ تم اس دکان سے جاکر سامان خریدو۔ کیا کسی شخص نے یہ کانفرنس بلائی تھی اور اس کانفرنس میں یہ طے ہوا تھا کہ اتنے لوگ کپڑا فروخت کریں گے، اتنے لوگ جوتے فروخت کریں گے، اتنے لوگ چاول فروخت کریں گے، اتنے لوگ برتن فروخت کریں گے، اور اس طرح لوگوں کی ضروریات پوری کی جائیں گی۔ دنیا میں ایسی کوئی کانفرنس آج تک نہیں ہوئی بلکہ اللہ تعالیٰ نے کسی کے دل میں یہ ڈالا کہ تم کپڑا فروخت کرو، کسی کے دل میں ڈالا کہ تم جوتے فروخت کرو، کسی کے دل میں ڈالا کہ تم روٹی فروخت کرو، کسی کے دل میں یہ ڈالا کہ تم گوشت فروخت کرو، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا کی کوئی ضرورت ایسی نہیں ہے جو بازار میں نہ ملتی ہو۔ دوسری طرف خریداروں کے دل میں یہ ڈالا کہ تم جاکر ان سے ضروریات خریدو اور ان کے لئے رزق کا سامان فراہم کرو۔ یہ اللہ تعالیٰ

کا بنایا ہوا نظام ہے کہ وہ تمام انسانوں کو اس طرح سے رزق عطا کر رہا ہے۔

زمین سے اُگانے والا کون ہے؟

خواہ تجارت ہو یا زراعت ہو یا ملازمت ہو، دینے والا درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی ہے، زراعت کو دیکھئے! زراعت میں آدمی کا کام یہ ہے کہ زمین کو نرم کر کے اس میں بیج ڈال دے اور اس میں پانی دے دے، لیکن اس بیج کو کونپل بنانا، وہ بیج جو بالکل بے حقیقت ہے جو گنتی میں بھی نہ آئے، جو بے وزن ہے لیکن اتنی سخت زمین کا پیٹ پھاڑ کر نمودار ہوتا ہے اور کونپل بن جاتا ہے، پھر وہ کونپل بھی ایسی نرم اور نازک ہوتی ہے کہ اگر بچہ بھی اس کو انگلی سے مسل دے تو وہ ختم ہو جائے لیکن وہی کونپل سارے موسموں کی سختیاں برداشت کرتی ہے، گرم اور سرد اور تیز ہواؤں کو سہتی ہے، پھر کونپل سے پودا بنتا ہے، پھر اس پودے سے پھول نکلتے ہیں، پھول سے پھل بنتے ہیں اور اس طرح وہ ساری دنیا کے انسانوں تک پہنچ جاتا ہے۔ کون ذات ہے جو یہ کام کر رہی ہے؟ اللہ جل شانہ ہی یہ سارے کام کرنے والے ہیں۔

انسان میں پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں

لہذا آمدنی کا کوئی بھی ذریعہ ہو، چاہے وہ تجارت ہو یا زراعت ہو یا ملازمت ہو، حقیقت میں تو انسان ایک محدود کام کرنے کے لئے دنیا میں بھیجا گیا ہے، بس انسان وہ محدود کام کر دیتا ہے لیکن اس محدود کام کے اندر کسی چیز کو پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ جل شانہ ہیں جو ضرورت کی اشیاء پیدا کرتے ہیں اور تمہیں عطا کرتے ہیں، لہذا جو کچھ بھی تمہارے پاس ہے وہ سب اسی کی عطا ہے:

﴿لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ﴾ (البقرہ: ۲۸۴)

"زمین و آسمان میں جو کچھ ہے وہ اسی کی ملکیت ہے"۔

مالک حقیقی اللہ تعالیٰ ہیں

اور اللہ تعالیٰ نے وہ چیز تمہیں عطا کر کے یہ بھی کہہ دیا کہ چلو تم ہی اس کے مالک ہو۔ چنانچہ سورۃ یٰسین میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿اولم یروا انا خلقنا لھم مما عملت ایدینا انعاما فھم لھا ملکون﴾ (یٰسین: ۷۱)

کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم نے بنا دیے ان کے واسطے اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیزوں سے چوپائے، پھر وہ ان کے مالک ہیں۔ مالک حقیقی تو ہم تھے، ہم نے تمہیں مالک بنایا۔ تو حقیقت میں وہ مال جو تمہارے پاس آیا ہے اس میں سب سے بڑا حق تو ہمارا ہے، جب ہمارا حق ہے تو پھر اس میں سے اللہ کے حکم کے مطابق خرچ کرو، اگر اس کے حکم کے مطابق خرچ کرو گے تو باقی جتنا مال تمہارے پاس ہے وہ تمہارے لئے حلال اور طیب ہے، وہ مال اللہ کا فضل ہے، اللہ کی نعمت ہے، وہ مال برکت والا ہے۔ اور اگر تم نے اس مال میں سے وہ چیز نہ نکالی جو اللہ تعالیٰ نے تم پر فرض کی ہے تو پھر یہ سارا مال تمہارے لئے آگ کے انگارے ہیں اور قیامت کے دن ان انگاروں کو دیکھ لو گے جب ان انگاروں سے تمہارے جسموں کو داغا جائے گا اور تم سے یہ کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ خزانہ جس کو تم جمع کیا کرتے تھے۔

صرف ڈھائی فیصد ادا کرو

اگر اللہ تعالیٰ یہ فرماتے کہ یہ مال ہماری عطا کی ہوئی چیز ہے، لہٰذا اس میں سے ڈھائی فیصد تم رکھو اور ساڑھے ستانوے فیصد اللہ کی راہ میں خرچ کر دو تو بھی انصاف کے خلاف نہیں تھا، کیونکہ یہ سارا مال اسی کا دیا ہوا ہے اور اسی کی ملکیت

ہے۔ لیکن اس نے اپنے بندوں پر فضل فرمایا اور یہ فرمایا کہ میں جانتا ہوں کہ تم کمزور ہو اور تمہیں اس مال کی ضرورت ہے، میں جانتا ہوں کہ تمہاری طبیعت اس مال کی طرف راغب ہے، لہٰذا چلو اس مال میں سے ساڑھے ستانوے فیصد تمہارا، صرف ڈھائی فیصد کا مطالبہ ہے، جب یہ ڈھائی فیصد اللہ کے راستے میں خرچ کرو گے تو باقی ساڑھے ستانوے فیصد تمہارے لئے حلال ہے اور طیب ہے اور برکت والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اتنا معمولی مطالبہ کر کے سارا مال ہمارے حوالے کر دیا کہ اس کو جس طرح چاہو اپنی جائز ضروریات میں خرچ کرو۔

زکوٰۃ کی تاکید

یہ ڈھائی فیصد زکوٰۃ ہے، یہ وہ زکوٰۃ ہے جس کے بارے میں قرآن کریم میں بار بار ارشاد فرمایا:

﴿واقیموا الصلاۃ واتوا الزکاۃ﴾

"نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو"۔

جہاں نماز کا ذکر فرمایا ہے وہاں ساتھ میں زکوٰۃ کا بھی ذکر ہے، اس زکوٰۃ کی اتنی تاکید وارد ہوئی ہے۔ جب اس زکوٰۃ کی اتنی تاکید ہے اور دوسری طرف اللہ جل شانہ نے اتنا بڑا احسان فرمایا ہے کہ ہمیں مال عطا کیا اور اس کا مالک بنایا اور پھر صرف ڈھائی فیصد کا مطالبہ کیا تو مسلمان کم از کم اتنا کر لے کہ وہ ڈھائی فیصد ٹھیک ٹھیک اللہ کے مطالبے کے مطابق ادا کر دے تو اس پر کوئی آسمان نہیں ٹوٹ جائے گا، کوئی قیامت نہیں ٹوٹ پڑے گی۔

زکوٰۃ حساب کر کے نکالو

بہت سے لوگ تو وہ ہیں جو زکوٰۃ سے بالکل بے پرواہ ہیں، العیاذ باللہ وہ تو زکوٰۃ

نکالتے ہی نہیں ہیں۔ ان کی سوچ تو یہ ہے کہ یہ ڈھائی فیصد کیوں دیں؟ بس جو مال آرہا ہے وہ آئے۔ دوسری طرف بعض لوگ وہ ہیں جن کو زکوۃ کا کچھ نہ کچھ احساس ہے اور وہ زکوۃ نکالتے بھی ہیں لیکن زکوۃ نکالنے کا جو صحیح طریقہ ہے وہ طریقہ اختیار نہیں کرتے۔ جب ڈھائی فیصد زکوۃ فرض کی گئی تو اب اس کا تقاضہ یہ ہے کہ ٹھیک ٹھیک حساب لگا کر زکوۃ نکالی جائے۔ بعض لوگ یہ سوچتے ہیں کہ کون حساب کتاب کرے، کون سارے اسٹاک کو چیک کرے، لہٰذا بس ایک اندازہ کر کے زکوۃ نکال دیتے ہیں، اب اس اندازے میں غلطی بھی واقع ہو سکتی ہے اور زکوۃ نکالنے میں کمی بھی ہو سکتی ہے، اگر زکوۃ زیادہ نکال دی جائے انشاء اللہ مواخذہ نہیں ہوگا، لیکن اگر ایک روپیہ بھی کم ہو جائے یعنی جتنی زکوۃ واجب ہوئی ہے اس سے ایک روپیہ کم زکوۃ نکال تو یاد رکھئے! وہ ایک روپیہ جو آپ نے حرام طریقے سے اپنے پاس روک لیا ہے، وہ ایک روپیہ تمہارے سارے مال کو برباد کرنے کے لئے کافی ہے۔

وہ مال تباہی کا سبب ہے

ایک حدیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب مال میں زکوۃ کی رقم شامل ہو جائے یعنی پوری زکوۃ نہیں نکالی بلکہ کچھ زکوۃ نکالی اور کچھ باقی رہ گئی تو وہ مال انسان کے لئے تباہی اور ہلاکت کا سبب ہے۔ اس وجہ سے اس بات کا اہتمام کریں کہ ایک ایک پائی کا صحیح حساب کر کے زکوۃ نکالی جائے، اس کے بغیر زکوۃ کا فریضہ کما حقہ ادا نہیں ہوتا، الحمد للہ مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد وہ ہے جو زکوۃ ضرور نکالتی ہے لیکن اس بات کا اہتمام نہیں کرتی کہ ٹھیک ٹھیک حساب کر کے زکوۃ نکالے، اس کی وجہ سے زکوۃ کی رقم ان کے مال میں شامل رہتی ہے اور اس کے نتیجے میں ہلاکت اور بربادی کا سبب بن جاتی ہے۔

زکوٰۃ کے دنیاوی فوائد

ویسے زکوٰۃ اس نیت سے نکالنی چاہئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، اس کی رضا کا تقاضہ ہے اور ایک عبادت ہے۔ اس زکوٰۃ نکالنے سے ہمیں کوئی منفعت حاصل ہو یا نہ ہو، کوئی فائدہ ملے یا نہ ملے، اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت بذات خود مقصود ہے۔ اصل مقصد تو زکوٰۃ کا یہ ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ جب کوئی بندہ زکوٰۃ نکالتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو فوائد بھی عطا فرماتے ہیں، وہ فائدہ یہ ہے کہ اس کے مال میں برکت ہوتی ہے، چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿یمحق اللّٰہ الربوا ویربی الصدقات﴾

(البقرہ: ۲۷۶)

"یعنی اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتے ہیں اور زکوٰۃ اور صدقات کو بڑھاتے ہیں"۔

ایک حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب کوئی بندہ زکوٰۃ نکالتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے فرشتے اس کے حق میں یہ دعا فرماتے ہیں کہ:

﴿اللھم اعط منفقا خلفا واعط ممسکا تلفا﴾

(بخاری کتاب الزکاۃ باب قول اللہ تعالیٰ: فاما من اعطی واتقی)

اے اللہ! جو شخص اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کر رہا ہے اس کو اور زیادہ عطا فرمایئے، اور اے اللہ جو شخص اپنے مال کو روک کر رکھ رہا ہے اور زکوٰۃ ادا نہیں کر رہا ہے تو اے اللہ اس کے مال پر ہلاکت ڈالئے۔ اس لئے فرمایا:

﴿ما نقصت صدقۃ من مال﴾

"کوئی صدقہ کسی مال میں کمی نہیں کرتا"۔

چنانچہ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ ادھر ایک مسلمان نے زکوٰۃ نکالی دوسری

طرف اللہ تعالیٰ نے اس کی آمدنی کے دوسرے ذرائع پیدا کردیے اور اس کے ذریعہ اس زکوۃ سے زیادہ پیسہ اس کے پاس آگیا۔ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ زکوۃ نکالنے سے اگرچہ گنتی کے اعتبار سے پیسے کم ہوجاتے ہیں لیکن بقیہ مال میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسی برکت ہوتی ہے کہ اس برکت کے نتیجے میں تھوڑے مال سے زیادہ فوائد حاصل ہوجاتے ہیں۔

مال میں بے برکتی کا انجام

آج کی دنیا گنتی کی دنیا ہے۔ برکت کا مفہوم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا۔ برکت اس چیز کو کہتے ہیں کہ تھوڑی سی چیز میں زیادہ فائدہ حاصل ہوجائے مثلاً آج آپ نے پیسے تو بہت کمائے لیکن جب گھر پہنچے تو پتہ چلا کہ بچہ بیمار ہے، اس کو لے کر ڈاکٹر کے پاس گئے اور ایک ہی طبی معائنہ میں وہ سارے پیسے خرچ ہوگئے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو پیسے کمائے تھے اس میں برکت نہ ہوئی۔ یا مثلاً آپ پیسے کما کر گھر جارہے تھے کہ راستہ میں ڈاکو مل گیا اور اس نے پستول دکھا کر سارے پیسے چھین لئے، اس کا مطلب یہ ہے کہ پیسے تو حاصل ہوئے لیکن اس میں برکت نہیں ہوئی یا مثلاً آپ نے پیسہ کما کر کھانا کھایا اور اس کھانے کے نتیجے میں آپ کو بدہضمی ہوگئی، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس مال میں برکت نہ ہوئی۔ یہ سب بے برکتی کی نشانیاں ہیں۔ برکت یہ ہے کہ آپ نے پیسے تو کم کمائے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان تھوڑے پیسوں میں زیادہ کام بنا دیے اور تمہارے بہت سے کام نکل گئے، اس کا نام ہے برکت۔ یہ برکت اللہ تعالیٰ اس کو عطاء فرماتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرتا ہے۔ لہٰذا ہم اپنے مال کی زکوۃ نکالیں اور اس طرح نکالیں جس طرح اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بتایا ہے اور اس کو حساب کتاب کے ساتھ نکالیں۔ صرف اندازہ سے نہ نکالیں۔

زکوٰۃ کا نصاب

اس کی تھوڑی سی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کا ایک نصاب مقرر کیا ہے کہ اس نصاب سے کم اگر کوئی شخص مالک ہے تو اس پر زکوٰۃ فرض نہیں، اگر اس نصاب کا مالک ہو گا تو زکوٰۃ فرض ہوگی۔ وہ نصاب یہ ہے: ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کی قیمت کا نقد روپیہ، یا زیور، یا سامان تجارت وغیرہ، جس شخص کے پاس یہ مال اتنی مقدار میں موجود ہو تو اس کو "صاحب نصاب" کہا جاتا ہے۔

ہر ہر روپے پر سال کا گزرنا ضروری نہیں

پھر اس نصاب پر ایک سال گزرنا چاہئے، یعنی ایک سال تک اگر کوئی شخص صاحب نصاب رہے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ اس بارے میں عام طور پر یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہر ہر روپے پر مستقل پورا سال گزرے، تب اس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، یہ بات درست نہیں۔ بلکہ جب ایک مرتبہ سال کے شروع میں ایک شخص صاحب نصاب بن جائے مثلاً فرض کریں کہ یکم رمضان کو اگر کوئی شخص صاحب نصاب بن گیا پھر آئندہ سال جب یکم رمضان آیا تو اس وقت بھی وہ صاحب نصاب ہے تو ایسے شخص کو صاحب نصاب سمجھا جائے گا، درمیان سال میں جو رقم آتی جاتی رہی اس کا کوئی اعتبار نہیں، بس یکم رمضان کو دیکھ لو کہ تمہارے پاس کتنی رقم موجود ہے اس رقم پر زکوٰۃ نکالی جائے گی، چاہے اس میں سے کچھ رقم صرف ایک دن پہلے ہی کیوں نہ آئی ہو۔

تاریخ زکوٰۃ میں جو رقم ہو اس پر زکوٰۃ ہے

مثلاً فرض کریں کہ ایک شخص کے پاس یکم رمضان کو ایک لاکھ روپیہ تھا، اگلے سال یکم رمضان سے دو دن پہلے پچاس ہزار روپے اس کے پاس اور آگئے اور اس

کے نتیجے میں یکم رمضان کو اس کے پاس ڈیڑھ لاکھ روپے ہو گئے، اب اس ڈیڑھ لاکھ روپے پر زکوٰۃ فرض ہوگی، یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس میں پچاس ہزار روپے تو صرف دو دن پہلے آئے ہیں اور اس پر ایک سال نہیں گزرا، لہٰذا اس پر زکوٰۃ نہ ہونی چاہئے یہ درست نہیں بلکہ زکوٰۃ نکالنے کی جو تاریخ ہے اور جس تاریخ کو آپ صاحب نصاب بنے ہیں اس تاریخ میں جتنا مال آپ کے پاس موجود ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہے، چاہے یہ رقم پچھلے سال یکم رمضان کی رقم سے زیادہ ہو یا کم ہو مثلاً اگر پچھلے سال ایک لاکھ روپے تھے، اب ڈیڑھ لاکھ ہیں تو ڈیڑھ لاکھ پر زکوٰۃ ادا کرو، اور اگر اس سال پچاس ہزار رہ گئے تو اب پچاس ہزار پر زکوٰۃ ادا کرو، درمیان سال میں جو رقم خرچ ہوگئی، اس کا کوئی حساب کتاب نہیں اور اس خرچ شدہ رقم پر زکوٰۃ نکالنے کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حساب کتاب کی الجھن سے بچانے کے لئے یہ آسان طریقہ مقرر فرمایا ہے کہ درمیان سال میں جو کچھ تم نے کھایا پیا اور وہ رقم تمہارے پاس سے چلی گئی تو اس کا کوئی حساب کتاب کرنے کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح درمیان سال میں جو رقم آگئی اس کا الگ سے حساب رکھنے کی ضرورت نہیں کہ وہ کس تاریخ میں آئی اور کب اس پر سال پورا ہوگا؟ بلکہ زکوٰۃ نکالنے کی تاریخ میں جو رقم تمہارے پاس ہے، اس پر زکوٰۃ ادا کرو۔ سال گزرنے کا مطلب یہ ہے۔

اموالِ زکوٰۃ کون کون سے ہیں؟

یہ بھی اللہ تعالیٰ کا ہم پر فضل ہے کہ اس نے ہر ہر چیز پر زکوٰۃ فرض نہیں فرمائی، ورنہ مال کی تو بہت سی قسمیں ہیں۔ جن چیزوں پر زکوٰۃ فرض ہے وہ یہ ہیں: ① نقد روپیہ، چاہے وہ کسی بھی شکل میں ہوں، چاہے وہ نوٹ ہوں یا سکے ہوں، ② سونا چاندی، چاہے وہ زیور کی شکل میں ہو، یا سکے کی شکل میں ہو، بعض لوگوں کے ذہنوں میں یہ رہتا ہے کہ جو خواتین کا استعمالی زیور ہے اس پر زکوٰۃ نہیں ہے، یہ بات درست نہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ استعمالی زیور پر بھی زکوٰۃ واجب ہے البتہ صرف

سونے چاندی کے زیور پر زکوۃ واجب ہے، لیکن اگر سونے چاندی کے علاوہ کسی اور دھات کا زیور ہے، چاہے پلاٹینم ہی کیوں نہ ہو اس پر زکوۃ واجب نہیں، اسی طرح ہیرے جواہرات پر زکوۃ نہیں جب تک تجارت کے لئے نہ ہوں بلکہ ذاتی استعمال کے لئے ہوں۔

اموال زکوۃ میں عقل نہ چلائیں

یہاں یہ بات بھی سمجھ لینا چاہئے کہ زکوۃ ایک عبادت ہے، اللہ تعالیٰ کا عائد کیا ہوا فریضہ ہے۔ اب بعض لوگ زکوۃ کے اندر اپنی عقل دوڑاتے ہیں اور یہ سوال کرتے ہیں کہ اس پر زکوۃ کیوں واجب ہے اور فلاں چیز پر زکوۃ کیوں واجب نہیں؟ یاد رکھئے کہ یہ زکوۃ ادا کرنا عبادت ہے اور عبادت کے معنی ہی یہ ہیں کہ چاہے وہ ہماری سمجھ میں آئے یا نہ آئے مگر اللہ کا حکم ماننا ہے مثلاً کوئی شخص کہے کہ سونے چاندی پر زکوۃ واجب ہے تو ہیرے جواہرات پر زکوۃ کیوں واجب نہیں؟ اور پلاٹینم پر کیوں زکوۃ نہیں؟ یہ سوال بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ حالت سفر میں ظہر اور عصر اور عشاء کی نماز میں قصر ہے اور چار رکعت کی بجائے دو رکعت پڑھی جاتی ہے تو پھر مغرب میں قصر کیوں نہیں؟ یا مثلاً کوئی شخص کہے کہ ایک آدمی ہوائی جہاز میں فرسٹ کلاس کے اندر سفر کرتا ہے اور اس سفر میں اس کو کوئی مشقت بھی نہیں ہوتی مگر اس کی نماز آدھی ہو جاتی ہے اور میں کراچی میں بس کے اندر بڑی مشقت کے ساتھ سفر کرتا ہوں، میری نماز آدھی کیوں نہیں ہوتی؟ ان سب کا ایک ہی جواب ہے، وہ یہ کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے عبادت کے احکام ہیں، عبادات میں ان احکام کی پابندی کرنا ضروری ہے ورنہ وہ کام عبادت نہیں رہے گا۔

عبادت کرنا اللہ کا حکم ہے

یا مثلاً کوئی شخص یہ کہے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ ۹ ذی الحجہ ہی کو حج ہوتا ہے؟

مجھے تو آسانی یہ ہے کہ آج جاکر حج کر آؤں اور ایک دن کے بجائے میں عرفات تین دن قیام کروں گا، اب اگر وہ شخص ایک دن کے بجائے تین دن بھی وہاں بیٹھا رہے گا، تب بھی اس کا حج نہیں ہوگا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے عبادت کا جو طریقہ بتایا تھا اس کے مطابق نہیں کیا۔ یا مثلاً کوئی شخص یہ کہے کہ حج کے تین دنوں میں جمرات کی رمی کرنے میں بہت ہجوم ہوتا ہے اس لئے میں چوتھے دن اکٹھی سارے دنوں کی رمی کرلوں گا۔ یہ رمی درست نہیں ہوگی اس لئے کہ یہ عبادت ہے اور عبادت کے اندر یہ ضروری ہے کہ جو طریقہ بتایا گیا ہے اور جس طرح بتایا گیا ہے اس کے مطابق وہ عبادت انجام دی جائے گی تو وہ عبادت درست ہوگی ورنہ درست نہ ہوگی۔ لہٰذا یہ اعتراض کرنا کہ سونے اور چاندی پر زکوٰۃ کیوں ہے اور ہیرے پر کیوں نہیں؟ یہ عبادت کے فلسفے کے خلاف ہے۔ بہرحال، اللہ تعالیٰ نے سونے چاندی پر زکوٰۃ رکھی ہے، چاہے وہ استعمال کا ہو، اور نقد روپیہ پر زکوٰۃ رکھی ہے۔

سامان تجارت کی قیمت کے تعین کا طریقہ

دوسری چیز جس پر زکوٰۃ فرض ہے وہ ہے "سامان تجارت" مثلاً کسی کی دکان میں جو سامان برائے فروخت رکھا ہوا ہے، اس سارے اسٹاک پر زکوٰۃ واجب ہے، البتہ اسٹاک کی قیمت لگاتے ہوئے اس بات کی گنجائش ہے کہ آدمی زکوٰۃ نکالتے وقت یہ حساب لگائے کہ اگر میں پورا اسٹاک اکٹھا فروخت کروں تو بازار میں اس کی کیا قیمت لگے گی۔ دیکھئے ایک "ریٹیل پرائس" ہوتی ہے اور دوسری "ہول سیل پرائس" تیسری صورت یہ ہے کہ پورا اسٹاک اکٹھا فروخت کرنے کی صورت میں کیا قیمت لگے گی، لہٰذا جب دکان کے اندر جو مال ہے اس کی زکوٰۃ کا حساب لگایا جارہا ہو تو اس کی گنجائش ہے کہ تیسری قسم کی قیمت لگائی جائے، وہ قیمت نکال کر پھر اس کا ڈھائی فیصد زکوٰۃ میں نکالنا ہوگا، البتہ احتیاط اس میں ہے کہ عام "ہول سیل قیمت" سے حساب لگا کر اس پر زکوٰۃ ادا کردی جائے۔

مال تجارت میں کیا کیا داخل ہے؟

اس کے علاوہ مال تجارت میں ہر وہ چیز شامل ہے جس کو آدمی نے بیچنے کی غرض سے خریدا ہو، لہٰذا اگر کسی شخص نے بیچنے کی غرض سے کوئی پلاٹ خریدا یا زمین خریدی یا کوئی مکان خریدا یا گاڑی خریدی اور اس مقصد سے خریدی کہ اس کو بیچ کر نفع کماؤں گا تو یہ سب چیزیں مال تجارت میں داخل ہیں، لہٰذا اگر کوئی پلاٹ، کوئی زمین، کوئی مکان خریدتے وقت شروع ہی میں یہ نیت تھی کہ میں اس کو فروخت کروں گا تو اس کی مالیت پر زکوٰۃ واجب ہے۔ بہت سے لوگ وہ ہوتے ہیں جو "انویسٹمنٹ" کی غرض سے پلاٹ خرید لیتے ہیں، اور شروع ہی سے یہ نیت ہوتی ہے کہ جب اس پر اچھے پیسے ملیں گے تو اس کو فروخت کروں گا اور فروخت کر کے اس سے نفع کماؤں گا، تو اس پلاٹ کی مالیت پر بھی زکوٰۃ واجب ہے۔ لیکن اگر پلاٹ اس نیت سے خریدا کہ اگر موقع ہوا تو اس پر رہائش کے لئے مکان بنالیں گے، یا موقع ہوگا تو اس کو کرائے پر چڑھادیں گے یا کبھی موقع ہوگا تو اس کو فروخت کر دیں گے، کوئی ایک واضح نیت نہیں ہے بلکہ ویسے ہی خرید کر ڈال دیا ہے، اب اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ آئندہ کسی وقت اس کو مکان بنا کر وہاں رہائش اختیار کرلیں گے اور یہ احتمال بھی ہے کہ کرائے پر چڑھادیں گے اور یہ احتمال بھی ہے کہ فروخت کردیں گے تو اس صورت میں اس پلاٹ پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے، لہٰذا زکوٰۃ صرف اس صورت میں واجب ہوتی ہے جب خریدتے وقت ہی اس کو دوبارہ فروخت کرنے کی نیت ہو، یہاں تک کہ اگر پلاٹ خریدتے وقت شروع میں یہ نیت تھی کہ اس پر مکان بنا کر رہائش اختیار کریں گے، بعد میں ارادہ بدل گیا اور یہ ارادہ کرلیا کہ اب اس کو فروخت کر کے پیسے حاصل کرلیں گے تو محض نیت اور ارادہ کی تبدیلی سے فرق نہیں پڑتا جب تک آپ اس پلاٹ کو واقعۃً فروخت نہیں کردیں گے اور اس کے پیسے آپ کے پاس نہیں آجائیں گے اس وقت تک اس پر زکوٰۃ واجب

نہیں ہوگی۔

بہرحال، ہر وہ چیز جسے خریدتے وقت ہی اس کو فروخت کرنے کی نیت ہو، وہ مال تجارت ہے اور اس کی مالیت پر ڈھائی فیصد کے حساب سے زکوۃ واجب ہے۔

کس دن کی مالیت معتبر ہوگی؟

یہ بات بھی یاد رکھیں کہ مالیت اس دن کی معتبر ہوگی جس دن آپ زکوۃ کا حساب کر رہے ہیں مثلاً ایک پلاٹ آپ نے ایک لاکھ روپے میں خریدا تھا اور آج اس پلاٹ کی قیمت دس لاکھ ہوگئی، اب دس لاکھ پر ڈھائی فیصد کے حساب سے زکوۃ نکالی جائے گی، ایک لاکھ پر نہیں نکالی جائے گی۔

کمپنیوں کے شیئرز پر زکوۃ کا حکم

اسی طرح کمپنیوں کے "شیئرز" بھی سامان تجارت میں داخل ہیں۔ اور ان کی دو صورتیں ہیں ایک صورت یہ ہے کہ آپ نے کسی کمپنی کے شیئرز اس مقصد کے لئے خریدے ہیں کہ اس کے ذریعہ کمپنی کا منافع (dividend) حاصل کریں گے اور اس پر ہمیں سالانہ منافع کمپنی کی طرف سے ملتا رہے گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آپ نے کسی کمپنی کے شیئرز "کیپٹل گین" کے لئے خریدے ہیں یعنی نیت یہ ہے کہ جب بازار میں ان کی قیمت بڑھ جائے گی تو ان کو فروخت کر کے نفع کمائیں گے۔ اگر یہ دوسری صورت ہے یعنی شیئرز خریدتے وقت شروع ہی میں ان کو فروخت کرنے کی نیت تھی تو اس صورت میں پورے شیئرز کی پوری بازاری قیمت پر زکوۃ واجب ہوگی مثلاً آپ نے پچاس روپے کے حساب سے شیئرز خریدے اور مقصد یہ تھا کہ جب ان کی قیمت بڑھ جائے گی تو ان کو فروخت کر کے نفع حاصل کریں گے، اس کے بعد جس دن آپ نے زکوۃ کا حساب نکالا، اس دن شیئرز کی قیمت ساٹھ روپے ہوگئی تو اب ساٹھ روپے کے حساب سے ان شیئرز کی مالیت نکالی جائے گی اور اس پر ڈھائی

فیصد کے حساب سے زکوۃ ادا کرنی ہوگی۔

لیکن اگر پہلی صورت ہے یعنی آپ نے کمپنی کے شیئرز اس نیت سے خریدے کہ کمپنی کی طرف سے اس پر سالانہ منافع ملتا رہے گا اور فروخت کرنے کی نیت نہیں تھی تو اس صورت میں آپ کے لئے اس بات کی گنجائش ہے کہ یہ دیکھیں کہ جس کمپنی کے یہ شیئرز ہیں اس کمپنی کے کتنے اثاثے جامد ہیں مثلاً بلڈنگ، مشینری، کاریں وغیرہ، اور کتنے اثاثے نقد، سامان تجارت اور خام مال کی شکل میں ہیں، یہ معلومات کمپنی ہی سے حاصل کی جاسکتی ہیں، مثلاً فرض کریں کہ کسی کمپنی کے ساٹھ فیصد اثاثے نقد، سامان تجارت، خام مال، اور تیار مال کی صورت میں ہیں اور چالیس فیصد اثاثے بلڈنگ، مشینری اور کار وغیرہ کی صورت میں ہیں تو اس صورت میں آپ ان شیئرز کی بازاری قیمت لگا کر اس کی ساٹھ فیصد قیمت پر زکوۃ ادا کریں، مثلاً شیئرز کی بازاری قیمت ساٹھ روپے تھی اور کمپنی کے ساٹھ فیصد اثاثے قابل زکوۃ تھے اور چالیس فیصد اثاثے ناقابل زکوۃ تھے تو اس صورت میں آپ اس شیئرز کی پوری قیمت یعنی ساٹھ روپے کے بجائے -/۳۶ روپے پر زکوۃ ادا کریں۔ اور اگر کسی کمپنی کے اثاثوں کی تفصیل معلوم نہ ہوسکے تو اس صورت میں احتیاطاً ان شیئرز کی پوری بازاری قیمت پر زکوۃ ادا کردی جائے۔

شیئرز کے علاوہ اور جتنے فائینانشل انسٹرومنٹس ہیں چاہے وہ بونڈز ہوں یا سرٹیفکیٹس ہوں، یہ سب نقد کے حکم میں ہیں، ان کی اصل قیمت پر زکوۃ واجب ہے۔

کارخانہ کی کن اشیاء پر زکوۃ ہے

اگر کوئی شخص فیکٹری کا مالک ہے تو اس فیکٹری میں جو تیار شدہ مال ہے اس کی قیمت پر زکوۃ واجب ہے، اسی طرح جو مال تیاری کے مختلف مراحل میں ہے یا خام مال کی شکل میں ہے اس پر بھی زکوۃ واجب ہے۔ البتہ فیکٹری کی مشینری، بلڈنگ،

گاڑیاں وغیرہ پر زکوٰۃ واجب نہیں۔

اس طرح اگر کسی شخص نے کسی کاروبار میں شرکت کے لئے روپیہ لگایا ہوا ہے، اور اس کاروبار کا کوئی متناسب حصہ اس کی ملکیت ہے تو جتنا حصہ اس کی ملکیت ہے اس حصے کی بازاری قیمت کے حساب سے زکوٰۃ واجب ہوگی۔

بہرحال، خلاصہ یہ کہ نقد روپیہ جس میں بینک بیلنس اور فائنینشل انسٹرومنٹس بھی داخل ہیں، ان پر زکوٰۃ واجب ہے، اور سامان تجارت، جس میں تیار مال، خام مال، اور جو مال تیاری کے مراحل میں ہیں وہ سب سامان تجارت میں داخل ہیں، اور کمپنی کے شیئرز بھی سامان تجارت میں داخل ہیں، اس کے علاوہ ہر چیز جو آدمی نے فروخت کرنے کی غرض سے خریدی ہو وہ بھی سامان تجارت میں داخل ہے، زکوٰۃ نکالتے وقت ان سب کی مجموعی مالیت نکالیں اور اس پر زکوٰۃ ادا کریں۔

واجب الوصول قرضوں پر زکوٰۃ

ان کے علاوہ بہت سی رقمیں وہ ہوتی ہیں جو دوسروں سے واجب الوصول ہوتی ہیں۔ مثلاً دوسروں کو قرض دے رکھا ہے، یا مثلاً مال ادھار فروخت کر رکھا ہے اور اس کی قیمت ابھی وصول ہونی ہے، تو جب آپ زکوٰۃ کا حساب لگائیں اور اپنی مجموعی مالیت نکالیں تو بہتر یہ ہے کہ ان قرضوں کو اور واجب الوصول رقموں کو آج ہی آپ اپنی مجموعی مالیت میں شامل کرلیں۔ اگرچہ شرعی حکم یہ ہے کہ جو قرضے ابھی وصول نہیں ہوئے تو جب تک وہ وصول نہ ہوجائیں اس وقت تک شرعاً ان پر زکوٰۃ کی ادائیگی واجب نہیں ہوتی، لیکن جب وصول ہوجائیں تو جتنے سال گزر چکے ہیں ان تمام پچھلے سالوں کی بھی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔ مثلاً فرض کریں کہ آپ نے ایک شخص کو ایک لاکھ روپیہ قرضہ دے رکھا تھا، اور پانچ سال کے بعد وہ قرضہ آپ کو واپس ملا، تو اگرچہ اس ایک لاکھ روپے پر ان پانچ سالوں کے دوران تو زکوٰۃ کی ادائیگی واجب نہیں تھی، لیکن جب وہ ایک لاکھ روپے وصول ہوگئے تو اب گزشتہ

پانچ سالوں کی بھی زکوۃ دینی ہوگی۔ تو چونکہ گذشتہ سالوں کی زکوۃ یک مشت ادا کرنے میں بعض اوقات دشواری ہوتی ہے لہٰذا بہتر یہ ہے کہ ہر سال اس قرض کی زکوۃ کی ادائیگی بھی کردی جایا کرے۔ لہٰذا جب زکوۃ کا حساب لگائیں تو ان قرضوں کو بھی مجموعی مالیت میں شامل کرلیا کریں۔

قرضوں کی منہائی

پھر دوسری طرف یہ دیکھیں کہ آپ کے ذمے دوسرے لوگوں کے کتنے قرضے ہیں۔ اور پھر مجموعی مالیت میں سے ان قرضوں کو منہا کردیں، منہا کرنے کے بعد جو باقی بچے وہ قابل زکوۃ رقم ہے۔ اس کا پھر ڈھائی فیصد نکال کر زکوۃ کی نیت سے ادا کردیں۔ بہتر یہ ہے کہ جو رقم زکوۃ کی بنے اتنی رقم الگ نکال کر محفوظ کرلیں، پھر وقتاً فوقتاً اس کو مستحقین میں خرچ کرتے رہیں۔ بہرحال زکوۃ کا حساب لگانے کا یہ طریقہ ہے۔

قرضوں کی دو قسمیں

قرضوں کے سلسلے میں ایک بات اور سمجھ لینی چاہئے، وہ یہ کہ قرضوں کی دو قسمیں ہیں: ایک تو معمولی قرضے ہیں جن کو انسان اپنی ذاتی ضروریات اور ہنگامی ضروریات کے لئے مجبوراً لیتا ہے۔ دوسری قسم کے قرضے وہ ہیں جو بڑے بڑے سرمایہ دار پیداواری اغراض کے لئے لیتے ہیں مثلاً: فیکٹریاں لگانے، یا مشینریاں خریدنے، یا مال تجارت امپورٹ کرنے کے لئے قرضے لیتے ہیں یا مثلاً ایک سرمایہ دار کے پاس پہلے سے دو فیکٹریاں موجود ہیں لیکن اس نے بینک سے قرض لے کر تیسری فیکٹری لگالی۔ اب اگر اس دوسری قسم کے قرضوں کو مجموعی مالیت سے منہا کیا جائے تو نہ صرف یہ کہ ان سرمایہ داروں پر ایک پیسے کی بھی زکوۃ واجب نہیں ہوگی بلکہ وہ لوگ الٹے مستحق زکوۃ بن جائیں گے، اس لئے کہ ان کے پاس جتنی مالیت کا مال

موجود ہے، اس سے زیادہ مالیت کے قرضے بینک سے لے رکھے ہیں، وہ بظاہر فقیر اور مسکین نظر آرہا ہے۔ لہٰذا ان قرضوں کے منہا کرنے میں بھی شریعت نے فرق رکھا ہے۔

تجارتی قرضے کب منہا کئے جائیں

اس میں تفصیل یہ ہے کہ پہلی قسم کے قرضے تو مجموعی مالیت سے منہا ہو جائیں گے اور ان کو منہا کرنے کے بعد زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔ اور دوسری قسم کے قرضوں میں یہ تفصیل ہے کہ اگر کسی شخص نے تجارت کی غرض سے قرض لیا، اور اس قرض کو ایسی اشیاء خریدنے میں استعمال کیا جو قابل زکوٰۃ ہیں، مثلاً اس قرض سے خام مال خرید لیا، یا مال تجارت خرید لیا، تو اس قرض کو مجموعی مالیت سے منہا کریں گے۔ لیکن اگر اس قرض کو ایسے اثاثے خریدنے میں استعمال کیا جو ناقابل زکوٰۃ ہیں تو اس قرض کو مجموعی مالیت سے منہا نہیں کریں گے۔

قرض کی مثال

مثلاً ایک شخص نے بینک سے ایک کروڑ روپے قرض لئے اور اس رقم سے اس نے ایک پلانٹ (مشینری) باہر سے امپورٹ کرلیا ــــ چونکہ یہ پلانٹ قابل زکوٰۃ نہیں ہے اس لئے کہ یہ مشینری ہے تو اس صورت میں یہ قرضہ منہا نہیں ہوگا۔ لیکن اگر اس نے اس قرض سے خام مال خرید لیا تو چونکہ خام مال قابل زکوٰۃ ہے اس لئے یہ قرض منہا کیا جائے گا، کیونکہ دوسری طرف یہ خام مال ادا کی جانے والی زکوٰۃ کی مجموعی مالیت میں پہلے سے شامل ہو چکا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ نارمل قسم کے قرض تو پورے کے پورے مجموعی مالیت سے منہا ہو جائیں گے۔ اور جو قرضے پیداواری اغراض کے لئے لئے گئے ہیں، اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر اس سے ناقابل زکوٰۃ اثاثے خریدے ہیں تو وہ قرض منہا نہیں ہوگا، اور اگر قابل زکوٰۃ اثاثے خریدے

ہیں تو وہ قرض منہا ہوگا۔ یہ تو زکوۃ نکالنے کے بارے میں احکام تھے۔

زکوۃ مستحق کو ادا کریں

دوسری طرف زکوۃ کی ادائیگی کے بارے میں بھی شریعت نے احکام بتائے ہیں۔ میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ زکوۃ نکالو، نہ یہ فرمایا کہ زکوۃ پھینکو، بلکہ فرمایا: آتوا الزکاۃ زکوۃ ادا کرو۔ یعنی یہ دیکھو کہ اس جگہ پر زکوۃ جائے جہاں شرعاً زکوۃ جانی چاہئے۔ بعض لوگ زکوۃ نکالتے تو ہیں لیکن اس کی پرواہ نہیں کرتے کہ صحیح مصرف پر خرچ ہو رہی ہے یا نہیں؟ زکوۃ نکال کر کسی کے حوالے کردی اور اس کی تحقیق نہیں کی کہ یہ صحیح مصرف پر خرچ کرے گا یا نہیں؟ آج بے شمار ادارے دنیا میں کام کر رہے ہیں، ان میں بہت سے ادارے ایسے بھی ہوں گے جن میں بسا اوقات اس بات کا لحاظ نہیں ہوتا ہوگا کہ زکوۃ کی رقم صحیح مصرف پر خرچ ہو رہی ہے یا نہیں؟ اس لئے فرمایا کہ زکوۃ ادا کرو۔ یعنی جو مستحق زکوۃ ہے اس کو ادا کرو۔

مستحق کون؟

اس کے لئے شریعت نے یہ اصول مقرر فرمایا کہ زکوۃ صرف انہی اشخاص کو دی جاسکتی ہے جو صاحب نصاب نہ ہوں۔ یہاں تک کہ اگر ان کی ملکیت میں ضرورت سے زائد ایسا سامان موجود ہے جو ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت تک پہنچ جاتا ہے تو بھی وہ مستحق زکوۃ نہیں رہتا۔ مستحق زکوۃ وہ ہے جس کے پاس ساڑھے باون تولہ چاندی کی مالیت کی رقم یا اتنی مالیت کا کوئی سامان ضرورت سے زائد نہ ہو۔

مستحق کو مالک بنا کر دیں

اس میں بھی شریعت کا یہ حکم ہے کہ اس مستحق زکوۃ کو مالک بنا کر دو۔ یعنی وہ

مستحق زکوۃ اپنی ملکیت میں خود مختار ہو کہ جو چاہے کرے۔ اسی وجہ سے کسی بلڈنگ کی تعمیر پر زکوۃ نہیں لگ سکتی، کسی ادارے کے ملازمین کی تنخواہوں پر زکوۃ نہیں لگ سکتی۔ اس لئے کہ اگر زکوۃ کے ذریعہ تعمیرات کرنے اور ادارے قائم کرنے کی اجازت دے دی جاتی تو زکوۃ کی رقم سب لوگ کھاپی کر ختم کر جاتے، کیونکہ اداروں کے اندر تنخواہیں بے شمار ہوتی ہیں، تعمیرات پر خرچ لاکھوں کا ہوتا ہے، اس لئے یہ حکم دیا گیا کہ غیر صاحب نصاب کو مالک بنا کر زکوۃ دو، یہ زکوۃ فقراء اور غرباء اور کمزوروں کا حق ہے؟ لہذا یہ زکوۃ انہی تک پہنچنی چاہئے، جب ان کو مالک بنا کر دے دو گے تو تمہاری زکوۃ ادا ہو جائے گی۔

کن رشتہ داروں کو زکوۃ دی جاسکتی ہے

یہ زکوۃ ادا کرنے کا حکم انسان کے اندر یہ طلب اور جستجو خود بخود پیدا کرتا ہے کہ میرے پاس زکوۃ کے اتنے پیسے موجود ہیں، ان کو صحیح مصرف میں خرچ کرنا ہے۔ اس لئے وہ مستحقین کو تلاش کرتا ہے کہ کون کون لوگ مستحقین ہیں اور ان مستحقین کی فہرست بناتا ہے، پھر ان کو زکوۃ پہنچاتا ہے، یہ بھی انسان کی ذمہ داری ہے۔ آپ کے محلے میں، ملنے جلنے والوں میں، عزیز و اقارب اور رشتہ داروں میں، دوست احباب میں جو مستحق زکوۃ ہوں، ان کو زکوۃ ادا کریں۔ اور ان میں سے سب سے افضل یہ ہے کہ اپنے رشتہ داروں کو زکوۃ ادا کریں اس میں ڈبل ثواب ہے، زکوۃ ادا کرنے کا ثواب بھی ہے اور صلہ رحمی کرنے کا ثواب بھی ہے۔ اور تمام رشتہ داروں کو زکوۃ دے سکتے ہیں صرف دو رشتے ایسے ہیں جن کو زکوۃ نہیں دی جاسکتی، ایک ولادت کا رشتہ ہے لہذا باپ بیٹے کو زکوۃ نہیں دے سکتا اور بیٹا باپ کو زکوۃ نہیں دے سکتا، دوسرا نکاح کا رشتہ ہے لہذا شوہر بیوی کو زکوۃ نہیں دے سکتا اور بیوی شوہر کو زکوۃ نہیں دے سکتی، ان کے علاوہ باقی تمام رشتوں میں زکوۃ دی جاسکتی ہے۔ مثلاً بھائی کو، بہن کو، چچا کو، خالہ کو، پھوپھی کو، ماموں کو زکوۃ دی جاسکتی

ہے۔ البتہ یہ ضرور دیکھ لیں کہ وہ مستحق زکوٰۃ ہوں اور صاحب نصاب نہ ہو۔

بیوہ اور یتیم کو زکوٰۃ دینے کا حکم

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر کوئی خاتون بیوہ ہے تو اس کو زکوٰۃ ضرور دینی چاہئے حالانکہ یہاں بھی شرط یہ ہے کہ وہ مستحق زکوٰۃ ہو اور صاحب نصاب نہ ہو۔ اگر بیوہ مستحق زکوٰۃ ہے تو اس کی مدد کرنا بڑی اچھی بات ہے۔ لیکن اگر ایک خاتون بیوہ ہے اور مستحق زکوٰۃ نہیں ہے تو محض بیوہ ہونے کی وجہ سے وہ مصرف زکوٰۃ نہیں بن سکتی۔ اسی طرح یتیم کو زکوٰۃ دینا اور اس کی مدد کرنا بہت اچھی بات ہے لیکن یہ دیکھ کر زکوٰۃ دینی چاہئے کہ وہ مستحق زکوٰۃ ہے۔ لیکن اگر کوئی یتیم ہے مگر وہ مستحق زکوٰۃ نہیں ہے بلکہ صاحب نصاب ہے تو یتیم ہونے کے باوجود اس کو زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی۔ ان احکام کو مدنظر رکھتے ہوئے زکوٰۃ نکالنی چاہئے۔

بینکوں سے زکوٰۃ کی کٹوتی کا حکم

کچھ عرصے سے ہمارے ملک میں سرکاری سطح پر زکوٰۃ وصول کرنے کا نظام قائم ہے۔ اس کی وجہ سے بہت سے مالیاتی اداروں سے زکوٰۃ وصول کی جاتی ہے، کمپنیاں بھی زکوٰۃ کاٹ کر حکومت کو ادا کرتی ہیں۔ اس کے بارے میں تھوڑی سی تفصیل عرض کر دیتا ہوں۔

جہاں تک بینکوں اور مالیاتی اداروں سے زکوٰۃ کی کٹوتی کا تعلق ہے تو اس کٹوتی سے زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے، دوبارہ زکوٰۃ ادا کرنے کی ضرورت نہیں، البتہ احتیاطاً ایسا کرلیں کہ یکم رمضان آنے سے پہلے دل میں یہ نیت کرلیں کہ میری رقم سے جو زکوٰۃ کٹے گی وہ میں ادا کرتا ہوں، اس سے اس کی زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے دوبارہ زکوٰۃ نکالنے کی ضرورت نہیں۔

اس میں بعض لوگوں کو یہ شبہ رہتا ہے کہ ہماری پوری رقم پر سال پورا نہیں

گزرا جب کہ پوری رقم پر زکوۃ کٹ گئی۔ اس کے بارے میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ہر ہر رقم پر سال گزرنا ضروری نہیں ہوتا، بلکہ اگر آپ صاحب نصاب ہیں تو اس صورت میں سال پورا ہونے سے ایک دن پہلے بھی جو رقم آپ کے پاس آئی ہے اس پر جو زکوۃ کٹی ہے وہ بھی بالکل صحیح کٹی ہے کیونکہ اس پر بھی زکوۃ واجب ہوگئی تھی۔

اکاؤنٹ کی رقم سے قرض کس طرح منہا کریں؟

البتہ اگر کسی شخص کا سارا اثاثہ بینک ہی میں ہے، خود اس کے پاس کچھ بھی موجود نہیں، اور دوسری طرف اس کے اوپر لوگوں کے قرضے ہیں تو اس صورت میں بینک تو تاریخ آنے پر زکوۃ کاٹ لیتا ہے حالانکہ اس رقم سے قرضے منہا نہیں ہوتے، جس کے نتیجے میں زیادہ زکوۃ کٹ جاتی ہے۔ اس کا ایک حل تو یہ ہے کہ یا تو آدمی وہ تاریخ آنے سے پہلے اپنی رقم بینک سے نکال لے یا کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھ دے۔ بلکہ ہر شخص کو چاہئے کہ وہ اپنی رقم کرنٹ اکاؤنٹ ہی میں رکھے، سیونگ اکاؤنٹ میں بالکل نہ رکھے، اس لئے کہ وہ تو سودی اکاؤنٹ ہے اور کرنٹ اکاؤنٹ میں زکوۃ نہیں کٹتی۔ بہرحال زکوۃ کی تاریخ آنے سے پہلے وہ رقم کرنٹ اکاؤنٹ میں منتقل کردے، جب کرنٹ اکاؤنٹ سے زکوۃ نہیں کٹے گی تو آپ اپنے طور پر حساب کر کے قرض منہا کر کے زکوۃ ادا کریں۔ دوسرا حل یہ ہے کہ وہ شخص بینک کو لکھ کر دیدے کہ میں صاحب نصاب نہیں ہوں اور صاحب نصاب نہ ہونے کی وجہ سے میرے اوپر زکوۃ واجب نہیں ہے۔ اگر یہ لکھ کر دے دے تو قانوناً اس کی رقم سے زکوۃ نہیں کاٹی جائے گی۔

کمپنی کے شیئرز کی زکوۃ کاٹنا

ایک مسئلہ کمپنی کے شیئرز کا ہے۔ جب کمپنی شیئرز پر سالانہ منافع تقسیم کرتی

ہے تو اس وقت وہ کمپنی زکوۃ کاٹ لیتی ہے، لیکن کمپنی ان شیئرز کی جو زکوۃ کاٹتی ہے وہ اس شیئرز کی فیس ویلیو (FACE VALUE) کی بنیاد پر زکوۃ کاٹتی ہے، حالانکہ شرعاً ان شیئرز کی مارکیٹ قیمت پر زکوۃ واجب ہے، لہٰذا فیس ویلیو پر جو زکوۃ کاٹ لی گئی ہے وہ تو ادا ہو گئی البتہ فیس ویلیو اور مارکیٹ ویلیو کے درمیان جو فرق ہے، اس کا آپ کو اس بنیاد پر حساب کرنا ہو گا جس کی تفصیل شیئرز کی زکوۃ کے بارے میں بیان کی گئی ہے مثلاً ایک شیئر کی فیس ویلیو پچاس روپے تھی اور اس کی مارکیٹ ویلیو ساٹھ روپے ہے، تو اب کمپنی والوں نے پچاس روپے کی زکوۃ ادا کر دی، لہٰذا دس روپے کی زکوۃ آپ کو الگ سے نکالنی ہو گی۔ کمپنی کے شیئرز اور این آئی ٹی یونٹ دونوں کے اندر یہی صورت ہے، لہٰذا جہاں کہیں فیس ویلیو پر زکوۃ کٹتی ہے وہاں مارکیٹ ویلیو کا حساب کر کے دونوں کے درمیان جو فرق ہے اس کی زکوۃ ادا کرنا ضروری ہے۔

زکوۃ کی تاریخ کیا ہونی چاہئے؟

ایک بات یہ سمجھ لیں کہ زکوۃ کے لئے شرعاً کوئی تاریخ مقرر نہیں ہے اور نہ کوئی زمانہ مقرر ہے کہ اس زمانے میں یا اس تاریخ میں زکوۃ ادا کی جائے، بلکہ ہر آدمی کی زکوۃ کی تاریخ جدا ہوتی ہے۔ شرعاً زکوۃ کی اصل تاریخ وہ ہے جس تاریخ اور جس دن آدمی پہلی مرتبہ صاحب نصاب بنا، مثلاً ایک شخص یکم محرم الحرام کو پہلی مرتبہ صاحب نصاب بنا تو اس کی زکوۃ کی تاریخ یکم محرم الحرام ہو گئی، اب آئندہ ہر سال اس کو یکم محرم الحرام کو اپنی زکوۃ کا حساب کرنا چاہئے۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کو یہ یاد نہیں رہتا کہ ہم کس تاریخ کو پہلی مرتبہ صاحب نصاب بنے تھے، اس لئے اس مجبوری کی وجہ سے وہ اپنے لئے کوئی ایسی تاریخ زکوۃ کے حساب کی مقرر کر لے جس میں اس کے لئے حساب لگانا آسان ہو، پھر آئندہ ہر سال اسی تاریخ کو زکوۃ کا حساب کر کے زکوۃ ادا کرے، البتہ احتیاطاً کچھ زیادہ ادا کر دیں۔

کیا رمضان المبارک کی تاریخ مقرر کر سکتے ہیں؟

عام طور پر لوگ رمضان المبارک میں زکوٰۃ نکالتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ حدیث شریف میں ہے کہ رمضان المبارک میں ایک فرض کا ثواب ستر گنا بڑھا دیا جاتا ہے، لہٰذا زکوٰۃ بھی چونکہ فرض ہے اگر رمضان المبارک میں ادا کریں گے تو اس کا ثواب بھی ستر گنا ملے گا۔ بات اپنی جگہ بالکل درست ہے اور یہ جذبہ بہت اچھا ہے، لیکن اگر کسی شخص کو اپنے صاحب نصاب بننے کی تاریخ معلوم ہے تو محض اس ثواب کی وجہ سے وہ شخص رمضان کی تاریخ مقرر نہیں کر سکتا، لہٰذا اس کو چاہئے کہ اسی تاریخ پر اپنی زکوٰۃ کا حساب کرے۔ البتہ زکوٰۃ کی ادائیگی میں یہ کر سکتا ہے کہ اگر تھوڑی تھوڑی زکوٰۃ ادا کر رہا ہے تو اس طرح ادا کرتا رہے اور باقی جو بچے اس کو رمضان المبارک میں ادا کر دے۔ البتہ اگر تاریخ یاد نہیں ہے تو پھر گنجائش ہے کہ رمضان المبارک کی کوئی تاریخ مقرر کر لے، البتہ احتیاطاً زیادہ ادا کر دے تاکہ اگر تاریخ کے آگے پیچھے ہونے کی وجہ سے جو فرق ہو گیا ہو وہ فرق بھی پورا ہو جائے۔

پھر جب ایک مرتبہ جو تاریخ مقرر کر لے تو پھر ہر سال اسی تاریخ کو اپنا حساب لگائے اور یہ دیکھے کہ اس تاریخ میں میرے کیا کیا اثاثے موجود ہیں، اس تاریخ میں نقد رقم کتنی ہے، اگر سونا موجود ہے تو اسی تاریخ کی سونے کی قیمت لگائے، اگر شیئرز ہیں تو اسی تاریخ کی ان شیئرز کی قیمت لگائے، اگر اسٹاک کی قیمت لگانی ہے تو اسی تاریخ کی اسٹاک کی قیمت لگائے اور پھر ہر سال اسی تاریخ کو حساب کر کے زکوٰۃ ادا کرنی چاہئے، اس تاریخ سے آگے پیچھے نہیں کرنا چاہئے۔

بہرحال، زکوٰۃ کے بارے میں یہ تھوڑی سی تفصیل عرض کر دی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان احکام پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین

کیا آپ کو خیالات پریشان کرتے ہیں

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱/۱۸۸، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

تاریخ خطاب :

مقام خطاب : جامع مسجد بیت المکرم
گلشن اقبال کراچی

وقت خطاب : بعد نماز عصر تا مغرب

اصلاحی خطبات : جلد نمبر ۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کیا آپ کو خیالات پریشان کرتے ہیں؟

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا وسندنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ، صلی اللہ تعالٰی علیہ وعلی آلہ واصحابہ وبارک وسلم تسلیماً کثیرًا کثیرا۔

اما بعد!

بُرے خیالات، ایمان کی علامت

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالٰی عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وسوسے کے بارے میں پوچھا گیا کہ دل میں کفر و شرک کے اور فسق و فجور کے جو وسوسے آتے ہیں ان کا کیا حکم ہے؟ جواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ذاک محض الایمان یعنی یہ وسوسے خالص ایمان کی علامت ہیں۔ ان سے مت گھبراؤ اور ان کی وجہ سے مایوس مت ہو جاؤ اور ان کی وجہ سے زیادہ پریشان مت ہو، کیونکہ یہ خالص ایمان کی علامت ہیں۔

ایک صحابی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم! بعض اوقات ہمارے دل میں ایسے وسوسے اور خیالات آتے ہیں کہ ان خیالات کو زبان پر لانے کے مقابلے میں ہمیں جل کر کوئلہ ہو جانا زیادہ پسند ہے یعنی ان خیالات کو زبان سے ظاہر کرنا آگ میں جل جانے سے زیادہ بُرا لگتا ہے۔ اس کے جواب میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ تو ایمان کی علامت ہے۔

شیطان ایمان کا چور ہے

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ "وسوسہ" شیطان کا عمل ہے کیونکہ شیطان ہی انسان کے دل میں یہ وسوسے ڈالتا ہے۔ اور شیطان ایمان کا چور ہے، یہ تمہارے ایمان پر ڈاکہ ڈالنا چاہتا ہے، چور اور ڈاکو اس گھر میں ڈاکہ ڈالے گا جس گھر میں دولت ہو، اگر دولت ہے ہی نہیں تو پھر ڈاکو ڈاکہ کیوں ڈالے گا۔ لہٰذا شیطان جو تمہارے دل میں وسوسے ڈال رہا ہے اور تمہارے دل میں داخل ہو رہا ہے یہ اس بات کی علامت ہے کہ تمہارے دل میں ایمان کی دولت موجود ہے، اگر یہ ایمان کی دولت نہ ہوتی تو یہ ڈاکو اس گھر میں داخل نہ ہوتا، اس وجہ سے ان سے گھبرانا نہیں چاہئے۔ یہ جو تم کہہ رہے ہو کہ میرے دل میں ایسے وسوسے آتے ہیں کہ ان کو ظاہر کرنے کے مقابلے میں جل کر مرجانا زیادہ پسند ہے، یہ اندر سے تمہارا ایمان بول رہا ہے، تمہارا ایمان یہ بول رہا ہے کہ بات زبان سے نکلنے والی نہیں۔ اگر دل میں ایمان نہ ہوتا تو یہ بات نہ ہوتی، اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ تو عین ایمان کی علامت ہے۔

وساوس پر گرفت نہیں ہوگی

ایک حدیث میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الحمد للہ

الذی رد کید الشیطان الی الوسوسۃ یعنی اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے شیطان کے مکر اور چال کو وسوسے کی حد تک محدود کر دیا، اس سے آگے نہیں بڑھایا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے کہ شیطان کی تدبیر تمہارے اوپر اس سے زیادہ کارگر نہیں ہو رہی ہے۔ ایک اور حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿ان اللہ تجاوز عن امتی ماوسوست بہ صدورھا﴾

یعنی اللہ تعالیٰ نے میری امت کے دلوں میں جو وسوسے پیدا ہوتے ہیں اس سے درگزر فرما دیا ہے اور ان کو معاف فرما دیا ہے، ان پر مؤاخذہ نہیں ہو گا۔ البتہ عمل پر مؤاخذہ ہو گا۔

عقیدوں کے بارے میں خیالات

وسوسے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وسوسے عقیدے کے بارے میں ہیں، یعنی دل میں شیطان اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں وسوسہ ڈالے یا آخرت کے بارے میں وسوسہ ڈالے کہ معلوم نہیں کہ آئے گی یا نہیں۔ اس قسم کے وسوسوں کے بارے میں تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا کہ جب تک تم اپنا عقیدہ درست رکھو گے، پھر چاہے خیالات اور وساوس کیسے بھی آجائیں اس پر انشاء اللہ مؤاخذہ نہیں ہوگا اور نہ ان خیالات کی وجہ سے انسان کافر ہوتا ہے۔ ان خیالات کی وجہ سے بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میں شیطان ہو گیا، میں تو کافر ہو گیا۔ یاد رکھئے! ان وسوسوں کے دل میں آنے سے کچھ نہیں ہوتا جب تک انسان اپنے دل، اپنی زبان اور اپنے عمل سے مؤمن ہے۔ لہٰذا آدمی کو مطمئن ہو جانا چاہئے۔

گناہوں کے خیالات

دوسرے گناہ کرنے اور فسق و فجور کرنے کے وسوسے اور خیالات آتے ہیں۔ مثلاً دل میں یہ خیال آتا ہے کہ فلاں گناہ کا ارتکاب کرلوں یا فلاں گناہ کرلوں یا کسی گناہ کی طرف طبیعت مائل ہو رہی ہے اور اس کی طرف کشش ہو رہی ہے۔ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمادیا کہ اگر محض دل میں خیال آیا ہے تو اس پر انشاء اللہ کوئی مؤاخذہ نہیں ہوگا جب تک اس خیال اور وسوسے پر عمل نہ کر لو گے، لہٰذا جب گناہ کے تقاضے اور داعیے پر عمل کر لوگے تو یہ قابل مؤاخذہ اور قابل گرفت ہے۔ اور جب بھی کسی گناہ کا خیال یا وسوسہ آئے کہ فلاں گناہ کرلوں تو اس کا فوری توڑ یہ ہے کہ فوراً اللہ کی پناہ مانگو کہ یا اللہ! میرے دل میں اس گناہ کا خیال آرہا ہے، میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں، آپ مجھے اس گناہ سے بچالیجئے۔ اس طرح اس خیال اور وسوسے کا توڑ ہو جائے گا۔

بُرے خیالات کے وقت اللہ کی طرف رجوع کرو

حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ قرآن کریم میں مذکور ہے کہ آپ آزمائش میں مبتلا ہوئے اور اس آزمائش کے نتیجے میں ان کے دل میں بھی گناہ کا کچھ وسوسہ آیا اس لئے کہ بہر حال آپ بھی انسان تھے لیکن اس وقت آپ نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا فرمائی کہ:

﴿ان لا تصرف عنی کیدھن اصب الیھن واکن من الجاھلین﴾

یعنی اے اللہ! اگر آپ ان عورتوں کے مکر کو مجھ سے دور نہیں کریں گے تو میں بھی تو ایک انسان ہوں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور جاہلوں میں سے ہو جاؤں گا، لہٰذا ان عورتوں کے مکر کو مجھ سے دور کردیجئے۔ جب کبھی گناہ کا خیال یا گناہ کا

وسوسہ اور داعیہ دل میں پیدا ہو تو فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر کے اس سے پناہ مانگ لو کہ اے اللہ! اپنے فضل و کرم سے مجھے اس گناہ سے محفوظ رکھئے۔ اور اس وقت اپنی ہمت کو تازہ کر لو کہ میں گناہ کے اس داعیہ پر عمل نہیں کرونگا۔ اگر یہ کر لو گے تو پھر انشاء اللہ یہ خیالات اور وسوسے کچھ بھی نقصان نہیں کریں گے۔

نماز میں آنے والے خیالات کا حکم

وسوسے کی تیسری قسم اگرچہ مباح ہے کیونکہ وہ کسی گناہ کا وسوسہ اور خیال نہیں ہے لیکن وہ خیال انسان کو کسی عبادت اور طاعت کی طرف متوجہ ہونے سے روک رہا ہے مثلاً جیسے ہی نماز کی نیت باندھی بس اس وقت دنیا بھر کے خیالات کی چکی چلنی شروع ہوگئی۔ اور وہ خیالات چاہے گناہ کے خیال نہ ہوں مثلاً کھانے پینے کا خیال، بیوی بچوں کا خیال، اپنی روزی کا خیال، تجارت کا خیال، یہ تمام خیالات فی نفسہ گناہ کے خیالات نہیں ہیں۔ لیکن ان خیالات کی وجہ سے دل نماز کی طرف متوجہ نہیں ہو رہا ہے اور ان خیالات کی وجہ سے خشوع میں رکاوٹ پیدا ہو رہی ہے۔ چونکہ یہ خیالات جو غیر اختیاری طور پر آرہے ہیں اور انسان کے اپنے اختیار کو کوئی دخل نہیں ہے اس لئے انشاء اللہ ان خیالات پر کوئی گرفت اور مؤاخذہ نہیں ہوگا بلکہ معاف ہونگے، البتہ اپنے اختیار سے باقاعدہ ارادہ کر کے خیالات نماز میں مت لاؤ اور نہ دل ان میں لگاؤ بلکہ جب اللہ اکبر کہہ کر نماز شروع کرو تو ذہن کو نماز کی طرف متوجہ کرو، جب ثنا پڑھو تو اس کی طرف دھیان لگاؤ اور جب سورۃ فاتحہ پڑھنی شروع کرو تو اس کی طرف دھیان لگاؤ، پھر دھیان لگانے کے باوجود غیر اختیاری طور پر ذہن دوسری طرف بھٹک گیا اور خیالات کہیں اور چلے گئے تو انشاء اللہ ان پر گرفت نہیں ہوگی۔ لیکن جب تنبہ ہو جائے کہ میں تو بھٹک گیا تو پھر دوبارہ نماز کی طرف لوٹ آؤ اور نماز کے الفاظ اور اذکار کی طرف لوٹ آؤ۔ بار بار یہ کرتے رہو گے تو انشاء اللہ یہ خیالات آنے کم ہو جائیں گے اور اس کام کے ذریعہ اللہ تعالیٰ

خشوع عطا فرمادیں گے۔

نماز کی ناقدری مت کرو

بہرحال نماز میں یہ جو خیالات آتے ہیں، بہت سے لوگ ان سے پریشان ہوتے ہیں اور ان خیالات کے نتیجے میں سمجھتے ہیں کہ ہماری یہ نماز تو اٹھک بیٹھک ہے، اس میں کوئی روح اور جان نہیں ہے۔ یاد رکھئے! نماز کی ایسی ناقدری نہیں کرنی چاہئے۔ ارے یہ تو اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ اس نے ہمیں نماز پڑھنے کی توفیق عطا فرمائی اور اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔ اور ان خیالات کی وجہ سے اپنی نماز کو بے کار مت سمجھو، یہ نماز کی توفیق تو اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔ اور ان غیر اختیاری خیالات کی وجہ سے انشاء اللہ تمہاری گرفت نہیں ہوگی۔ البتہ اپنے اختیار سے خیالات مت لاؤ۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ جو بڑے درجے کے عالم اور صوفی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بہت اونچا مقام عطا فرمایا تھا۔ ان کے ایک بھائی تھے جو بالکل خالص صوفی مزاج آدمی تھے، امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ جب امامت فرماتے اور نماز پڑھاتے تو یہ بھائی ان کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے تھے، کسی نے ان کی والدہ سے شکایت کر دی کہ یہ ان کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے۔ والدہ نے ان کو بلایا اور ان سے پوچھا کہ تم ان کے پیچھے نماز کیوں نہیں پڑھتے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ان کی نماز ہی کیا ہے، میں ان کے پیچھے کیسے نماز پڑھوں۔ اس لئے کہ جب یہ نماز پڑھاتے ہیں تو اس وقت ان کا دل اور دماغ حیض اور نفاس کے مسائل میں الجھا رہتا ہے۔ اس لئے یہ گندی نماز ہے، میں اس کے پیچھے نماز نہیں پڑھتا۔ وہ والدہ بھی امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی والدہ تھیں۔ جواب میں فرمایا کہ تمہارا بھائی تو نماز کے اندر فقہی مسائل سوچتا ہے

اور نماز کے اندر فقہی مسئلے سوچنا جائز ہے، اور تم نماز کے اندر اپنے بھائی کی عیب جوئی میں لگے رہتے ہو اور یہ دیکھتے رہتے ہو کہ اس کی نماز صحیح ہے یا غلط ہے؟ اور نماز کے اندر یہ کام یقینی طور پر حرام ہے۔ لہٰذا بتاؤ کہ وہ بہتر ہے یا تم بہتر ہو؟ بہرحال امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی والدہ نے بھی یہ بات واضح فرمادی کہ نماز میں فقہی مسئلے کو سوچنا کوئی گناہ کی بات نہیں۔ لہٰذا اپنے اختیار سے ایسے خیالات لانا جو خود عبادت اور طاعت کا حصہ ہیں وہ بھی نماز کے خشوع کے منافی نہیں۔

آیات قرآنی میں تدبر کا حکم

چنانچہ حکم یہ ہے کہ قرآن کریم پڑھتے وقت قرآن کریم کی آیات میں تدبر کرو، غور و فکر کرو۔ اب اگر ایک شخص نماز پڑھ رہا ہے اور نماز میں تلاوت کے وقت قرآن کریم کے اسرار و حکم کے اندر غلطان و پیچان ہے اور منہمک ہے، یہ سب جائز ہے اور عبادت ہی کا ایک حصہ ہے۔ لہٰذا کوئی بھی ایسا خیال جو طاعت اور عبادت کا خیال ہو ان کو اپنے اختیار سے بھی نماز میں لاسکتے ہیں۔ البتہ وہ خیالات جو طاعت اور عبادت کا حصہ نہیں ہیں۔ مثلاً دنیا کے بارے میں خیالات کہ کس طرح دنیا کماؤں، کس طرح خرچ کروں وغیرہ تو اس قسم کے خیالات اپنے اختیار سے تو نہ لائیں، خود سے آرہے ہیں تو آنے دو، اس سے نماز کے خشوع میں ذرہ برابر فرق نہیں پڑتا۔ ہاں! جب دھیان اس طرف آجائے کہ یہ خیالات آرہے ہیں پھر بھی ان خیالات کو باقی رکھا اور ان خیالات سے مزے لیتا رہا تو یہ ناجائز ہے۔ لہٰذا جب متنبہ ہو جائے تو دوبارہ نماز کی طرف لوٹ آؤ۔

یہ سجدہ صرف اللہ کے لئے ہے

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ایک صاحب آئے اور عرض کیا کہ حضرت! میں بہت پریشان ہوں، اس لئے کہ میری نمازیں کسی

کام کی نہیں، جب میں سجدہ کرتا ہوں تو اس وقت دماغ میں ایسے شہوانی اور نفسانی خیالات کا ہجوم ہوتا ہے کہ الامان، تو وہ میرا سجدہ کیا ہوا، وہ تو ویسے ہی ٹکریں مارنا ہوا۔ میں تو بہت پریشان ہوں کہ کس طرح اس مصیبت سے نجات پاؤں۔ ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ تم یہ جو سجدہ کرتے ہو تمہارے خیال میں یہ کیسا سجدہ ہے؟ اس نے کہا کہ حضرت! بڑا ناپاک اور بڑا گندہ سجدہ ہے اس لئے کہ اس میں ناپاک اور گندے شہوانی خیالات آتے ہیں، حضرت نے فرمایا کہ یہ ناپاک اور گندہ سجدہ تو اللہ میاں کو نہیں کرنا چاہئے، اچھا ایسا کرو کہ تم یہ ناپاک سجدہ مجھے کرلو اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے تو بہت پاکیزہ اور اعلیٰ قسم کا سجدہ ہونا چاہئے اور یہ ناپاک سجدہ ہے یہ مجھ ناپاک کے سامنے کرلو۔ وہ صاحب کہنے لگے کہ توبہ توبہ آپ کے سامنے کیسے سجدہ کرلوں؟ حضرت نے فرمایا کہ بس اس سے پتہ چلا کہ یہ سجدہ اسی ذات کے لئے ہے، یہ پیشانی کسی اور کے سامنے جھک نہیں سکتی، چاہے اس سجدہ میں کیسے ہی گندے شہوانی اور نفسانی خیالات کیوں نہ آرہے ہوں، لیکن یہ پیشانی اگر جھکے گی تو اسی کے در پر جھکے گی۔ لہذا یہ سجدہ اسی اللہ کے لئے ہے۔ اور اگر یہ فاسد خیالات غیر اختیاری طور پر آرہے ہیں تو انشاء اللہ یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑیں گے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے یہاں معاف ہیں۔

خیالات اور وساوس میں بھی حکمت ہے

دیکھئے! اگر ہم جیسے لوگوں کو نماز کے اندر یہ خیالات اور وساوس نہ آئیں بلکہ بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ نماز پڑھیں کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کا خیال ہی نہ آئے، اگر ہم جیسے لوگوں کو یہ مقام حاصل ہو جائے تو خدا جانے ہمارا دماغ تکبر، عجب اور خود پسندی میں کہاں پہنچ جائے گا۔ اور یہ سمجھ بیٹھیں گے کہ ہم تو بہت اعلیٰ مقام پر پہنچ گئے۔ کسی نے کہا ہے کہ صلی الحائک رکعتین وانتظر الوحی ایک جولاہے نے ایک مرتبہ دو رکعت نماز پڑھ لی تو نماز کے بعد اس انتظار

میں بیٹھ گیا کہ کب اللہ تعالیٰ کی طرف سے میرے اوپر وحی آتی ہے۔ اگر ہم میں سے بھی کسی کو خشوع و خضوع والی نماز حاصل ہو جائے تو خدا نخواستہ وہ پیغمبری کا یا مہدی ہونے کا دعویٰ نہ کر دے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ ظرف دیکھ کر یہ مقام عطا فرماتے ہیں۔ لہٰذا خیالات کے آنے میں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکمت اور مصلحت ہے۔

نیکی اور گناہ کے ارادے پر اجر و ثواب

بہر حال اس حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں دل کے خیالات پر مواخذہ نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی عجیب رحمت ہے کہ گناہ کے بارے میں تو یہ اصول مقرر فرما دیا کہ اگر گناہ کرنے کے بارے میں خیال آیا اور شوق پیدا ہوا اور دل میں تھوڑا سا ارادہ بھی کر لیا کہ یہ گناہ کر لو، البتہ عزم اور پختہ ارادہ کی حد تک نہیں پہنچا تو اس پر اللہ تعالیٰ کے یہاں کوئی پکڑ نہیں، بلکہ اگر بار بار گناہ کا خیال آتا رہا اور انسان اس خیال کو دفع کرتا رہا اور اس پر عمل نہیں کیا تو انشاء اللہ گناہ نہ کرنے پر اجر و ثواب ملے گا کیونکہ گناہ کا خیال آنے کے باوجود اس نے اپنے آپ کو گناہ سے بچا لیا۔ اور نیکی کے بارے میں یہ اصول مقرر فرمایا کہ اگر کسی نیکی کے بارے میں خیال آیا اور ارادہ کیا کہ فلاں نیکی کر لوں، اگرچہ اس نیکی کا پختہ ارادہ نہیں کیا تب بھی صرف ارادے پر اللہ تعالیٰ اجر و ثواب عطاء فرماتے ہیں، مثلاً یہ ارادہ کیا کہ اگر مجھے مال مل گیا تو اللہ تعالیٰ کی راہ میں اتنا مال صدقہ کروں گا تو اس پر بھی اس کو ثواب ملے گا۔ یا مثلاً یہ ارادہ کر لیا کہ جب جہاد فی سبیل اللہ کی نوبت آئے گی تو اللہ کے راستے میں جہاد کروں گا اور شہادت کا درجہ حاصل کروں گا تو اس کے بارے میں حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو بھی شہداء میں شمار فرماتے ہیں چنانچہ فرمایا:

﴿من سئل الشهادة بصدق قلبه كتب من الشهداء وان مات على فراشه﴾

یعنی اگر کوئی شخص سچے دل سے شہادت طلب کرے کہ اے اللہ! مجھے اپنے راستے میں شہادت کا مقام عطا فرمایئے تو اللہ تعالیٰ اس کو شہیدوں ہی میں شمار فرمائیں گے، چاہے بستر پر اس کو موت آئی ہو۔ بہرحال نیکی کے بارے میں قانون یہ ہے کہ پختہ ارادہ کرنے سے پہلے بھی اللہ تعالیٰ اجر و ثواب عطا فرماتے ہیں۔ اور گناہ کے اندر قانون یہ ہے کہ جب تک پختہ ارادہ نہ کرے اس وقت تک مؤاخذہ نہیں فرماتے، یہ رحمت کا معاملہ ہے۔

خیالات کی بہترین مثال

بہرحال گناہوں کے پختہ ارادہ کرنے سے بچنا چاہئے لیکن گناہوں کے جو وساوس اور خیالات آرہے ہیں ان کی پرواہ نہ کرے بلکہ اپنے کام میں لگا رہے، ان خیالات کی وجہ سے اپنے کام کو نہ چھوڑے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان خیالات کی مثال ایسی ہے کہ جیسے ایک شخص کو سربراہ وقت اور بادشاہ نے دعوت دی ہے اور بلایا ہے، اب یہ شخص جلدی میں بادشاہ سے ملاقات کرنے جارہا ہے، اب کوئی شخص اس کا دامن کھینچتا ہے اور کوئی اس کا ہاتھ پکڑتا ہے اور اس کو روک کر اس سے بات کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس طرح لوگ اس کو تنگ کررہے ہیں۔ اب بتایئے کیا یہ شخص ان راستہ روکنے والوں سے الجھنا شروع کردے گا یا اپنا سفر جاری رکھے گا؟ اگر یہ شخص راستہ روکنے والوں کے ساتھ الجھ گیا تو یہ شخص بادشاہ کے دربار میں کبھی نہیں پہنچ سکے گا۔ لیکن اگر اس نے یہ سوچا کہ یہ تو پاگل اور بیوقوف لوگ ہیں، میرے راستے میں رکاوٹ بن رہے ہیں، مجھے تو اس وقت بادشاہ کے پاس جانا ہے اور اس سے ملاقات کا اعزاز و شرف حاصل کرنا ہے تو وہ شخص ان کی طرف دھیان بھی نہیں دے گا۔

خیالات کا لانا گناہ ہے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو کسی نے خط میں لکھا کہ حضرت! جب میں نماز میں کھڑا ہوتا ہوں تو طرح طرح کے خیالات آتے رہتے ہیں اور اس کی وجہ سے پریشانی ہوتی ہے کہ میری نماز تو کچھ بھی نہیں۔ حضرت نے اس کے جواب میں لکھا کہ "خیالات کا آنا گناہ نہیں، خیالات کا لانا گناہ ہے" یعنی اگر وہ خیالات خود بخود آرہے ہیں تو یہ گناہ نہیں ہے، ہاں جان بوجھ کر ارادہ کر کے دل میں خیالات لا رہے ہیں تو یہ گناہ ہے۔

خیالات کا علاج

اور خیالات اور وساوس کا علاج ہی یہ ہے کہ ان خیالات کی طرف التفات اور توجہ مت کرو، جب توجہ نہیں کرو گے تو انشاء اللہ یہ خیالات خود بخود دور ہو جائیں گے۔ بس اپنا کام کئے جاؤ کہ جب نماز کی نیت باندھو تو اپنا ذہن نماز کی طرف لگاؤ۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مواعظ اور ملفوظات میں یہ نکتہ واضح کیا ہے کہ یہ نماز بذات خود مطلوب ہے، لہٰذا اگر غیر اختیاری طور پر خیالات آرہے ہیں تو اس کی وجہ سے نماز کی ناقدری مت کرو۔ نمازی اکثر یہ سوال کرتے ہیں کہ ہم نماز پڑھتے ہیں لیکن نماز میں مزہ ہی نہیں آتا، لطف ہی نہیں آتا، یا پہلے نماز میں بہت لطف اور مزہ آتا تھا اور اب وہ لطف آنا بند ہو گیا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ بھائی! یہ نماز اس لئے فرض نہیں کی گئی کہ اس میں تمہیں مزہ اور لطف آیا کرے۔ بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی عبادت اور بندگی کا ایک طریقہ ہے، اب اگر نماز میں مزہ آجائے تو یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے اور اگر مزہ نہ آئے تو اس کی وجہ سے نماز کی فضیلت میں ذرہ برابر کمی نہیں آئی۔ اگر تم نماز کے ارکان اور اس کی شرائط اور اس کے آداب پورے طور پر بجالا رہے ہو اور سنت کے مطابق نماز ادا کر رہے ہو تو پھر ساری عمر بھی

اگر مزہ نہ آئے تو اس میں تمہارا کوئی نقصان نہیں۔ اگر نماز میں مزہ آئے تو بھی نماز پڑھنی ہے، اگر مزہ نہ آئے تو بھی نماز پڑھنی ہے۔

دل نہ لگنے کے باوجود نماز پڑھنا

بلکہ اگر نماز میں مزہ نہیں آیا اور نماز پڑھنے میں مشقت محسوس ہوئی، لیکن اس کے باوجود تم نے نماز پڑھی تو اس پر تمہارے لئے زیادہ ثواب لکھا جائے گا۔ اس لئے کہ نماز پڑھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا بلکہ نفس شرارت کر رہا تھا لیکن تم نے زبردستی اللہ کی عبادت کی خاطر اور اس کی اطاعت کی خاطر نفس پر جبر کر کے نماز پڑھ لی تو انشاء اللہ اس نماز پر تمہیں ثواب زیادہ ملے گا۔ چنانچہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جس شخص کو ساری عمر بھی نماز میں مزہ نہ آئے لیکن پھر بھی نماز پڑھتا رہے، نماز کو چھوڑے نہیں، میں اس کو دو باتوں کی مبارک باد دیتا ہوں۔ ایک اس بات کی کہ جب اس کو نماز میں مزہ نہیں آیا لیکن اس کے باوجود وہ نماز پڑھتا رہا تو انشاء اللہ اس کے اجر میں اضافہ ہوگا اور اس کو ثواب زیادہ ملے گا۔ اور دوسرے اس پر کہ اگر اس کو نماز میں مزہ آتا تو یہ شبہ ہوتا کہ یہ شاید نفس کے مزے کی خاطر نماز پڑھ رہا ہے، لیکن جب نماز میں مزہ آیا ہی نہیں تو اب یہ شائبہ ختم ہو گیا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ یہ نماز صرف اللہ کے لئے پڑھ رہا ہے کیونکہ اس میں اخلاص زیادہ ہو گیا۔ اس کی وجہ سے اجر و ثواب میں اضافہ ہو جائے گا۔ اس لئے اس فکر میں مت پڑا کرو کہ مزہ آیا یا نہیں، لطف آیا یا نہیں۔

انسان عمل کا مکلّف ہے

لوگ خطوط میں لکھتے ہیں کہ ایک زمانہ وہ تھا کہ ہم پہلے نماز پڑھا کرتے تھے تو بڑی عجیب و غریب کیفیت ہوتی تھی۔ دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر ہو جاتے تھے اور اب لطف جاتا رہا اور وہ کیفیت باقی نہیں رہی، کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ شیطان نے

مجھے مردود بنا دیا ہے۔ خوب سمجھ لیں کہ یہ ساری کیفیات جو غیر اختیاری ہیں جس میں انسان کے اختیار کو دخل نہیں ہے، مزہ آیا یا نہیں، یہ انسان کے اختیار سے باہر ہے، مزہ آنا اور لطف آنا اور نہ آنا انسان کے اختیار میں نہیں اور انسان اس کا مکلف بھی نہیں۔ اس لئے کہ انسان تو عمل کا مکلف ہے، دیکھنا یہ ہے کہ عمل کیا یا نہیں؟ اور اگر عمل کیا تو دیکھنا یہ ہے کہ یہ عمل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق کیا یا نہیں؟ اگر اس طرح عمل کر لیا تو چاہے کوئی کیفیت حاصل ہوئی یا نہیں؟ تم عہدہ برا ہو گئے اور تمہارا وہ عمل مقبول ہو گیا۔ وجہ یہ ہے کہ یہ ساری کیفیات آنی جانی ہیں، نہ ان پر عمل کی قبولیت موقوف ہے اور نہ ہی ان پر نجات موقوف ہے۔ بس اگر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے عمل کی توفیق ہو رہی ہے تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے رہو۔

کیفیات نہ مقصود ہیں نہ اختیار میں ہیں

جو لوگ حج یا عمرہ پر حرمین شریفین جاتے ہیں، عام طور سے ان پر مختلف کیفیات طاری ہوتی ہیں، مثلاً یہ بات مشہور ہے کہ جب بیت اللہ پر پہلی نظر پڑتی ہے تو اس پر گریہ طاری ہو جاتا ہے یا ہنسی آجاتی ہے یا کوئی دوسری کیفیت طاری ہو جاتی ہے، اور جب ملتزم پر پہنچتے ہیں تو وہاں پر بھی رونا آتا ہے اور گریہ طاری ہو جاتا ہے، وغیرہ وغیرہ، تو یہ سب کیفیات پیدا ہوتی ہیں لیکن یہ کیفیات غیر اختیاری ہیں۔ اگر حاصل ہو جائیں تو یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہیں اور اگر حاصل نہ ہوں تو اس پر گھبرانے اور پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ چنانچہ بعض لوگ صرف اس وجہ سے پریشان ہو جاتے ہیں کہ ہم عمرہ کرنے یا حج کرنے گئے، وہاں تو ہمارا دل پتھر ہو گیا، نہ تو ہمیں رونا آیا، نہ ہم پر گریہ طاری ہوا، نہ آنسو نکلے اور نہ ہی کوئی اور کیفیت طاری ہوئی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اوپر مردودیت غالب ہو گئی ہے اور ہم پر شیطانی اثرات غالب آگئے، وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے خیالات دل میں آتے ہیں۔ یاد رکھیے! اللہ

تعالیٰ تمہیں اس بنیاد پر راندہ درگاہ نہیں کریں گے کہ تمہیں غیر اختیاری طور پر رونا کیوں نہیں آیا؟ اور نہ اس بات پر گرفت کریں گے۔ بشرطیکہ عمل صحیح ہو اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت کے مطابق ہو تو پھر رونا آئے یا نہ آئے، کیفیت طاری ہو یا نہ ہو لیکن انشاء اللہ، اللہ تعالیٰ کے یہاں وہ حج و عمرہ مقبول ہے اور موجب اجر ہے۔

عمل سُنّت کے مطابق ہونا چاہئے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی وضاحت کے ساتھ یہ بات ارشاد فرمائی ہے کہ کیفیات پر مدار نہیں، بلکہ عمل پر مدار ہے۔ اگر عمل سُنّت کے مطابق ہے تو انشاء اللہ منزل پر پہنچ جاؤ گے۔

بر صراط مستقیم اے دل کسے گمراہ نیست

یعنی اگر صراط مستقیم پر تمہارا قدم ہے تو اے دل! پھر تم گمراہ نہیں ہو سکتے، چاہے خیالات اور وسوسے کسی طرح کے آرہے ہوں، کیفیات طاری ہو رہی ہوں یا نہ ہو رہی ہوں، چاہے لذت آرہی ہو یا نہ آرہی ہو۔

ایک ریٹائرڈ شخص کی نماز

میرے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب قدس اللہ سرہ۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، آمین۔ ایک دن فرمانے لگے کہ ایک شخص ریٹائرڈ زندگی گزار رہا ہے، کھانے پینے کو سب کچھ میسر ہے، بینک بیلنس موجود ہے، معاش کی اور دنیا کمانے کی کوئی فکر نہیں ہے۔ نہ اس کو ملازمت پر جانا ہے، نہ اس کو تجارت کرنی ہے، نہ دکان کھولنی ہے۔ اس کا معمول یہ ہے کہ جیسے ہی کسی نماز کی اذان ہوئی تو اذان ہوتے ہی وہ گھر سے نکل گیا، مسجد میں پہنچ کر بہت اطمینان سے اچھے طریقے سے وضو

کیا اور پھر تحیۃ المسجد کی دو رکعت ادا کیں اور پھر سنتیں ادا کیں اور پھر جماعت کے انتظار میں بیٹھا ذکر کرتا رہا، جب جماعت کھڑی ہوئی تو اس نے خشوع اور خضوع کے ساتھ نماز ادا کی، اس کا دل اور دماغ سب نماز کی طرف متوجہ ہیں، جب وہ تلاوت کرتا ہے تو اس میں اس کو لطف آتا ہے۔ جب ذکر کرتا ہے تو اس میں لطف آتا ہے، رکوع میں بھی اور سجدے میں بھی لطف آرہا ہے، اس طرح پوری نماز بہت سکون اور اطمینان کے ساتھ ادا کی، پھر بعد کی سنتیں ادا کیں، اور پھر اطمینان سے دل لگا کر دعا کی، پھر واپس گھر آگیا، اور پھر دوسری نماز کے انتظار میں دل لگا ہوا ہے کہ کب آذان ہو اور کب مسجد جاؤں۔ ایک آدمی تو یہ ہے۔

ٹھیلہ لگانے والے کی نماز

دوسرا شخص بیوی بچوں والا ہے، اس کے اوپر ہزار طرح کی ذمہ داریاں اور حقوق ہیں۔ ان حقوق کی ادائیگی کے لئے اور اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے ٹھیلہ لگاتا ہے اور آواز لگا لگا کر سامان فروخت کرتا ہے۔ اب لوگ اس کے ٹھیلے کے ارد گرد کھڑے ہوئے سامان خرید رہے ہیں، اتنے میں آذان ہو گئی، اب وہ جلدی جلدی لوگوں کو نمٹانے کی کوشش کر رہا ہے، حتی کہ جماعت کا وقت آگیا۔ تو اس نے جلدی سے اپنا ٹھیلا ایک طرف کیا اور اس کے اوپر کپڑا ڈالا اور بھاگتے ہوئے مسجد میں پہنچا، جلدی جلدی وضو کیا اور جاکر امام کے پیچھے کھڑا ہو گیا اور جلدی سے نیت باندھ لی۔ اب اس کا دل کہیں دماغ کہیں۔ ٹھیلے کی فکر لگی ہوئی ہے۔ اور گاہکوں کی فکر لگی ہوئی ہے۔ لیکن ان سب کے باوجود اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہو گیا، اور جماعت سے نماز ادا کی، پھر سنتیں ادا کیں اور جلدی سے جاکر دوبارہ ٹھیلا لگا کر کھڑا ہو گیا۔ یہ دوسرا آدمی ہے۔

کس نماز میں روحانیت زیادہ ہے؟

پھر فرمایا کہ بتاؤ ان دونوں میں سے کس کی نماز روحانیت سے زیادہ قریب ہے؟ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے شخص کی نماز میں روحانیت زیادہ ہے، اس لئے کہ وہ آذان کے وقت گھر سے نکلا، مسجد میں آکر اطمینان سے وضو کیا، تحیۃ المسجد پڑھی، سنتیں پڑھیں اور اطمینان اور خشوع و خضوع کے ساتھ نماز ادا کی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس دوسرے آدمی کی نماز روحانیت کے زیادہ قریب ہے۔ اگرچہ اس نے حواس باختگی کی حالت میں نماز پڑھی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ پہلے شخص کے اوپر کوئی ذمہ داری نہیں تھی اور اس کے اوپر کوئی فکرات نہیں تھے۔ اس نے اپنے آپ کو ہر ذمہ داری سے فارغ کر لیا تھا۔ اور اس کے نتیجے میں اس کو نماز میں بہت لذت بھی آرہی تھی اور لطف بھی آرہا تھا۔ لیکن یہ دوسرا شخص اپنا وہ ٹھیلہ چھوڑ کر آرہا ہے جس ٹھیلہ پر اس کی اپنی معیشت اور اس کے گھر والوں کی معیشت موقوف ہے، لیکن جب اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضری کا وقت آگیا تو وہ ٹھیلہ اس کو اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہونے سے غافل نہیں کرسکا، اس ٹھیلے کو چھوڑ کر جماعت میں آکر کھڑا ہو گیا اور نماز ادا کرلی۔ اس شخص کا عمل زیادہ مشقت والا اور زیادہ مقبول اور زیادہ موجب اجر ہے۔ اگرچہ اس کے اوپر کیفیت طاری نہیں ہوئی اور نہ اس کو لذت آئی لیکن اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ اس کے اجر و ثواب میں کمی نہیں کریں گے۔ انشاء اللہ۔

مایوس مت ہو جاؤ

آج کل لوگ عام طور پر غیر اختیاری امور کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور اس کی وجہ سے پریشان اور مایوس ہو جاتے ہیں۔ اور پھر مایوسی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بالآخر شیطان وہ عمل چھڑوا دیتا ہے۔ شیطان اس کو یہ سکھاتا ہے کہ جب تیری نماز کسی

قابل نہیں ہے تو پڑھنے سے کیا فائدہ؟ اس گمراہی میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اس لئے غیر اختیاری امور کے پیچھے مت پڑو۔ اور نماز پڑھنے کا جو طریقہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھا دیا بس اسی طریقے سے نماز پڑھنے کی فکر کرو اور اپنی طرف سے دھیان نماز کی طرف لگانے کی کوشش کرتے رہو، اس کے بعد اگر کیفیت طاری ہو یا نہ ہو، نماز میں لذت آئے یا نہ آئے، اس سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں وہ نماز مقبول ہے۔

وسوسوں پر خوش ہونا چاہئے

بہر حال اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بتادیا کہ یہ وسوسے ایمان کی علامت ہیں اور اللہ تعالیٰ نے دل میں وسوسوں کے آنے کو کوئی گناہ قرار نہیں دیا۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کی جو تشریح کی ہے وہ یہ کہ "ان دونوں حدیثوں میں امور غیر اختیاریہ پر مؤاخذہ نہ ہونا مذکور ہے۔ بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ ان حدیثوں میں وساوس پر مسرور ہونے کی طرف اشارہ ہے"۔ یعنی اگر دل میں وسوسے آرہے ہیں مگر ان وسوسوں پر عمل نہیں ہو رہا ہے تو ان وسوسوں پر خوش ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ یہ وسوسے تمہارے ایمان کی علامت ہیں، کسی کافر کے دل میں یہ وسوسے نہیں آتے بلکہ صاحب ایمان کے دل میں وسوسے آتے ہیں۔ اس لئے تم ان پر خوش ہو جاؤ۔ پھر آگے فرمایا کہ ان وسوسوں سے نجات کی یہی تدبیر ہے کہ ان کی کچھ پروا نہ کرے بلکہ ان پر خوش ہو۔ ایک بزرگ کا قول ہے کہ "شیطان کو مؤمن کی خوشی گوارہ نہیں۔ جب شیطان مؤمن کو وساوس پر خوش ہوتا ہوا دیکھے گا تو وسوسے ڈالنا چھوڑ دے گا"۔

وسوسہ کی تعریف

البتہ یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ وسوسہ وہ ہے جو خود بخود دل میں آجائے، لیکن

اپنی طرف سے سوچ کر وسوسہ لانا یا گناہ کا تصور کرنا یا گناہ کا ارادہ دل میں لانا، یہ وسوسہ نہیں ہے بلکہ خود ایک عمل ہے، اور یہ عمل بکثرت خود گناہ ہوتا ہے۔ لہذا اپنی طرف سے سوچ کر قصد اور ارادہ کر کے وسوسہ نہ لائے اور جو وسوسہ خود بخود آجائے اس کی پرواہ نہ کرے۔

خیالات سے بچنے کا دوسرا علاج

اور یہ خیالات اور وسوسے جو انسان قصد اور ارادہ کر کے دل میں لاتا ہے، اس سے بچنے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ جب کبھی اس قسم کا خیال دل میں پیدا ہو، اس وقت اپنے آپ کو کسی اور کام میں لگالے۔ اس لئے کہ یہ وسوسے اس طرح دور نہیں ہوتے کہ آدمی لاٹھی لے کر ان کے پیچھے پڑ جائے، بلکہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو کسی اور کام میں لگالے، کسی اور مشغلے میں اپنے آپ کو مشغول کردے۔ اس کے لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دعا تلقین فرمائی ہے وہ دعا بکثرت کیا کرے، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہم سب کے حق میں وہ دعا قبول فرمالے، آمین۔ وہ دعا یہ ہے:

﴿اللھم اجعل وساوس قلبی خشیتک وذکرک واجعل ھمتی وھوای فیما تحب وترضی﴾

کیا عجیب و غریب دعا ہے۔ آپ ایسی ایسی دعائیں تلقین فرما گئے کہ انسان ان کا تصور نہیں کر سکتا۔ یعنی اے اللہ! میرے دل میں آنے والے خیالات کو اپنی خشیت اور اپنے ذکر میں تبدیل فرما دیجئے۔ انسان کی خاصیت یہ ہے کہ اس کا دماغ کبھی بھی خیالات سے خالی نہیں ہوتا، کوئی نہ کوئی خیال اس کے ذہن میں ہر وقت رہتا ہے، مثلاً ہاتھوں سے کام کر رہا ہے، لیکن دماغ کہیں اور لگا ہوا ہے اور خیالات مسلسل آرہے ہیں، کوئی لمحہ خیالات سے خالی نہیں ہوتا۔ لہذا یہ دعا کرو کہ یہ جو فضول خیالات آرہے ہیں جن کا کوئی فائدہ نہیں ہے، یا اللہ! یہ خیالات بدل کر آپ

ہے ذکر اور آپ کی خشیت میں تبدیل ہو جائیں۔ جو خیال بھی آئے وہ یا تو آپ کا ہو یا آپ کی خشیت کا ہو، آپ کی یاد کا ہو، آپ کے سامنے حاضر ہونے کا ہو، آپ کی جنت کی نعمتوں کا ہو، دوزخ کے عذاب کا ہو اور آپ کے دین کے احکام کا خیال ہو۔ اور اے اللہ! میرے دل کے خیالات اور میری خواہشات کا رخ موڑ کر ان چیزوں کی طرف کر دیجئے جو آپ کو پسند ہوں اور دل صرف اس چیز کی طرف مائل ہو جو آپ کو پسند ہو۔ یہ دعا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تلقین فرمائی۔ اللہ تعالیٰ اس دعا کو ہم سب کے حق میں قبول فرمالے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

گناہوں کے نقصانات

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

تاریخ خطاب : ۶؍مئی ۱۹۹۴ء

مقام خطاب : جامع مسجد بیت المکرم
گلشن اقبال کراچی

وقت خطاب : بعد نماز عصر تا مغرب

اصلاحی خطبات : جلد نمبر 9

بسم اللہ الرحمن الرحیم

گناہوں کے نقصانات

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ و نؤمن بہ ونتوکل علیہ، ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا، من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ، ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ، ونشھد ان سیدنا وسندنا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ، صلی اللہ تعالٰی علیہ وعلٰی آلہ واصحابہ وبارک وسلم تسلیماً کثیراً کثیرا۔

اما بعد!

﴿عن ابن عباس رضی اللہ تعالٰی عنھما انہ قال لہ رجل: رجل قلیل العمل قلیل الذنوب اعجب الیک او رجل کثیر العمل کثیر الذنوب قال لا اعدل بالسلامۃ﴾

(کتاب الزہد لابن مبارک، باب ماجاء فی تخویف عواقب الذنوب)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی تھے۔ اس لئے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے اور یہ حضرت عبد اللہ بن عباس ان کے بیٹے تھے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں یہ بہت کم عمر تھے، جب حضور اقدس

صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا تو اس وقت ان کی عمر تقریباً دس سال تھی لیکن کم سنی کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان کو علم کا بہت اونچا مرتبہ عطا فرمایا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حق میں دعا فرمائی کہ "اللھم علمہ الکتاب وفقھہ فی الدین" اے اللہ! ان کو قرآن کریم کا علم عطا فرما اور دین میں ان کو سمجھ عطا فرما۔ اگرچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے وقت ان کی عمر صرف دس سال تھی، اب دس سال کی عمر ہی کیا ہوتی ہے، لیکن ایک طرف تو انہوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کی باتیں اپنے دل و دماغ پر نقش کی ہوئی تھیں۔ پھر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد انہوں نے سوچا کہ اب تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے تشریف لے جا چکے ہیں، لیکن بڑے بڑے صحابہ کرام ابھی تشریف فرما ہیں، میں ان کی خدمت میں جا کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور آپ کی احادیث حاصل کروں۔ چنانچہ یہ صحابۂ کرام کے پاس جاتے اور ان کے پاس جانے کے لئے سفر کرتے اور مشقتیں اٹھاتے، اور اس طرح انہوں نے بڑے بڑے صحابہ کرام سے علم حاصل کیا اور اس مقام پر پہنچے کہ آج انہیں "امام المفسرین" کہا جاتا ہے۔ یعنی تمام مفسرین کے امام۔ اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دعا دے دی تھی کہ اے اللہ! ان کو کتاب اللہ کا علم عطا فرما۔ آج تفسیر قرآن کے باب میں ان سے زیادہ قابل اعتماد بات کسی کی نہیں۔ یہ انہی کا قول ہے جو میں نے آپ کے سامنے پڑھا۔

پسندیدہ شخص کون ہے؟

وہ یہ کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے پوچھا کہ یہ بتایئے کہ ایک شخص عمل تو کم کرتا ہے یعنی نفلی عبادات اور نفل نماز بہت زیادہ نہیں پڑھتا، زیادہ تر فرائض و واجبات پر اکتفا کرتا ہے، نفلی عبادات، ذکر

واذکار، وظائف اور تسبیحات زیادہ نہیں کرتا، لیکن اس کے گناہ بھی کم ہیں، ایسا شخص آپ کو زیادہ پسند ہوگا؟ یا آپ کو وہ شخص زیادہ پسند ہوگا جس کی نفلی عبادتیں بھی زیادہ ہیں اور گناہ بھی زیادہ ہیں؟ مثلاً تہجد کی نماز بھی پڑھتا ہے، اشراق کی نماز بھی پڑھتا ہے، اوابین بھی پڑھتا ہے، تلاوت بھی خوب کرتا ہے، وظائف اور تسبیحات بھی خوب کرتا ہے، لیکن ساتھ میں گناہ بھی بہت کرتا ہے۔ آپ کے نزدیک ان دونوں میں سے کون بہتر ہے؟ پہلے شخص کا عمل کم مگر گناہ بھی کم، دوسرے شخص کے اعمال زیادہ مگر گناہ بھی زیادہ۔ جواب میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ گناہوں سے حفاظت کے برابر میں کسی چیز کو نہیں سمجھتا۔ یعنی آدمی گناہوں سے محفوظ ہوجائے، یہ اتنی بڑی نعمت اور اتنا بڑا فائدہ ہے کہ دنیا کا کوئی عمل اس کے برابر نہیں۔ اگر ایک شخص گناہوں سے بچنے کا اہتمام کرے تو نفلی عبادات اس کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔

اصل چیز گناہوں سے پرہیز ہے

اس حدیث سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ یہ جتنی نفلی عبادات ہیں، یہ اپنی جگہ پر بڑی فضیلت کی چیزیں ہیں، لیکن ان نفلی عبادات کے بھروسے پر اگر انسان یہ سوچے کہ میں تو نفلی عبادتیں بہت کرتا ہوں اور پھر اس کے نتیجے میں گناہوں سے پرہیز نہ کرے تو یہ بڑے دھوکے کی بات ہے۔ اصل چیز یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی کے اندر گناہوں سے پرہیز کرنے کی فکر کرے، گناہوں سے پرہیز کرنے کے بعد بالفرض اگر اس کو زیادہ نفلی عبادات کرنے کا موقع نہیں ملا تو اس صورت میں اس کا کوئی گھاٹا اور نقصان نہیں، اللہ تعالیٰ کے یہاں انشاء اللہ وہ نجات پاجائے گا، لیکن اگر نفلی عبادتیں تو خوب کرتا ہے اور ساتھ میں گناہ بھی بہت کرتا ہے تو اس کی نجات کی کوئی ضمانت نہیں، کیونکہ یہ بڑا خطرناک معاملہ ہے۔

گناہ چھوڑنے کی فکر نہیں

آج کل ہمارے معاشرے میں یہ دھیان بہت کم ہوگیا ہے، جب کسی کے دل میں دین پر چلنے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی توفیق ہوتی ہے تو اس کو یہ فکر ہوتی ہے کہ مجھے کچھ وظائف بتادیے جائیں، کچھ معمولات سکھا دیے جائیں، اور اوراد واذکار تلقین کردیے جائیں اور یہ بتایا جائے کہ نفلی عبادت کیسے کروں اور کس وقت کروں۔ بس چند ظاہری معمولات کی طرف توجہ ہوجاتی ہے اور پھر ان معمولات کو پورا کرنے میں دن رات لگا رہتا ہے، لیکن اس کو یہ فکر نہیں ہوتی کہ میری صبح سے شام تک کی زندگی میں کتنے کام گناہ کے ہورہے ہیں؟ اور کتنے کام اللہ کی مرضی کے خلاف ہورہے ہیں۔ اچھے خاصے پڑھے لکھے دیندار لوگوں کو دیکھا کہ وہ صف اوّل کے پابند ہیں، مسجد میں پابندی سے جماعت کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں۔ وظائف و اوراد کے پابند ہیں، نفلی عبادتیں اور تہجد اور اشراق کی نمازیں بھی بڑی پابندی سے پڑھتے ہیں، لیکن ان کو اس کی فکر نہیں کہ گھر کے اندر جو گناہوں کا بازار گرم ہے، اس کو کس طرح ٹھیک کیا جائے؟ اور جب بازار جاتے ہیں تو وہاں پر حلال و حرام کی فکر نہیں ہوتی، جب گفتگو کرتے ہیں تو غیبت اور جھوٹ کی فکر نہیں کرتے۔ اگر ان کے گھر میں ناجائز اور حرام چیزیں موجود ہیں تو ان کو باہر نکالنے کی کوئی فکر نہیں ہے۔ گھر میں فلمیں دیکھی جارہی ہیں۔ ناجائز پروگرام دیکھے جارہے ہیں۔ گانا بجانا ہورہا ہے۔ اس کی طرف کوئی دھیان نہیں۔ البتہ وظائف کی طرف دھیان ہے کہ کوئی وظیفہ بتادو۔ حالانکہ یہ گناہ انسان کے لئے مہلک ہیں، ان سے بچنے کی فکر پہلے کرنی چاہئے۔

نفلی عبادات اور گناہوں کی بہترین مثال

اس کی مثال یوں سمجھیں کہ یہ جتنی نفلی عبادتیں ہیں، چاہے وہ نفلی نماز ہو،

تلاوت ہو، یا ذکر و تسبیح ہو، یہ سب ٹانک ہیں، اس سے قوت حاصل ہوتی ہے۔ جیسے کوئی شخص جسم کی طاقت کے لئے کوئی ٹانک استعمال کرے۔ اور یہ گناہ زہر ہیں۔ اب اگر ایک شخص ٹانک بھی خوب کھائے اور زہر بھی خوب کھائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ٹانک اس کے اوپر اثر نہیں کرے گا، البتہ زہر اثر کر جائے گا اور اس شخص کی تباہی کا ذریعہ بن جائے گا۔ اور ایک شخص وہ ہے جو کوئی ٹانک اور طاقت کی دوا تو استعمال نہیں کرتا، صرف دال روٹی پر اکتفا کرتا ہے، لیکن جو چیزیں صحت کے لئے مضر ہیں، ان سے پرہیز کرتا ہے، تو یہ آدمی صحت مند رہے گا، باوجود یہ کہ یہ ٹانک نہیں کھاتا۔ پہلا شخص جو ٹانک بھی کھاتا ہے اور ساتھ میں مضر صحت چیزوں سے پرہیز نہیں کرتا، یہ لازماً بیمار پڑ جائے گا اور ایک دن ہلاک ہو جائے گا۔ نفلی عبادات اور گناہوں کی بالکل یہ مثال ہے۔ لہٰذا یہ فکر ہونی چاہئے کہ ہماری صبح سے لے کر شام تک کی زندگی سے گناہ نکل جائیں، منکرات اور معصیتیں نکل جائیں۔ جب تک یہ چیزیں نہیں نکلیں گی، اس وقت تک یہ نفلی عبادات ہمارے حق میں مفید نہیں ہو سکتیں۔

طالبین اصلاح کے لئے پہلا کام

آج تو معمول یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی شیخ کے پاس اصلاحی تعلق قائم کرنے جاتا ہے تو وہ شیخ اس کو اسی وقت یہ بتا دیتا ہے کہ تم یہ معمولات انجام دیا کرو، اتنا ذکر کیا کرو، اتنی تسبیحات پڑھا کرو۔ لیکن حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا معمول یہ تھا کہ جب ان کے پاس کوئی شخص اپنی اصلاح کی غرض سے آتا تو اس کو ذکر واذکار اور تسبیحات وغیرہ کچھ نہ بتاتے۔ بلکہ سب سے پہلے اس سے یہ فرماتے کہ گناہوں کو چھوڑو۔ چنانچہ اس راہ میں سب سے پہلا کام تکمیل توبہ کا ہے۔ یعنی سب سے پہلے انسان اپنے تمام گناہوں سے توبہ کرے کہ یا اللہ! جو گناہ مجھ سے پہلے ہو چکے ہیں، اپنی رحمت سے ان کو معاف فرما

دیجئے اور آئندہ کے لئے عزم کرتا ہوں کہ میں آئندہ یہ گناہ نہیں کروں گا۔ پھر آئندہ کے لئے گناہوں سے بچنے کا اہتمام کرے۔ پھر یہ نہیں کہ بس صرف چند مشہور گناہوں سے بچنے کا اہتمام کرلیا، بلکہ ہر گناہ گناہ ہے، ہر ایک گناہ سے بچنے کا اہتمام کرے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وذروا ظاهر الاثم وباطنه﴾

"یعنی ظاہر کے گناہ بھی چھوڑو اور باطن کے گناہ بھی چھوڑو"۔

آگے ارشاد فرمایا:

﴿ان الذين يكسبون الاثم سيجزون بما كانوا يقترفون﴾ (سورۃ الانعام: ۱۲۰)

"یعنی جو لوگ گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں، قیامت کے روز ان کے ان اعمال کی سزا دی جائے گی جو وہ لوگ یہاں پر کیا کرتے تھے"۔

ہر قسم کے گناہ چھوڑ دو

لہٰذا کوئی گناہ ایسا نہیں ہے جسکی طرف سے بے توجہی برتی جائے، نہ ظاہر کا گناہ اور نہ باطن کا گناہ۔ یہ نہ ہو کہ چند موٹے موٹے گناہ تو چھوڑ دیے، اور باقی گناہوں کے چھوڑنے کی طرف کوئی توجہ نہیں ہے مثلاً مجلسوں میں غیبت ہو رہی ہے، دل آزاری ہو رہی ہے، دوسروں کو تکلیف پہنچائی جارہی ہے، یا دوسروں سے حسد اور بغض ہو رہا ہے، یا دل میں تکبر بھرا ہوا ہے، مال کی محبت، جاہ کی محبت، دنیا کی محبت دل میں بھری ہوئی ہے۔ پھر تو گناہ چھوڑنا نہ ہوا۔ ہر وہ کام جس کو اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے گناہ قرار دیا ہے، ان کو چھوڑنا ہوگا، اس کی فکر انسان کو ہونی چاہئے۔

بیوی بچوں کو گناہ سے بچاؤ

ایک بات اور عرض کر دوں کہ یہ گناہ اس وقت تک چھوٹ نہیں سکتے جب تک انسان اپنے ماحول کی درستی کی فکر نہ کرے، کوئی شخص اگر یہ چاہے کہ میں گناہوں سے محفوظ ہو جاؤں اور بیوی بچے غلط راستے پر جارہے ہیں، ان کی طرف کوئی دھیان اور توجہ نہ کرے۔ یاد رکھئے! اس طرز عمل سے کبھی بھی گناہ نہیں چھوٹ سکتے۔ اگر تم گناہ سے بچنے کی کتنی بھی کوشش کر لو لیکن اگر گھر کا ماحول خراب ہے اور بیوی بچے غلط راستے پر جارہے ہیں، اور تمہیں ان کی فکر نہیں تو وہ بیوی بچے ایک نہ ایک دن تمہیں ضرور گناہ کے اندر مبتلا کردیں گے۔ اس لئے انسان کے لئے خود گناہوں سے بچنا جتنا ضروری ہے، اتنا ہی بیوی بچوں کو بھی بچانا ضروری ہے۔ اور ہر وقت دھیان اور فکر ہونی چاہئے کہ بیوی بچے کسی وقت گناہ کے اندر مبتلا نہ ہو جائیں۔

خواتین کے کردار کی اہمیت

اس معاملے میں خواتین کا کردار بہت اہمیت رکھتا ہے، اگر خواتین کے دل میں یہ فکر پیدا ہو جائے کہ ہمیں اپنی زندگی اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کام کے مطابق گزارنی ہے اور گناہوں سے بچنا ہے تو پورے گھروں کا ماحول درست ہو جائے، اس لئے کہ عورت گھر کی بنیاد ہوتی ہے، اگر عورت کے دل میں اللہ کی اطاعت اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا داعیہ اور جذبہ پیدا ہو جائے تو پورا گھر سنور جائے۔ لیکن اگر عورت کا یہ حال ہو کہ اس کو پردے کی کوئی فکر نہیں ہے، سر کھلا ہوا ہے، بال کھلے ہوئے ہیں، فواحش کے اندر ذہن لگا ہوا ہے، اور فضولیات میں منہمک ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ گھر کا ماحول خراب ہو گا۔ اس لئے خواتین پر یہ ذمہ داری زیادہ عائد ہوتی ہے کہ وہ گناہوں کے کاموں کو چھوڑ

دیں۔

نافرمانی اور گناہ کیا چیز ہیں؟

یہ گناہ کیا چیز ہیں؟ اور گناہوں کے عواقب اور انجام کیا ہوتے ہیں؟ پہلے اس کو سمجھنا ضروری ہے۔ گناہ کے معنی ہیں "نافرمانی" مثلاً تمہارے ایک بڑے نے تمہیں حکم دیا کہ یہ کام اس طرح کرو اور تم کہو کہ میں یہ کام نہیں کرتا، یا بڑے نے کہا کہ اس بات سے اور اس کام سے بچو اور تم کہو کہ میں یہ کام ضرور کروں گا۔ یہ بڑے کی بات نہ ماننا "نافرمانی" کہلاتا ہے اگر یہ "نافرمانی" اللہ تعالیٰ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے ساتھ کی جائے تو اسی کا نام "گناہ" ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے اثرات اتنے دور رس اور اتنے خراب اور بُرے ہیں کہ ان کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔

گناہ کی پہلی خرابی "احسان فراموشی"

گناہ کی سب سے پہلی خرابی "احسان فراموشی" ہے، اس لئے کہ جس محسن نے انسان کو وجود بخشا ہے اور ہر وقت انسان اس کی نعمتوں میں غرق ہے، سر سے لے کر پاؤں تک اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اس کے اوپر مبذول ہیں۔ جسم کے ایک ایک عضو کو لے کر اندازہ کرو کہ اس کی کتنی قیمت اور کتنی اہمیت ہے۔ چونکہ یہ نعمتیں مفت ملی ہوئی ہیں اس لئے دل میں ان کی کوئی وقعت اور قدر نہیں۔ خدا نخواستہ اگر کسی وقت ان اعضاء میں سے کسی ایک عضو کو بھی نقصان پہنچ جائے، تب پتہ چلے کہ یہ کتنی بڑی نعمت ہے اور یہ نقصان کتنا بڑا نقصان ہے۔ یہ آنکھ کتنی بڑی نعمت ہے۔ یہ کان کتنی بڑی نعمت ہے۔ یہ زبان کتنی بڑی نعمت ہے۔ یہ صحت کتنی بڑی نعمت ہے۔ یہ رزق جو صبح شام کھانے کے لئے اللہ تعالیٰ عطا فرما رہے ہیں یہ کتنی بڑی نعمت ہے۔ تو جس عظیم محسن اور منعم کی نعمتوں نے ہمیں ڈھانپ لیا ہے، اس کا

صرف یہ کہنا ہے کہ تم لوگ صرف چند باتوں سے پرہیز کرلو اور باز آجاؤ۔ لیکن تم سے اتنا چھوٹا سا کام نہیں ہوتا۔ لہٰذا "گناہ" کی سب سے پہلی خرابی احسان فراموشی، ناشکری اور محسن کا حق ادا نہ کرنا ہے۔

گناہ کی دوسری خرابی "دل پر زنگ لگنا"

"گناہ" کی دوسری خرابی یہ ہے کہ حدیث شریف میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب انسان پہلی مرتبہ گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ لگا دیا جاتا ہے۔ اس نقطے کی حقیقت کیا ہے اس کو تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں۔ اور جب دوسرا گناہ کرتا ہے تو دوسرا نقطہ لگا دیا جاتا ہے، جب تیسرا گناہ کرتا ہے تو تیسرا نقطہ لگا دیا جاتا ہے، اگر اس دوران وہ توبہ کرلے تو یہ نقطے مٹا دیے جاتے ہیں، لیکن اگر وہ توبہ نہ کرے بلکہ مسلسل گناہ کرتا رہے اور گناہ کرتا ہی چلا جائے تو آہستہ آہستہ وہ سیاہ نقطے اس کے پورے دل کو گھیر لیتے ہیں اور پھر وہ نقطے زنگ کی صورت اختیار کرلیتے ہیں اور دل کو زنگ لگ جاتا ہے، اور جب دل کو زنگ لگ جاتا ہے تو اس کے بعد اس کے اندر حق بات ماننے کی صلاحیت ہی نہیں رہتی، پھر اس پر غفلت کا وہ عالم طاری ہوتا ہے کہ پھر گناہ کے گناہ ہونے کا احساس مٹ جاتا ہے اور گناہوں کے مفاسد کا ادراک اور احساس ختم ہوجاتا ہے، گویا کہ انسان کی عقل ماری جاتی ہے۔

گناہ کے تصور میں مؤمن اور فاسق کا فرق

ایک روایت میں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ وہ مؤمن جو ابتک گناہ کا عادی نہیں ہے وہ گناہ کو ایسا سمجھتا ہے جیسے پہاڑ اس کے سر پر ٹوٹنے والا ہے، اور فاسق وفاجر گناہ کو اتنا ہلکا اور معمولی سمجھتا ہے جیسے کوئی مکھی ناک پر آکر بیٹھ گئی اور اس نے ہاتھ مار کر اس کو اڑا دیا۔ یعنی وہ گناہ کو بہت معمولی سمجھتا

ہے اور اس کے کرنے کے بعد اس پر اس کو کوئی ندامت اور شرمندگی نہیں ہوتی۔ لیکن ایک مؤمن جس کو اللہ تعالیٰ نے ایمان کی برکات عطا فرمائی ہیں وہ گناہ کو ایک پہاڑ تصور کرتا ہے، اگر غلطی سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو اس کے سر پر ایک پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے، جس کے نتیجے میں وہ غم اور صدمہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

نیکی چھوٹنے پر مؤمن کا حال

گناہ تو دور کی بات ہے اگر ایک مؤمن کو نیکی کرنے کا موقع ملے مگر وہ موقع ہاتھ سے نکل جائے تو اس کی وجہ سے بھی اس پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے کہ ہائے مجھے نیکی کرنے کا یہ موقع ملا تھا مگر افسوس کہ مجھ سے یہ موقع چھوٹ گیا۔ اسی کے بارے میں مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؂

بر دل سالک ہزاراں غم بود
گر زباغ دل خلالے کم بود

اگر سالک کے دل کے باغ میں سے ایک تنکا بھی کم ہو جائے یعنی نیکی کرنے کے مواقع ملے تھے مگر ان میں سے کسی وقت ایک نیکی نہ کر سکا تو اس وقت سالک کے دل پر غم کے ہزارہا پہاڑ ٹوٹ پڑتے ہیں کہ افسوس مجھ سے یہ نیکی چھوٹ گئی۔ جب نیکی چھوٹنے پر اتنا صدمہ ہوتا ہے تو گناہ سرزد ہو جانے پر کیا صدمہ نہیں ہوگا؟ بلکہ اس سے کہیں زیادہ صدمہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اس حالت سے بچائے کہ جب گناہوں کی وجہ سے دل پر نقطے لگتے چلے جاتے ہیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ گناہ کو اتنا معمولی سمجھتا ہے جیسے مکھی ناک پر آکر بیٹھی اور اس کو اڑا دیا اور اس گناہ پر کوئی صدمہ اور غم ہی نہیں ہوتا۔ بہر حال گناہوں کی ایک خرابی یہ ہے کہ وہ انسان کو غافل بنا دیتے ہیں اور اس کے ذریعہ دل پر پردے پڑ جاتے ہیں۔

گناہ کی تیسری خرابی "ظلمت اور تاریکی"

چونکہ ہم لوگ گناہ کے ماحول کے عادی ہو چکے ہیں، اس وجہ سے ان گناہوں کی ظلمت اور کراہیت دلوں سے مٹ چکی ہے، ورنہ ہر گناہ میں ایسی ظلمت اور ایسی کراہیت ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ صحیح ایمان کامل عطا فرمائے تو انسان اس ظلمت اور کراہیت کو برداشت نہ کر سکے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ غلطی سے کسی موقع پر حرام آمدنی کا ایک لقمہ منہ میں چلا گیا، جس کی وجہ یہ پیش آئی کہ ایک صاحب نے دعوت کی، ان کے یہاں کھانے کے لئے چلے گئے، بعد میں پتہ چلا کہ اس کی آمدنی حرام کی تھی، فرماتے تھے کہ دو مہینے تک اس حرام لقمے کی ظلمت اپنے دل میں محسوس کرتا رہا، اور اس ظلمت کا نتیجہ یہ تھا کہ اس دو مہینے کے عرصے میں بار بار دل میں گناہ کے داعیے اور تقاضے پیدا ہوتے رہے۔ کبھی تقاضا ہوتا کہ فلاں گناہ کرلوں، کبھی تقاضا ہوتا کہ فلاں گناہ کرلوں، یہ سب ایک گناہ کا اثر تھا اور اس کی ظلمت تھی۔

گناہوں کے عادی ہو جانے کی مثال

ہمارے دلوں میں ان گناہوں کی ظلمت اور کراہیت اس لئے محسوس نہیں ہوتی کہ ہم ان گناہوں کے عادی ہو چکے ہیں۔ اس کی مثال یوں سمجھیں جیسے ایک بدبودار گھر ہو اور اس گھر میں تعفن اٹھ رہا ہو، سڑی ہوئی اشیاء اس گھر میں پڑی ہوئی ہوں۔ اگر باہر سے کوئی شخص اس گھر کے اندر جائے گا تو اس کے لئے اندر جاکر ذرا دیر بھی کھڑا ہونا مشکل ہو گا۔ لیکن ایک شخص اسی بدبودار مکان کے اندر ہی رہتا ہے تو اس کو بدبو کا احساس نہیں ہوگا اس لئے کہ وہ بدبو کا عادی ہو چکا ہے اور اس کے اندر خوشبو اور بدبو کی تمیز ہی نہیں رہی، اس لئے اب وہ بہت آرام سے اس مکان میں رہتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس سے کہے کہ تم اتنے گندے اور بدبودار مکان میں

رہتے ہو تو وہ اس کو پاگل کہے گا اور کہے گا کہ میں تو بہت آرام سے اس مکان میں رہتا ہوں، مجھے تو یہاں کوئی تکلیف نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ شخص اس بدبو کا عادی ہوچکا ہے۔ اور جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے اس بدبو سے محفوظ رکھا ہے بلکہ خوشبو والے ماحول میں رکھا ہے، اس کا تو یہ حال ہوگا کہ اگر دور سے ذرا سی بھی بدبو آجائے تو اس کا دماغ خراب ہوجائے گا۔ اسی طرح جو لوگ صاحب ایمان ہیں اور جن کا سینہ تقویٰ کی وجہ سے آئینہ کی طرح صاف شفاف ہے، ایسے لوگ گناہوں کی ظلمت اور کراہیت کو بہت زیادہ محسوس کرتے ہیں۔ بہرحال، گناہوں کی تیسری بڑی خرابی اور انجام دل میں ظلمت اور کراہیت کا پیدا ہونا ہے۔

گناہوں کی چوتھی خرابی "عقل خراب ہونا"

گناہوں کی چوتھی خرابی یہ ہے کہ جب آدمی گناہ کرتا چلا جاتا ہے تو اس کی عقل خراب ہوجاتی ہے اور اس کی مت الٹی ہوجاتی ہے، اس کی فکر اور سمجھ غلط راستے پر پڑجاتی ہے اور پھر اچھی بات کو برا اور بری بات کو اچھا سمجھنے لگتا ہے، اگر اس کو صحیح بات بھی نرمی سے سمجھاؤ تو وہ اس کے دماغ میں نہیں اترتی۔ اسی کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جس کو اللہ تعالیٰ گمراہ کردے اس کی ہدایت کا کوئی راستہ نہیں ہے، اور اللہ تعالیٰ کسی کو بے وجہ گمراہ نہیں کرتے بلکہ جب کوئی شخص گناہ اور نافرمانی کرتا ہی چلا جاتا ہے تو پھر ان گناہوں کی نحوست یہ ہوتی ہے کہ پھر صحیح بات اس کی سمجھ میں آتی ہی نہیں۔

گناہ نے شیطان کی عقل کو اوندھا کردیا

دیکھئے! یہ ابلیس اور شیطان جو گناہ کا سرچشمہ اور گناہ کا موجد اور بانی ہے۔ کیونکہ سب سے پہلے اس دنیا میں گناہ کو اسی نے ایجاد کیا، خود بھی گناہ میں مبتلا ہوا اور حضرت آدم علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کو بھی بہکایا، اور اس گناہ کرنے کے

نتیجے میں اس کی عقل اوندھی ہو گئی۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے اس کو حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا تو اس نے حکم ماننے کے بجائے عقلی دلیل پیش کرنی شروع کر دی کہ آپ نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور آدم کو مٹی سے پیدا کیا ہے۔ یہ دلیل بظاہر تو بڑی اچھی ہے کہ آگ افضل ہے، اور مٹی اس کے مقابلے میں مفضول ہے لیکن اس کی عقل میں یہ بات نہیں آئی کہ آگ کو پیدا کرنے والا بھی وہی ہے اور مٹی کو بنانے والا بھی وہی ہے، جب بنانے والا یہ حکم دے رہا ہے کہ آگ کو چاہئے کہ مٹی کو سجدہ کرے، تو پھر آگ کی فضیلت کہاں گئی اور مٹی کی مفضولیت کہاں گئی؟ اس کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ راندہ درگاہ ہوا اور مردود اور ذلیل ہوا۔ اور پھر اللہ تعالیٰ کے یہاں توبہ کا دروازہ تو کھلا ہوا ہے، انسان کے لئے بھی اور شیطان کے لئے بھی، اگر وہ عقل کو صحیح استعمال کر کے اللہ تعالیٰ سے کہہ دیتا کہ مجھ سے غلطی ہو گئی مجھے معاف کر دو، اب آپ جو کہیں گے وہ کروں گا۔ مگر یہ بات کہنے کے لئے آج بھی تیار نہیں۔

شیطان کی توبہ کا سبق آموز واقعہ

میں نے اپنے شیخ سے ایک قصہ سنا، اگرچہ بظاہر اسرائیلی واقعہ ہے لیکن بڑا سبق آموز واقعہ ہے۔ وہ یہ کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کے لئے کوہ طور پر تشریف لے جانے لگے تو راستے میں یہ شیطان مل گیا۔ اس نے کہا کہ آپ اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کے لئے تشریف لے جا رہے ہیں تو ہمارا ایک چھوٹا سا کام کر دیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا: کیا کام ہے؟ شیطان نے کہا کہ ہم تو اب راندہ درگاہ اور مردود اور ملعون ہو چکے ہیں کہ اب تو ہماری نجات کا کوئی راستہ نظر نہیں آرہا ہے۔ آپ اللہ تعالیٰ سے ہمارے لئے سفارش فرما دیں کہ ہمارے لئے بھی توبہ کا کوئی راستہ مل جائے اور نجات کی کوئی صورت نکل آئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ بہت اچھا۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر پہنچے،

وہاں پر اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی ہوئی لیکن اس دوران شیطان کی بات پہنچانا بھول گئے۔ جب واپس چلنے لگے تو خود اللہ تعالیٰ نے یاد دلاتے ہوئے فرمایا کہ تمہیں کسی نے کوئی پیغام دیا تھا؟ اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ ہاں یا اللہ! میں بھول گیا۔ راستے میں مجھے ابلیس ملا تھا اور بڑی پریشانی کا اظہار کر رہا تھا، اور یہ التجا کر رہا تھا کہ ہمارے لئے بھی نجات کا کوئی راستہ نکل آئے۔ اے اللہ! آپ تو رحیم و کریم ہیں، ہر ایک کو معاف فرما دیتے ہیں، وہ توبہ کر رہا ہے تو اس کو بھی معاف فرمادیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے کب کہا کہ توبہ کا دروازہ بند ہے، ہم تو معاف کرنے کو تیار ہیں۔ اس کو کہدو کہ تیری توبہ قبول ہو جائے گی۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس وقت ہم نے تجھ سے کہا تھا کہ آدم کو سجدہ کرلے، اس وقت تو نے ہماری بات نہیں مانی، اب بھی معاملہ بہت آسان ہے کہ اس کی قبر پر جاکر سجدہ کرلے، ہم تمہیں معاف کردیں گے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ معاملہ تو بہت آسان ہوگیا۔ چنانچہ یہ پیغام لے کر واپس تشریف لائے۔ راستے میں پھر شیطان سے ملاقات ہوئی، پوچھا کہ میری معافی کا کیا ہوا؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس سے فرمایا کہ تیرے معاملے میں تو اللہ تعالیٰ نے بڑا آسان راستہ بتا دیا۔ اس وقت تجھ سے یہ غلطی ہوئی تھی کہ تو نے آدم کو سجدہ نہیں کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اب تو آدم کی قبر کو سجدہ کرلے تو تیرا گناہ معاف ہو جائے گا۔ جواب میں شیطان نے فوراً کہا کہ واہ بھائی! میں نے زندہ کو سجدہ کیا نہیں، اب مردے کو کیسے سجدہ کرلوں؟ اور اس کی قبر کو کیسے سجدہ کرلوں؟ یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ یہ جواب اس لئے دیا کہ عقل الٹی ہوگئی تھی۔ بہر حال، گناہ کی خاصیت یہ ہے کہ وہ انسان کی عقل کو اوندھا کر دیتا ہے اور انسان کی مت ماری جاتی ہے اور پھر صحیح بات انسان کی سمجھ میں نہیں آتی۔

تمہیں حکمت پوچھنے کا اختیار نہیں

جن گناہوں کو قرآن و حدیث نے صراحتاً کھلے الفاظ میں حرام قرار دے دیا ہے، ان میں جو لوگ مبتلا ہیں ان سے جاکر اگر کہا جائے کہ یہ گناہ حرام ہیں، تو وہ فوراً اس کے خلاف عقلی تاویلیں کرنا شروع کر دیتے ہیں اور اس کے خلاف عقلی دلائل دینا شروع کر دیتے ہیں کہ یہ گناہ کیوں حرام قرار دیا گیا ہے؟ اس میں تو فلاں فائدہ ہے، اس میں تو فلاں مصلحت ہے، اس کو حرام قرار دینے میں کیا مصلحت اور حکمت ہے؟ ایسے لوگوں سے کوئی یہ پوچھے کہ تم اس دنیا میں خدا بن کر آئے ہو یا بندے بن کر آئے ہو۔ اگر تم بندے بن کر آئے ہو تو تم اپنے اس اعتراض کو اپنے ملازم کے اعتراض پر ہی قیاس کر لو جس کو تم نے اپنے گھر میں ملازم رکھا ہے۔ مثلاً آپ نے گھر کا سودا سلف لانے کے لئے ایک شخص کو ملازم رکھا، اب آپ نے اس ملازم سے کہا کہ بازار جاکر اتنے روپے کی فلاں چیز خرید کر لے آؤ، اب ملازم یہ کہنے لگے کہ پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ یہ سودا سلف مجھ سے کیوں منگوایا جا رہا ہے؟ اور اتنی مقدار میں کیوں منگوایا جارہا ہے؟ اور اس فضول خرچی کی کیا حکمت ہے؟ پہلے مجھے یہ بتاؤ۔ اگر ایک ملازم اس طرح ہمارے کاموں کی حکمت اور مصلحت پوچھے تو ایسا ملازم اس لائق ہے کہ اس کا کان پکڑ کر ملازمت سے الگ کر دیا جائے اور گھر سے باہر نکال دیا جائے، اس لئے کہ اس ملازم کو یہ حق ہی نہیں پہنچتا کہ وہ یہ پوچھے کہ یہ چیز کیوں منگوائی جارہی ہے؟ اس کو ملازم اس لئے رکھا ہے کہ جو کام اس کو بتا دیا جائے وہ کام کرے، سمجھ میں آئے تو کرے، سمجھ میں نہ آئے تو کرے، یہ ہے ملازم۔ اور کاموں کی مصلحت اور حکمت پوچھنا ملازم کا منصب نہیں ہے۔

تم ملازم نہیں، بندے ہو

ایک ملازم جس کو تم نے آٹھ گھنٹے کے لئے ملازم رکھا ہے، وہ ملازم تمہارا غلام

نہیں ہے، تم نے اس کو پیدا نہیں کیا، وہ تمہارا بندہ نہیں ہے اور تم اس کے خدا نہیں ہو۔ بلکہ صرف وہ تمہارا تنخواہ دار ملازم ہے، وہ اگر تم سے تمہارے کاموں کی حکمت اور مصلحت پوچھنے لگے تو وہ تمہیں گوارا نہ ہو۔ لیکن تم اللہ تعالیٰ کے ملازم نہیں ہو، نہ غلام ہو، بلکہ اللہ کے بندے ہو، اس نے تمہیں پیدا کیا ہے۔ وہ اگر تم سے یہ کہتا ہے کہ تم فلاں کام کرو تو تم یہ کہتے ہو کہ پہلے ہمیں وجہ بتاؤ، حکمت اور مصلحت بتاؤ، پھر میں یہ کام کروں گا۔ تو یہ حکمت اور مصلحت کا مطالبہ اتنی ہی بڑی حماقت ہے جتنی بڑی حماقت وہ ملازم کر رہا تھا، بلکہ اس سے بڑی اور بدتر حماقت ہے، کیونکہ وہ ملازم تو پھر بھی انسان ہے، اور تم بھی انسان ہو وہ بھی عقل رکھتا ہے، تم بھی عقل رکھتے ہو، اس کی اور تمہاری عقل برابر ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مصلحت کہاں، اور تمہاری یہ چھوٹی سی عقل کہاں؟ دونوں کے درمیان کوئی نسبت نہیں۔ پھر بھی تم حکمت اور مصلحت کا مطالبہ کر رہے ہو کہ اس حکم شرعی میں کیا مصلحت ہے؟ پہلے حکمت اور مصلحت بتاؤ، تب عمل کریں گے ورنہ نہیں کریں گے۔ وجہ اس مطالبے کی یہ ہے کہ عقل اوندھی ہو چکی ہے اور گناہوں کی کثرت نے عقل کو اوندھا کر دیا ہے۔

محمود اور ایاز کا عبرت آموز واقعہ

میرے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب قدس اللہ سرہ نے ایک واقعہ سنایا تھا جو بڑی عبرت کا اور بڑا سبق آموز واقعہ ہے۔ فرمایا کہ محمود غزنوی جو مشہور فاتح اور بادشاہ گزرے ہیں، ان کا ایک چہیتا اور لاڈلا غلام تھا "ایاز"۔ چونکہ یہ "ایاز" بادشاہ کا چہیتا تھا، اس لئے اس کے بارے میں لوگ یہ کہتے تھے کہ یہ بادشاہ کا منہ چڑھا غلام ہے، اور محمود غزنوی اس غلام کو دوسرے بڑے بڑے لوگوں پر ترجیح دیتا ہے۔ واقعہ بھی یہی تھا کہ محمود غزنوی بڑے بڑے وزیروں اور امیروں کی بات اتنی نہیں مانتا تھا جتنی ایاز کی بات مانتا تھا۔

محمود غزنوی نے چاہا کہ ان وزراء اور امراء کو دکھاؤں کہ تم میں اور ایاز میں کیا فرق ہے؟ چنانچہ ایک مرتبہ ایک بہت بڑا قیمتی ہیرا کہیں سے تحفے میں محمود غزنوی کے پاس آیا، یہ ہیرا بہت قیمتی اور بہت خوبصورت اور بہت شاندار تھا، بادشاہ کا دربار لگا ہوا تھا، سب نے اس قیمتی ہیرے کو دیکھا اور اس کی تعریف کی، اس کے بعد محمود غزنوی نے وزیر اعظم کو اپنے قریب بلایا اور اس سے پوچھا کہ تم نے یہ ہیرا دیکھا، یہ ہیرا کیسا ہے؟ وزیر اعظم نے کہا کہ سرکار! یہ بہت قیمتی ہیرا ہے اور پوری دنیا میں اس کی نظیر موجود نہیں، یہ بہت بڑا ہیرا ہے۔ بادشاہ نے کہا کہ اس ہیرے کو زمین پر پٹخ کر توڑ دو، وزیر اعظم ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوگیا اور کہا: جہاں پناہ! یہ بہت قیمتی ہیرا ہے، آپ کے پاس یہ یادگار تحفہ ہے، آپ اس کو تڑوا رہے ہیں؟ میری درخواست یہ ہے کہ آپ اس کو نہ تڑوائیں۔ بادشاہ نے کہا کہ اچھا بیٹھ جاؤ۔ پھر ایک دوسرے وزیر کو بلایا اور اس سے کہا کہ تم اس کو توڑ دو، وہ وزیر بھی کھڑا ہوگیا اور کہنے لگا بادشاہ سلامت! یہ بہت قیمتی ہیرا ہے، میری ہمت نہیں ہو رہی ہے کہ اس کو توڑوں۔ اسی طرح اس نے کئی وزراء اور امراء کو بلوایا اور اس ہیرے کو توڑنے کے لئے کہا، مگر ہر ایک نے معافی مانگی اور توڑنے سے معذرت کرلی۔

ہیرا ٹوٹ سکتا ہے، حکم نہیں ٹوٹ سکتا

آخر میں محمود غزنوی نے ایاز کو بلایا کہ ایاز! اس نے کہا جی جہاں پناہ، محمود غزنوی نے کہا کہ یہ ہیرا رکھا ہے اس کو اٹھا کر پٹخ کر توڑ دو، ایاز نے وہ ہیرا اٹھایا اور زمین پر پٹخ کر توڑ دیا اور وہ چور چور ہوگیا۔ جب بادشاہ نے دیکھا کہ ایاز نے وہ ہیرا توڑ دیا تو بادشاہ نے اس کو ڈانٹا کہ تم نے ہیرا کیوں توڑا؟ یہ بڑے بڑے وزراء اور امراء صاحبان عقل جو یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان سے جب ہیرا توڑنے کے لئے کہا گیا تو انہوں نے اس ہیرے کو توڑنے کی ہمت نہیں کی، کیا یہ سب پاگل تھے؟ تم نے اٹھا کر توڑ دیا۔ کیوں توڑا؟ پہلے تو ایاز نے کہا کہ جہاں پناہ! غلطی ہوگئی۔ بادشاہ

نے پوچھا کہ تم نے توڑا کیوں؟ ایاز نے کہا کہ میرے دل میں خیال آیا کہ یہ تو ہیرا ہے، چاہے اس کی قیمت کتنی زیادہ کیوں نہ ہو، یہ اگر ٹوٹ جائے تو اتنی بری بات نہیں، لیکن آپ کا حکم نہیں ٹوٹنا چاہئے۔ اور آپ کے حکم کو اس ہیرے سے زیادہ قیمتی سمجھتے ہوئے میں نے سوچا کہ اس ہیرے کے ٹوٹنے کے مقابلے میں حکم ٹوٹنا زیادہ بری بات ہے۔ اس لئے میں نے اس ہیرے کو توڑ دیا۔

حکم کا بندہ

اس کے بعد محمود غزنوی نے ان وزراء سے مخاطب ہو کر کہا کہ تم میں اور ایاز میں یہ فرق ہے۔ تمہیں اگر کسی کام کا حکم دیا جائے تو اس کے اندر حکمتیں اور مصلحتیں تلاش کرتے ہو۔ اور یہ ایاز تو حکم کا بندہ ہے۔ اس سے جو کہا جائے گا وہ یہ کرے گا۔ اس کے سامنے حکمت اور مصلحت کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔

تو محمود غزنوی کے حکم کی کیا حقیقت ہے؟ اس کی عقل بھی محدود، اس کے وزراء اور ایاز کی عقل بھی محدود، یہ مقام تو در حقیقت اس ذات کو حاصل ہے جس نے ساری کائنات کو پیدا کیا ہے۔ چاہے ہیرا ٹوٹ جائے، چاہے دل ٹوٹ جائے، چاہے انسان کے جذبات ٹوٹ جائیں، چاہے خیالات اور خواہشات ٹوٹ جائیں، لیکن اس کا حکم نہ ٹوٹے، یہ مقام در حقیقت صرف اللہ جل شانہ کو حاصل ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے حکم میں حکمت اور مصلحت تلاش کرنا نادانی اور بے عقلی کی بات ہے، اور اس بے عقلی کا اصل سبب گناہ ہیں، جتنے گناہ کرو گے اتنی ہی یہ عقل اوندھی ہوتی چلی جائے گی۔ بہر حال گناہ کی نحوست یہ ہے کہ انسان کی عقل ماری جاتی ہے۔

گناہ چھوڑنے سے نور کا حصول

تم ذرا اللہ تعالیٰ کے حضور ان گناہوں سے کچھ دیر کے لئے ہی توبہ کر کے دیکھو،

اور چند روز کے لئے گناہوں سے بچ کر دیکھو، کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیا برکت اور کیا نور حاصل ہوتا ہے، اور پھر عقل کے اندر ایسی باتیں سمجھ میں آئیں گی جو پہلے سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ان تتقوا الله يجعل لكم فرقانا﴾

(سورۃ الانفال:۲۹)

اگر تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو گے، یعنی اللہ تعالیٰ کے حرام کئے ہوئے معاصی اور گناہوں سے بچو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے دل میں حق و باطل کے درمیان تمیز کرنے والا ایک کانٹا پیدا کر دیں گے، جو واضح طور پر تمہیں یہ بتا دے گا کہ یہ حق ہے اور یہ باطل ہے یہ صحیح ہے، اور یہ غلط ہے۔ آج حق و باطل کے درمیان تمیز مٹ چکی ہے۔ اس لئے کہ ہم نے گناہ کر کر کے اپنی عقلیں خراب کر دی ہیں۔

گناہوں کا پانچواں نقصان "بارش بند ہونا"

گناہوں کا پانچواں نقصان یہ ہے کہ ان کی اصل سزا تو آخرت میں ملے گی۔ لیکن اس دنیا میں بھی ان گناہوں کی نحوست اس کی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب لوگ زکوٰۃ دینا بند کر دیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بارشیں بند کر دیتے ہیں۔

گناہوں کا چھٹا نقصان "بیماریوں کا پیدا ہونا"

اور چھٹا نقصان یہ ہے کہ جب لوگوں میں بدکاری، فحاشی، عریانی پھیل جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ ان کو ایسی ایسی بیماریوں میں مبتلا کر دیتے ہیں کہ ان کے آباء واجداد نے ان بیماریوں کے بارے میں کبھی سنا بھی نہیں تھا کہ ایسی بھی کوئی بیماری ہوتی ہے اور نہ ان کا نام سنا تھا۔ چنانچہ اس حدیث کو سامنے رکھ کر "ایڈز" کی بیماری کو دیکھ لیں

جس کا ساری دنیا میں آج طوفان برپا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم چودہ سو سال پہلے بتا گئے کہ ایسی ایسی بیماریاں آئیں گی۔ ہر گناہ کے کچھ خاصے ہوتے ہیں اور ان خاصوں کا مظاہرہ اسی دنیا ہی کے اندر ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ آنکھوں سے دکھا دیتے ہیں۔ اور ان گناہوں کی شامت اعمال طاری ہو جاتی ہے۔

گناہوں کا ساتواں نقصان "قتل وغارت گری"

حدیث شریف میں ہے کہ آخر زمانے میں ایک زمانہ ایسا آجائے گا کہ "یکثر الھرج" اس میں قتل و غارت گری کی کثرت ہو گی اور آدمی کو مارا جائے گا اور نہ اس کو اور نہ ہی اس کے ورثاء کو پتہ چلے گا کہ کیوں مارا گیا؟ اور کس نے مارا؟ لایدری القاتل فیم قتل ولا المقتول فیم قتل۔ پہلے جب کوئی قتل ہوتا تھا تو پتہ چل جاتا تھا کہ دشمنی تھی، اس کی وجہ سے مارا گیا۔ یہ حدیث پڑھ لو آج جو قتل و غارت گری ہو رہی ہے اس کو دیکھ لو کہ کس طرح لوگ مر رہے ہیں، آج کسی کا قتل ہو جائے اور اس کے بارے میں پوچھا جائے کہ کیوں مارا گیا؟ اور کس نے مارا؟ تو اس کا جواب کسی کے پاس نہیں ہوتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے چودہ سو سال پہلے آج کے حالات دیکھ کر یہ بات ارشاد فرمائی تھی۔ یہ سب ہماری شامت اعمال اور شامت گناہ کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ اور گناہوں کی کثرت نے یہ صورت حال پیدا کر دی ہے۔

قتل وغارت گری کا واحد حل

آج ہم لوگ ان فسادات اور قتل و غارت گری کے مختلف حل تلاش کرنے میں لگے ہوئے ہیں، کوئی کہتا ہے کہ سیاسی حل تلاش کرنا چاہئے، کوئی کہتا ہے کہ آپس میں مذاکرات ہونے چاہئیں۔ یہ سب تدبیریں تلاش کر رہے ہیں لیکن ہمیں یہ معلوم نہیں کہ ان فسادات کا اصل سبب گناہوں کا پھیل جانا ہے۔ جب کسی امت کے

اندر گناہ پھیل جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی شامت اعمال کی یہ صورت پھیل جاتی ہے۔ لہٰذا اس کی طرف توجہ کرنی چاہئے۔ اللہ تعالیٰ عقل سلیم عطا فرمائے اور ان گناہوں کو چھوڑنے کی توفیق عطا فرمائے۔ تو ہمیں پہلا کام یہ کرنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے تمام گناہوں سے توبہ کریں اور شامت اعمال سے پناہ مانگیں۔ اور اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ اے اللہ! ہم سے ہماری شامت اعمال کو دور فرما۔

وظائف سے زیادہ گناہوں کی فکر کرنی چاہئے

بہر حال، نفلی عبادتوں میں زیادہ انہماک اچھی بات ہے، لیکن اس سے بھی زیادہ ضروری کام گناہوں سے بچنا ہے۔ میرے پاس روزانہ کئی حضرات اور خاص طور پر خواتین کے فون آتے ہیں کہ فلاں کام کی دعا بتا دیجئے، فلاں مقصد کے لئے دعا بتا دیجئے۔ بعض خواتین کا یہ خیال ہے کہ ہر مقصد کے لئے الگ دعا ہوتی ہے اور اس کا الگ کوئی وظیفہ ہوتا ہے۔ بھائی! یہ دعائیں اور یہ وظیفے اپنی جگہ قابل فضیلت ہیں، لیکن زیادہ فکر اس کی کرنی چاہئے کہ گناہ سرزد نہ ہوں۔ اور گناہوں سے خود بھی بچو اور اپنے گھر والوں اور اپنے بچوں کو بھی گناہوں سے بچاؤ، جب تک یہ کام نہیں کرو گے تو یاد رکھو یہ وظیفے کچھ کام نہیں آئیں گے، یہ وظیفے اسی وقت کام آتے ہیں جب دل میں گناہوں سے بچنے کی فکر اور اس کا جذبہ ہو، اور بچنے کا اہتمام بھی ہو تو اس وقت ان وظائف اور دعاؤں کے ذریعہ دل میں قوت اور ہمت پیدا ہو جاتی ہے اور پھر گناہوں سے بچنا آسان ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر گناہوں سے بچنے کی فکر تو ہے نہیں، غفلت میں وقت گزر رہا ہے، اور ساتھ میں وظائف اور نوافل بھی چل رہے ہیں تو پھر اس وقت ان وظائف سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

گناہوں کا جائزہ لیں

خلاصہ یہ کہ ہم گناہوں سے بچنے کی فکر کریں، اپنی صبح سے شام تک کی زندگی کا جائزہ لیں اور گناہوں کی فہرست بنائیں کہ کون کون سے کام اللہ کی مرضی کے خلاف ہو رہے ہیں۔ پھر یہ جائزہ لیں کہ ان گناہوں میں سے کن کن گناہوں کو فوراً چھوڑ سکتے ہیں، ان کو تو فوراً چھوڑ دیں، اور جن گناہوں کے چھوڑنے کے لئے کسی تدبیر کی ضرورت ہو، ان کے لئے تدبیر اختیار کریں۔ اور اپنے گناہوں سے توبہ واستغفار کریں۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو گناہوں سے بچنے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

تہجد گزار سے آگے بڑھنے کا طریقہ

ایک حدیث میں ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جس شخص کی یہ خواہش ہو کہ میں کسی عبادت گزار اور تہجد گزار آدمی سے آگے بڑھ جاؤں تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو گناہوں سے محفوظ رکھے۔ مثلاً ہم بزرگوں کے حالات میں پڑھتے ہیں کہ وہ ساری ساری رات عبادت کرتے تھے، اتنی رکعات نفل پڑھتے تھے، اتنے پارے تلاوت کرتے تھے۔ اب اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ میں اس عبادت گزار سے آگے بڑھ جاؤں تو وہ گناہوں سے اپنے آپ کو محفوظ کرلے۔ کیونکہ گناہوں سے حفاظت ہونے کے نتیجے میں انشاء اللہ ان کی بھی نجات ہوگی اور تمہاری بھی نجات ہوگی، اگر وہ لوگ بھی گناہوں سے بچتے ہوں گے تو بس اتنا فرق ہوگا کہ ان کا درجہ اونچا ہوگا اور تمہارا درجہ نیچا ہوگا، لیکن نجات میں دونوں برابر ہوں گے۔ اور اگر کوئی شخص عبادت گزار تھا لیکن ساتھ میں گناہ بھی کرتا تھا تو پھر اس سے آگے بڑھ جاؤ گے، اس لئے کہ تم نے اپنے آپ کو گناہوں سے بچالیا ہے۔

مؤمن اور اس کے ایمان کی مثال

ایک اور حدیث حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایک مؤمن اور اس کے ایمان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک گھوڑا کسی لمبی رسی کے ذریعہ کھونٹے سے بندھا ہوا ہے، اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ گھوڑا گھومتا بھی رہتا ہے، لیکن ایک حد تک وہ گھوم سکتا ہے، اس حد سے آگے جانے سے وہ کھونٹا اس کو روک دیتا ہے، وہ گھوڑا ذرا سا چکر لگا کر پھر واپس اپنے کھونٹے کے پاس آکر بیٹھ جائے گا۔ اس طرح وہ کھونٹا دو کام کرتا ہے، ایک یہ کہ وہ گھوڑے کو ایک خاص حد سے آگے بڑھنے سے روکتا ہے، اور دوسرا یہ کہ وہ کھونٹا ہی اس کی جائے پناہ بنا ہوا ہے۔ وہ گھوڑا اِدھر اُدھر چکر لگانے کے بعد واپس اسی کھونٹے کے پاس آکر بیٹھ جاتا ہے۔

یہ مثال بیان کر کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مؤمن کا کھونٹا اس کا ایمان ہے، اس ایمان کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ مؤمن ایک حد تک اِدھر اُدھر جائے گا، گھومے گا پھرے گا، لیکن اگر حد سے آگے جانے کی کوشش کرے گا تو ایمان اس کی رسّی کھینچ لے گا، اور اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد آخر کار وہ مؤمن اپنے ایمان کے کھونٹے کے پاس واپس آجائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ مؤمن کا ایمان اتنا قوی ہوتا ہے کہ وہ اس کو گناہ کرنے نہیں دیتا۔ اور اگر کبھی بھول چوک سے گناہ ہو گیا تو پھر لوٹ کر واپس اپنے ایمان کے کھونٹے کے پاس آجاتا ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کتنی خوبصورت مثال بیان فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہم سب کا یہ کھونٹا مضبوط فرمادے، آمین۔

گناہ لکھنے میں تاخیر کی جاتی ہے

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ہر انسان کے ساتھ دو فرشتے ہوتے ہیں۔ ایک

نیکیاں لکھنے والا اور ایک برائیاں لکھنے والا۔ میں نے اپنے شیخ حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب قدس اللہ سرہ سے سنا ہے کہ نیکی لکھنے والے فرشتے کو یہ حکم ہے کہ جب وہ انسان نیکی کرے تو فوراً اس کو لکھ لو، اور بدی لکھنے والے فرشتے کو حکم یہ ہے کہ جب وہ انسان بدی کرے تو لکھنے سے پہلے نیکی لکھنے والے فرشتے سے پوچھے کہ لکھوں یا نہ لکھوں۔ گویا کہ نیکی لکھنے والا فرشتہ اس کا امیر ہے۔ چنانچہ جب انسان کوئی گناہ کرتا ہے تو وہ بدی لکھنے والا فرشتہ نیکی لکھنے والے فرشتے سے پوچھتا ہے کہ لکھوں یا نہ لکھوں؟ نیکی والا فرشتہ کہتا ہے کہ نہیں، ابھی مت لکھو، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ یہ توبہ کرلے اور استغفار کرلے تو پھر لکھنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔ اگر وہ شخص دوبارہ گناہ کرلیتا ہے اور اپنے پہلے گناہ سے توبہ نہیں کرتا تو پھر پوچھتا ہے کہ اب لکھ لوں نیکی والا فرشتہ کہتا ہے کہ نہیں۔ ابھی ٹھہر جاؤ، پھر جب تیسری مرتبہ گناہ کرلیتا ہے تو پھر پوچھتا ہے کہ لکھوں یا نہیں؟ اب جاکر وہ کہتا ہے کہ ہاں اب لکھ لو۔ اس کے بعد وہ گناہ اس کے نامۂ اعمال میں لکھ دیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے اتنا آسانی کا معاملہ کردیا ہے کہ نیکی فوراً لکھ لی جاتی ہے اور بدی کے لکھنے میں تامل اور تاخیر کی جاتی ہے کہ شاید یہ گناہ سے توبہ کرلے۔

جہاں گناہ کیا، وہیں توبہ کرلو

اسی وجہ سے بزرگوں نے فرمایا کہ جب کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو فوراً بلا تاخیر توبہ واستغفار کرلو، تاکہ وہ گناہ تمہارے نامۂ اعمال کے اندر لکھا ہی نہ جائے۔ اور بزرگوں نے یہ بھی فرمایا کہ جس زمین پر گناہ کیا ہے، اسی زمین پر فوراً توبہ واستغفار کرلو، تاکہ قیامت کے روز جب وہ زمین تمہارے گناہ کی گواہی دے تو اس کے ساتھ ساتھ وہ زمین تمہاری توبہ کی بھی گواہی دے کہ اس شخص نے میرے سینے پر گناہ کیا تھا، اس کے بعد میرے سینے پر ہی توبہ بھی کرلی تھی۔ یہ سب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی تعمیل ہو رہی ہے کہ ایمان مؤمن کا کھونٹا ہے،

جب مؤمن ادھر ادھر چلا جاتا ہے تو گھوم پھر کر واپس اپنے کھونٹے کے پاس آجاتا ہے۔

گناہوں سے بچنے کا اہتمام کریں

اس لئے اول تو گناہوں سے بچنے کا اہتمام اور فکر کریں، اہتمام اور فکر کے بغیر گناہوں سے بچا نہیں جاسکتا، اگر اہتمام اور فکر کے باوجود کسی مجبوری سے یا بھول چوک سے یا غلطی سے گناہ سرزد ہو جائے تو فوراً توبہ کرو، استغفار کرو اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو۔ یہ کرتے رہو گے تو پھر اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس گناہ کو معاف فرمادیں گے۔ اور یہ غفلت اور لاپرواہی سب سے بڑی بلا ہے کہ انسان کو فکر اور دھیان اور توجہ ہی نہ ہو بلکہ اپنے گناہوں پر نادم ہونے کے بجائے اس کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو گناہوں کے وبال سے محفوظ فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

منکرات کو روکو۔ ورنہ!!

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

تاریخ خطاب : ۸ر نومبر ۱۹۹۱ء

مقام خطاب : جامع مسجد بیت المکرم
گلشن اقبال کراچی

وقت خطاب : بعد نماز عصر تا مغرب

اصلاحی خطبات : جلد نمبر ۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

منکرات کو روکو ـ ورنہ!!

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ و نؤمن بہ ونتوکل علیہ، ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیات اعمالنا، من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ، ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ، ونشھد ان سیدنا وسندنا ونبینا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ، صلی اللہ تعالٰی علیہ وعلٰی آلہ واصحابہ وبارک وسلم تسلیماً کثیرًا کثیرا۔ اما بعد!

﴿عن ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ قال: سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ، فان لم یستطع فبلسانہ، فان لم یستطع فبقلبہ، وذلک اضعف الایمان﴾ (صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان کون النھی عن المنکر من الایمان)

منکرات کو روکنے کے تین درجات

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص تم میں سے کوئی برائی ہوتی ہوئی دیکھے تو اس کو چاہئے کہ اس برے کام کو اپنے ہاتھ سے تبدیل کردے، یعنی اس برائی کو نہ صرف روکے، بلکہ اس کو اچھائی میں تبدیل کردے۔ اگر ہاتھ سے روکنے کی قدرت

اور طاقت نہیں ہے تو دوسرا درجہ یہ ہے کہ زبان سے اس کو بدل دے، یعنی جو شخص اس برائی کا ارتکاب کر رہا ہے اس سے کہے کہ بھائی: یہ کام جو تم کر رہے ہو۔ یہ اچھا نہیں ہے۔ اس کے بجائے نیکی کی طرف آجاؤ۔ اور اگر زبان سے بھی کہنے کی طاقت اور قدرت نہیں ہے تو اپنے دل سے اس برائی کو بدل دے۔ یعنی اپنے دل سے اس کام کو برا سمجھے۔ اس تیسرے درجے کے بارے میں فرمایا کہ یہ ایمان کا بہت ضعیف اور کمزور درجہ ہے۔

خسارے سے بچنے کے لئے چار کام

سورۃ "العصر" میں اللہ تعالیٰ نے ایک عام قاعدہ بیان فرمادیا کہ:

﴿والعصر ان الانسان لفی خسر الا الذین امنوا وعملوا الصلحت وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر﴾

زمانے کی قسم کھاتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمام انسان خسارے میں اور نقصان میں ہیں، سوائے ان لوگوں کے جو یہ چار کام کرلیں، گویا کہ خسارے اور نقصان سے بچنے کے لئے چار کام ضروری ہیں۔ ایک ایمان لانا، دوسرے نیک کام کرنا، تیسرے ایک دوسرے کو حق بات کی وصیت اور نصیحت کرنا اور چوتھے ایک دوسرے کو صبر کی وصیت اور نصیحت کرنا۔ "حق" کے معنی یہ ہیں کہ تمام فرائض کو بجالانے کی وصیت اور "صبر" کے معنی ہیں گناہوں سے بچنے کی نصیحت اور وصیت۔ لہٰذا خسارے سے بچنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایمان اور عمل صالح کو کافی قرار نہیں دیا۔ بلکہ یہ بھی فرمایا کہ دوسروں کو "حق" اور "صبر" کی وصیت اور نصیحت کرے۔ یہ کام بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا عمل صالح ضروری ہے۔

ایک عبادت گزار بندے کی ہلاکت کا واقعہ

ایک حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قوم کا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ قوم طرح طرح کے گناہ، معصیتوں اور منکرات میں مبتلا تھی، اللہ تعالیٰ نے اس قوم پر عذاب نازل کرنے کا فیصلہ فرما لیا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ فلاں بستی والے گناہوں اور نافرمانیوں کے اندر مبتلا ہیں۔ اور اس پر کمر باندھی ہوئی ہے۔ تم جاکر اس بستی کو پلٹ دو۔ یعنی اوپر کا حصہ نیچے اور نیچے کا حصہ اوپر کردو۔ اور ان کو ہلاک کردو۔ حضرت جبرئیل امین علیہ السلام نے عرض کیا یا اللہ! آپ نے فلاں بستی کو الٹنے کا حکم دیا ہے۔ اور اس میں کسی کا استثناء نہیں فرمایا۔ بلکہ پوری بستی کو تباہ کرنے کا آپ نے حکم دیا ہے۔ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ اس بستی میں ایک ایسا شخص بھی ہے جس نے ایک لمحے کے لئے بھی آپ کے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کی۔ اور ساری عمر اس نے اطاعت اور عبادت کے اندر گزار دی ہے۔ اور اس نے کوئی گناہ بھی نہیں کیا، تو کیا اس شخص کو بھی ہلاک کردیا جائے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہاں! جاؤ اور پوری بستی کو بھی تباہ کردو، اور اس شخص کو بھی تباہ کردو۔ اسلئے کہ وہ شخص اپنی ذات میں بڑے نیک کام کرتا رہا۔ اور عبادت اور اطاعت میں مشغول رہا۔ لیکن کسی گناہ کو ہوتا ہوا دیکھ کر اس کے ماتھے پر کبھی شکن بھی نہیں آئی۔ اور کسی گناہ کو برا بھی نہیں سمجھا۔ اور اس کا چہرہ بدلا بھی نہیں۔ اور ان گناہوں کو روکنے کے لئے نہ تو کوئی اقدام کیا۔ لہٰذا اس شخص کو بھی اس کی قوم کے ساتھ تباہ کردو۔

بے گناہ بھی عذاب کی لپیٹ میں آجائیں گے

اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ایک دوسری آیت میں ارشاد فرمایا:

﴿وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً﴾ (۲۵: سورۃ الانفال)

یعنی اس عذاب سے ڈرو جو صرف ان لوگوں پر نہیں آئے گا جو گناہ میں مبتلا تھے۔ بلکہ وہ عذاب بے گناہوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ اس لئے کہ یہ لوگ بظاہر تو بے گناہ تھے۔ لیکن جو گناہ ہو رہے تھے۔ ان کو روکنے کے لئے انہوں نے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ نہ زبان ہلائی، اور ان گناہوں کو ہوتا ہوا دیکھ کر ان چہرے پر شکن نہیں آئی، اس لئے ان پر بھی وہ عذاب آجائے گا۔

بہرحال یہ امر بالمعروف کرنا اور نہی عن المنکر کرنا بہت اہم فریضہ ہے۔ جس سے ہم اور آپ غفلت میں ہیں۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ گناہ اور نافرمانیاں ہو رہی ہیں، اور بس اپنے آپ کو بچا کر فارغ ہو جاتے ہیں، دوسروں کو نصیحت نہیں کرتے، اور ان گناہوں سے بچانے کی فکر نہیں کرتے۔

منکرات کو روکنے کا پہلا درجہ

جو حدیث میں نے شروع میں تلاوت کی تھی۔ اس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے برائیوں سے روکنے کے تین درجات بیان فرمائے ہیں، پہلا درجہ یہ ہے کہ اگر کسی جگہ پر تمہیں برائی کو ہاتھ سے روکنے کی طاقت ہے۔ تو اس کو اپنے ہاتھ سے روک دو، اگر ہاتھ سے روکنے کی طاقت تھی۔ اس کے باوجود آپ نے ہاتھ سے نہیں روکا تو آپ نے خود گناہ کا ارتکاب کر لیا۔ مثلاً ایک شخص خاندان کا سربراہ ہے۔ خاندان کے اندر اس کی بات چلتی ہے۔ لوگ اس کی بات کو مانتے ہیں۔ وہ یہ دیکھ رہا ہے کہ میرے خاندان والے ایک ناجائز اور گناہ کے کام میں مبتلا ہیں۔ اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اگر میں اس کام کو اپنے حکم کے زور پر روک دوں گا تو یہ کام بند ہو جائے گا۔ اور اس کے بند ہونے سے کوئی فتنہ کھڑا نہیں ہوگا۔ ایسی صورت میں اس سربراہ پر فرض ہے کہ وہ اپنے ہاتھ سے اور طاقت سے اس برائی کو روکے۔

محض اس خیال سے نہ روکنا کہ اگر میں روکوں گا تو فلاں شخص ناراض ہو جائے گا۔ یا فلاں شخص کا دل ٹوٹے گا۔ ٹھیک نہیں، اس لئے کہ اللہ کے حکم ٹوٹنے کے مقابلے میں کسی کے دل ٹوٹنے کی کوئی حقیقت نہیں۔

"فیضی" شاعر کا ایک واقعہ

اکبر بادشاہ کے زمانے میں ایک مشہور شاعر گذرے ہیں جن کا تخلص "فیضی" تھا۔ ایک مرتبہ "فیضی" حجام سے خط بنوا رہے تھے۔ اور داڑھی بھی صاف کرا رہے تھے، اس وقت ایک بزرگ ان کے قریب سے گزرے اور فرمایا: آغا: ریش می تراشی؟ جناب! کیا آپ داڑھی منڈوا رہے ہیں؟ کیونکہ فیضی شاعر علم و فضل کے بھی مدعی تھے، انہوں نے ہی قرآن کریم کی بغیر نقطوں کی تفسیر لکھی ہے۔ ان بزرگ کا کہنا یہ تھا کہ تم عالم ہو۔ تمہیں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے بارے میں علم ہے۔ پھر بھی تم یہ کام کر رہے ہو؟ جواب میں فیضی نے کہا: "بلے، ریش می تراشم۔ دل کسے نمی خراشم" جی ہاں میں داڑھی منڈوا رہا ہوں۔ لیکن کسی کا دل نہیں توڑ رہا ہوں۔ کسی کی دل آزاری تو نہیں کر رہا ہوں۔ گویا کہ فیضی نے طعنہ دیتے ہوئے کہا کہ میں تو یہ ایک گناہ کر رہا تھا۔ لیکن تم نے مجھے یہ کہہ کر میرا دل توڑ دیا۔ جواب میں ان بزرگ نے فرمایا: "ولے، دل رسول اللہ می خراشی" کس اور کا دل تو نہیں توڑ رہے ہو، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دل توڑ رہے ہو۔ اس لئے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو منع فرمایا کہ یہ کام مت کرو۔ اس کے باوجود تم کر رہے ہو۔

دل ٹوٹنے کی پرواہ نہ کرے

بہرحال لوگوں میں جو یہ بات مشہور ہے کہ دل آزاری نہ ہونی چاہئے۔ تو بات یہ ہے کہ اگر محبت، پیار اور شفقت اور نرمی سے، ذلیل کئے بغیر وہ کسی دوسرے شخص

کو منع کر رہا ہے کہ یہ کام مت کرو، اس کے باوجود اس کا دل ٹوٹ رہا ہے تو ٹوٹا کرے۔ اس کے ٹوٹنے کی کوئی پرواہ نہ کرے۔ کیونکہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم دل ٹوٹنے سے بلند تر ہے۔ البتہ اتنا ضرور کرے کہ کہنے میں ایسا انداز اختیار نہ کرے جس سے دوسرے کا دل ٹوٹے، اور اس کی توہین نہ کرے، اور اس کو ذلیل نہ کرے۔ اور ایسے انداز سے نہ کہے جس سے وہ اپنی سبکی محسوس کرے۔ بلکہ تنہائی میں محبت سے شفقت سے اس کو سمجھادے۔ اس کے باوجود اگر دل ٹوٹتا ہے تو اس کی پرواہ نہ کرے۔

ترک فرض کے گناہ کے مرتکب

لہٰذا اگر کوئی شخص اپنے خاندان کا سربراہ ہے۔ خاندان میں اس کی بات مانی جاتی ہے۔ وہ دیکھ رہا ہے کہ بچے غلط راستے پر جا رہے ہیں، یا گھر والے گناہوں کا ارتکاب کر رہے ہیں، پھر بھی ان کو نہیں روکتا تو یہ گناہ کے اندر داخل ہے، اس لئے کہ سربراہ پر ان کو ہاتھ سے روکنا فرض تھا۔ یا کوئی استاذ ہے، وہ شاگرد کو گناہ سے نہیں روکتا، یا کوئی شیخ ہے۔ اور اپنے مرید کو گناہ سے نہیں روکتا، یا کوئی افسر ہے، وہ اپنے ماتحت کو گناہ سے نہیں روکتا، جبکہ ان لوگوں کو روکنے کی طاقت حاصل ہے، تو یہ حضرات ترک فرض کے گناہ کا ارتکاب کر رہے ہیں۔

فتنہ کے اندیشے کے وقت زبان سے روکے

البتہ بعض اوقات اس بات کا اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر ہم اس کو اس برائی سے روکیں گے تو فتنہ کھڑا ہو جائے گا۔ یا طبیعت میں بغاوت پیدا ہو جائے گی۔ اور بغاوت پیدا ہونے کے نتیجے میں اس سے بھی بڑے گناہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے۔ تو اس وقت اگر ہاتھ سے نہ روکے، بلکہ صرف زبان سے کہنے پر اکتفا کرے تو اس کی بھی گنجائش ہے۔ چنانچہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ

اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا کہ اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جو فرمایا کہ اگر ہاتھ سے روکنے کی استطاعت نہ ہو تو زبان سے روکے، اس استطاعت کے نہ ہونے میں یہ بات بھی داخل ہے مثلاً سینما ہال کے باہر گندی تصویریں لگی ہوئی ہیں۔ اب آپ کو استطاعت حاصل ہے کہ چند آدمیوں کو لے کر جائیں۔ اور ان تصویروں کو گرانے کی کوشش کریں، لیکن اس استطاعت کے نتیجے میں خود بھی فتنہ میں مبتلا ہو گے اور دوسروں کو بھی فتنہ و فساد میں مبتلا کرو گے، اس لئے کہ جوش میں آکر وہ کام کر تو لیا، لیکن پھر خود بھی پکڑے گئے۔ اور دوسروں کو پکڑوادیا۔ اور اس کے نتیجے میں ناقابل برداشت مصیبت کھڑی ہو گئی۔ لہٰذا یہ کام استطاعت سے خارج سمجھا جائے گا۔ استطاعت میں داخل نہیں ہو گا۔ اس لئے اس موقع پر صرف زبان سے روکنے پر اکتفا کرے۔

خاندان کے سربراہ ان برائیوں کو روک دیں

آج ہمارے معاشرے میں جو فساد پھیلا ہوا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ خاندان کے وہ سربراہ جو خاندان کے سیاہ و سفید کے مالک ہیں۔ وہ جب خاندان کے افراد کو کسی گناہ کے اندر مبتلا دیکھتے ہیں تو ان کو روکنے اور ٹوکنے کے بجائے وہ بھی ان کے ساتھ اس گناہ کے اندر شریک ہو جاتے ہیں۔ مثلاً آجکل جو شادی بیاہ ہو رہے ہیں۔ ان شادی بیاہوں میں منکرات کا ایک سیلاب امڈا ہوا ہے۔ بعض منکرات معمولی درجے کے ہیں۔ بعض منکرات درمیانی درجے کے ہیں۔ اور بعض منکرات شدید سنگین قسم کے ہیں۔ مثلاً اب یہ بات عام ہوتی جارہی ہے کہ شادی بیاہ کے اجتماعات مخلوط ہونے لگے ہیں۔ یہ بات اس لئے عام ہوتی جارہی ہے کہ خاندان کے سربراہ اس برائی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، پھر بھی نہ تو زبان سے اس کو روکتے ہیں۔ اور نہ ہاتھ سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بلکہ وہ بھی ان تقریبات میں شریک ہو جاتے ہیں۔ اور یہ کہتے ہیں کہ بھائی، کیا کریں۔ فلاں بھتیجے کی شادی

ہے۔ مجھے تو اس میں شریک ہونا ہے ـــــ دیکھئے، اگر وہ لوگ آپ کو وہ شریک کرنا چاہتے ہیں تو پھر ان کو چاہئے کہ وہ آپ کے اصولوں کے مطابق انتظام کریں۔ اور آپ کو یہ اسٹینڈ لینا ضروری ہے کہ میں اس وقت تک اس تقریب میں شریک نہیں ہوں گا جب تک یہ مخلوط اجتماع ختم نہیں کیا جاتا۔ اگر تم مخلوط اجتماع کرتے ہو تو پھر میرے نہ آنے سے آپ کو ناراض ہونے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ اگر خاندان کا سربراہ یہ کام نہیں کرے گا تو قیامت کے روز اس کی پکڑ ہوگی کہ تم ہاتھ سے اس برائی کو اس طرح روک سکتے تھے کہ خود شریک نہ ہوتے۔ اور شرکت سے انکار کردیتے۔

شادی کی تقریب یا رقص کی محفل

آج ہم لوگ قدم قدم پر ان برائیوں کے سامنے ہتھیار ڈالتے جارہے ہیں۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ جب شادی بیاہ کی تقریبات میں اتنی برائیاں نہیں تھیں۔ لیکن رفتہ رفتہ ایک کے بعد دوسری برائی آئی۔ دوسری کے بعد تیسری برائی شروع ہوئی، اس طرح برائیوں میں اضافہ ہوتا چلا گیا، اور کسی برائی کے موقع پر خاندان میں سے کسی اللہ کے بندے نے اسٹینڈ نہیں لیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ برائیاں پھیلتی چلی گئیں ـــــ یاد رکھئے، اگر ہم آج اسٹینڈ نہیں لیں گے۔ اور ان برائیوں کو روکنے کی کوشش نہیں کریں گے تو یہ برائیاں اور آگے بڑھیں گی چنانچہ تقریبات میں مرد و عورت کے مخلوط اجتماع کا سلسلہ تو جاری تھا، اب سننے میں یہ آرہا ہے کہ ان اجتماعات میں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کا رقص بھی شروع ہوتا جارہا ہے۔ اب آپ اس موقع پر بھی ہتھیار ڈال کر خاموش بیٹھ جائیں۔ اور اپنی بہو بیٹیوں کو رقص کرتا ہوا دیکھا کریں، لیکن شرکت کرنا نہ چھوڑیں۔ کب تک ہتھیار ڈالتے جاؤ گے؟ کب تک ان کے برا ماننے کی پرواہ کروگے؟ کوئی آخر حد تو ہوگی جہاں جاکر یہ سیلاب رکے گا؟ ـــــ یاد رکھئے، یہ سیلاب اس وقت تک نہیں رکے گا جب تک کوئی اللہ کا بندہ

ڈٹ کر یہ نہیں کہے گا کہ یا تو مجھے شریک نہ کرو، اور اگر شریک کرنا ہے تو یہ کام نہ کرو، اگر خاندان کے دو چار با اثر افراد یہ کہدیں کہ ہم تو ایسی تقریب میں شریک نہیں ہوں گے تو وہ شخص اس برائی کو چھوڑنے پر مجبور ہوگا۔ یا پھر آپ سے تعلق ختم کرے گا۔

بعض اوقات انسان اپنے خاندانی حقوق کی وجہ سے منع کردیتا ہے کہ چونکہ میرے ساتھ فلاں موقع پر اچھا سلوک نہیں کیا گیا۔ یا میری عزت نہیں کی گئی یا فلاں موقع پر میرا فلاں حق پامال کیا گیا۔ اس لئے جب تک مجھ سے معافی نہیں مانگی جائے گی، اس وقت تک میں اس تقریب میں شریک نہیں ہوں گا۔ شادی بیاہ کے موقع پر خاندانی حقوق کی بنیاد پر اس قسم کے بے شمار جھگڑے کھڑے ہوجاتے ہیں اسی طرح اگر کوئی اللہ کا بندہ دین کی خاطر منع کردے کہ اگر مخلوط اجتماع ہوگا یا رقص ہوگا تو ہم شریک نہیں ہوں گے۔ تو انشاء اللہ ان برائیوں پر روک لگ جائے گی۔

ورنہ ہم سر پکڑ کر روئیں گے

البتہ بعض اوقات لوگ اس معاملے میں افراط و تفریط میں مبتلا ہوجاتے ہیں، یہ بڑا نازک معاملہ ہے کہ آدمی کس بات پر اور کس موقع پر اسٹینڈ لے۔ اور کس بات پر نہ لے۔ اور کس جگہ ڈٹ جائے۔ اور کس جگہ پر نرم پڑجائے، یہ چیز ایسی نہیں ہے جو دو اور دو چار کی طرح بتادی جائے۔ بلکہ اس کو سمجھنے کے لئے کسی رہبر اور رہنما کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ اس موقع پر تمہیں کیا کرنا چاہئے۔ کس جگہ پر سخت بن جاؤ، اور کس جگہ پر نرم پڑجاؤ، اپنی طرف سے فیصلہ کرنے میں بعض اوقات انسان افراط و تفریط میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ اس لئے کہ بعض اوقات ایسا بھی ہوجاتا ہے کہ آدمی ایسی بات پر اسٹینڈ لے لیتا ہے کہ اس سے فائدہ کے بجائے الٹا نقصان ہوجاتا ہے۔ لہٰذا یہ فیصلہ کسی رہنما کی رہنمائی میں کرنا چاہئے۔

لیکن مخلوط اجتماع والا معاملہ ایسا ہے کہ اس کے بارے میں ہر شخص کو چاہئے کہ

وہ اسٹینڈ لے۔ یاد رکھئے، اگر آج ہم اسٹینڈ نہیں لیں گے تو کل کو سر پکڑ کر روئیں گے اور جب پانی سر سے گزر جائے گا اس وقت یاد کرو گے کہ کسی کہنے والے نے کیا بات کہی تھی۔ ابھی وقت ہے کہ اس فتنہ کو روکا جاسکتا ہے۔ اس لئے اس طریقے سے اس فتنے کو روکنے کی کوشش کیجئے۔ خدا کے لئے اپنی جانوں پر رحم کریں، اور یہ سوچیں کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دینا ہے۔ اور اپنی قبر میں جانا ہے اور اپنے موجودہ طرز عمل پر نظر ثانی کریں۔ اور یہ جو غفلت کا عالم طاری ہے کہ جو شخص جس طرف جارہا ہے۔ جانے دو۔ اس کو روکنے کی کوئی فکر اور پروا نہیں ہے۔ اور نہ ہی اس کے جانے سے دل دکھتا ہے۔ یہ طرز عمل بڑا خطرناک ہے۔ اس کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

منکرات سے روکنے کا دوسرا درجہ

اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے برائی سے روکنے کا دوسرا درجہ یہ بیان فرمایا کہ اگر اس برائی کو ہاتھ سے روکنے کی طاقت نہ ہو تو زبان سے روکو۔ زبان سے روکنے کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص برائی کے اندر مبتلا ہے، اس کو ہمدردی سے کہے کہ بھائی صاحب، آپ یہ کام غلط کر رہے ہیں۔ یہ کام نہ کریں۔ لیکن زبان سے کہتے وقت ہمیشہ یہ اصول پیش نظر رہنا چاہئے کہ حق گوئی، یا حق کی دعوت یا تبلیغ یہ کوئی پتھر نہیں ہے کہ اس کو تم نے اٹھا کر مار دیا۔ یہ کوئی لٹھ نہیں ہے کہ اس سے دوسرے کا سر پھاڑ دیا، بلکہ یہ ایک خیر خواہی اور محبت و شفقت کے انداز سے کہنے والی چیز ہے، اللہ تعالیٰ نے صاف صاف فرمادیا کہ:

﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ﴾ (سورۃ النحل:۱۲۵)

"یعنی لوگوں کو اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور نرمی سے اور موعظہ حسنہ سے بلاؤ"۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نرم گوئی کی تلقین

میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی طرف بھیجا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کو تلقین کرتے ہوئے فرمایا:

﴿فَقُوْلَا لَہٗ قَوْلًا لَّیِّنًا﴾ (سورۃ طٰہٰ: ۴۴)

اے موسیٰ اور ہارون، جب تم فرعون کے پاس جاؤ، تو اس سے نرمی سے بات کرنا۔ اب دیکھئے یہ تلقین فرعون کے بارے میں فرمائی، جب کہ اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ یہ بدبخت راہ راست پر آنے والا نہیں ہے۔ یہ ضدی اور ہٹ دھرم ہے۔ اور آخر وقت تک ایمان نہیں لائے گا۔ لیکن اس کے باوجود اس کے بارے حکم دیا کہ اس سے نرمی سے بات کرنا۔ میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ آج تم حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بڑھ کر مصلح نہیں ہوسکتے۔ اور تمہارا مخالف فرعون سے بڑھ کر گمراہ نہیں ہوسکتا، جب ان کو نرمی سے بات کرنے کا حکم دیا گیا ہے تو پھر ہمارے لئے تو اور زیادہ واجب ہے کہ ہم نرمی سے بات کریں۔ یہ نہ ہو کہ جب دوسرے کو برائی میں مبتلا دیکھ کر زبان چلانی شروع کی تو وہ زبان تلوار بن جائے۔

زبان سے روکنے کے آداب

بلکہ زبان سے روکنے کے بھی کچھ آداب ہیں، مثلاً یہ کہ مجمع کے سامنے نہ کہے، اس کو رسوا اور ذلیل نہ کرے، ایسے انداز سے نہ کہے جس سے اس کو اپنی سبکی محسوس ہو، بلکہ تنہائی میں محبت اور شفقت اور پیار سے، خیرخواہی سے سمجھائے۔ بعض لوگ یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ آج کل لوگ نرمی سے بات نہیں مانتے، بقول

کسی کے: "ملاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے" تو بھائی اگر وہ تمہاری بات نہیں مانتے تو تم داروغہ نہیں ہو۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے اوپر یہ فریضہ عائد نہیں کیا گیا کہ تمہاری زبان سے دوسرے کی ضرور اصلاح ہو جانی چاہئے، بلکہ تمہارا فریضہ صرف اتنا ہے کہ تم حق نیت سے حق طریقے سے حق بات کہدو، لہذا زبان سے کہتے وقت اس کی اصلاح کی نیت ہونی چاہئے، مثلاً اگر کوئی شخص بیمار ہو جائے تو ڈاکٹر اس پر غصہ نہیں کرتا کہ تو بیمار کیوں ہوا؟ بلکہ اس کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرتا ہے، اس کا علاج کرتا ہے، اس کے اوپر ترس کھاتا ہے۔ اسی طرح جو شخص کسی گناہ کے اندر مبتلا ہے، وہ درحقیقت بیمار ہے، وہ ترس کھانے کے لائق ہے، اس لئے اس پر غصہ نہ کرو، بلکہ اس کو شفقت اور محبت کے ساتھ سمجھانے کی کوشش کرو۔

ایک نوجوان کا واقعہ

ایک نوجوان حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا، اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ، مجھے زنا کرنے اور بدکاری کرنے کی اجازت دیدیجئے، اس لئے کہ میں اپنے اوپر کنٹرول نہیں کرسکتا ـــــ آپ ذرا اندازہ لگائیے کہ وہ نوجوان ایک ایسے فعل کی اجازت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے طلب کر رہا ہے جس کے حرام ہونے پر تمام مذاہب متفق ہیں۔ آج اگر کسی پیر یا شیخ سے کوئی شخص اس طرح کی اجازت مانگے تو غصے کے مارے اس کا پارہ کہیں سے کہیں پہنچ جائے، لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر قربان جائیے کہ آپ نے اس پر ذرہ برابر بھی غصہ نہیں کیا۔ اور نہ اس پر ناراض ہوئے، آپ سمجھ گئے کہ یہ بیچارہ بیمار ہے، یہ غصہ کا مستحق نہیں ہے، بلکہ ترس کھانے کا مستحق ہے ـــــ چنانچہ آپ نے اس نوجوان کو اپنے قریب بلایا، اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا، پھر اس سے فرمایا کہ اے بھائی تم نے مجھ سے ایک سوال کیا، کیا ایک سوال میں بھی تم سے کرلوں؟ اس نوجوان نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا سوال ہے؟ آپ نے فرمایا کہ یہ بتاؤ کہ اگر

کوئی دوسرا آدمی تمہاری بہن کے ساتھ یہ معاملہ کرنا چاہے تو کیا تم اس کو پسند کروگے؟ اس نوجوان نے کہا کہ نہیں یا رسول اللہ، پھر آپ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص تمہاری بیٹی کے ساتھ یا تمہاری ماں کے ساتھ یہ معاملہ کرنا چاہے تو کیا تم اس کو پسند کروگے؟ اس نوجوان نے کہا کہ نہیں یا رسول اللہ، میں تو پسند نہیں کروں گا۔ پھر آپ نے فرمایا کہ تم جس عورت کے ساتھ یہ معاملہ کروگے وہ بھی تو کسی کی بہن ہوگی، کسی کی بیٹی ہوگی، کسی کی ماں ہوگی، تو دوسرے لوگ اپنی بہن اپنی بیٹی سے اور اپنی ماں کے ساتھ اس معاملے کو کس طرح پسند کریں گے؟ یہ سن کر اس نوجوان نے کہا کہ یا رسول اللہ، اب بات سمجھ آگئی۔ اب میں دوبارہ یہ کام نہیں کروں گا۔ اور اب میرے دل میں اس کام کی نفرت بیٹھ گئی ہے ــــ اس طریقے سے آپ نے اس کی اصلاح فرمائی۔

ایک دیہاتی کا واقعہ

ایک دیہاتی مسجد نبوی میں آیا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کے ساتھ مسجد نبوی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس دیہاتی نے آکر جلدی جلدی دو رکعتیں پڑھیں۔ اور نماز کے بعد یہ عجیب و غریب دعا مانگی کہ:

﴿اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنِيْ وَمُحَمَّدًا وَّلَا تَرْحَمْ مَعَنَا اَحَدًا﴾

"اے اللہ! مجھ پر اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر رحم کیجئے، اور ہمارے علاوہ کسی پر رحم مت کیجئے"۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی یہ دعا سن کر فرمایا کہ تم نے اللہ تعالیٰ کی وسیع رحمت کو تنگ کردیا۔ تھوڑی دیر بعد اس اعرابی نے مسجد نبوی کے صحن میں بیٹھ کر پیشاب کردیا۔ صحابہ کرام نے جب اس کو یہ حرکت کرتے ہوئے دیکھا تو اس کو روکنے کے لئے اس کی طرف دوڑے۔ اور اس کو برا بھلا کہنا شروع کردیا۔ جب

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو آپ نے صحابہ کرام کو روکا اور فرمایا کہ اس کا پیشاب مت بند کرو۔ اس کو پیشاب کرنے دو۔ جب وہ پیشاب کرچکا تو پھر صحابہ کرام سے فرمایا کہ اب جاکر مسجد کو دھوکر پاک کردو۔ پھر اس اعرابی کو آپ نے بلاکر سمجھایا کہ یہ مسجد اس مقصد کے لئے نہیں ہے کہ اس میں گندگی کی جائے، اور اس کو ناپاک کیا جائے، یہ تو اللہ کا گھر ہے، اس کو پاک رکھنا چاہئے۔ اس طرح آپ نے پیار اور شفقت کے ساتھ اس کو سمجھا دیا —— آج ہمارے سامنے کوئی اس طرح پیشاب کردے تو ہم لوگ اس کی تکہ بوٹی کردیں۔ لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ڈانٹا تک نہیں۔

ہمارا انداز تبلیغ

اس حدیث کے ذریعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغ و دعوت کے آداب بتائے۔ آج یا تو لوگوں کے اندر دعوت و تبلیغ کرنے کا جذبہ ہی پیدا نہیں ہوتا، لیکن اگر کسی کے دل میں یہ جذبہ پیدا ہوگیا تو بس اب دنیا والوں پر آفت آگئی۔ کسی کو بھی مسجد کے اندر کوئی غلط کام کرتے ہوئے دیکھ لیا تو اب اس کو ڈانٹ ڈپٹ شروع کردی —— یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت نہیں ہے۔ ہر بات کہنے کا ایک ڈھنگ اور سلیقہ ہوتا ہے۔ اس ڈھنگ سے بات کہنی چاہئے۔ اور دل میں یہ جذبہ ہونا چاہئے کہ یہ اللہ کا بندہ ایک غلطی میں کسی وجہ سے مبتلا ہوگیا ہے، میں اس کو صحیح بات بتادوں۔ تاکہ یہ راہ راست پر آجائے، اپنی بڑائی جتانے کا جذبہ یا اپنا علم بگھارنے کا جذبہ نہ ہو، کیونکہ یہ جذبہ دعوت کے اثر کو ختم کردیتا ہے۔

تمہارا کام بات پہنچا دینا ہے

اب ایک اشکال یہ ہوتا ہے کہ اگر ہم اس طرح پیار اور نرمی سے لوگوں کو روکتے ہیں تو لوگ مانتے نہیں ہیں —— اس کا جواب یہ ہے کہ لوگوں کا ماننا تمہاری

ذمہ داری نہیں ہے۔ بلکہ اپنی بات لوگوں تک پہنچا دینا یہ تمہاری ذمہ داری ہے۔
قرآن کریم میں واقعہ لکھا ہے کہ ایک قوم گمراہی میں نافرمانی میں غرق تھی۔ اس کی اصلاح کی کوئی امید نہیں تھی، اور ان پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آنے والا تھا۔ لیکن عذاب آنے سے پہلے کچھ اللہ کے نیک بندے ان کو تبلیغ کرتے رہے۔ اور نرمی سے سمجھاتے رہے کہ یہ کام مت کرو۔ کسی نے ان نصیحت کرنے والوں سے کہا:

﴿لِمَ تَعِظُونَ قَوْمًا اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ﴾

(سورۃ الاعراف: ۱۶۴)

تم ایک ایسی قوم کو نصیحت کیوں کر رہے ہو جس کو اللہ تعالیٰ نے ہلاک کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ اب تو ان کی اصلاح کی کوئی امید نہیں ہے —— ان اللہ کے نیک بندوں نے —— سبحان اللہ —— کیا عجیب جواب دیا فرمایا کہ: "مَعْذِرَةً اِلٰی رَبِّکُمْ" یعنی یہ تو ہمیں بھی معلوم ہے کہ یہ لوگ معاند ہیں۔ ہٹ دھرم ہیں۔ بات نہیں مانیں گے۔ لیکن ہم ان کو نصیحت کر رہے ہیں، تاکہ ہمارے لئے اللہ تعالیٰ کے سامنے کہنے کا عذر ہوجائے گا۔ جب اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی ہوگی، اور پوچھا جائے گا، کہ تمہارے سامنے یہ گناہ ہو رہے تھے۔ تم نے ان کو روکنے کے لئے کیا کوشش کی تھی؟ اس وقت ہم یہ عذر پیش کرسکیں گے کہ یا اللہ، یہ گناہ ہمارے سامنے ہو رہے تھے۔ لیکن ہم نے اپنے طور پر ان کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ اور راہ راست پر لانے کی کوشش کی تھی۔ اے اللہ، ہم ان کے اندر شامل نہیں تھے۔ ایک داعی حق اور تبلیغ کرنے والا اپنے دل میں اس جواب دہی کے احساس کو دل میں رکھتے ہوئے دعوت دے۔ پھر چاہے کوئی مانے یا نہ مانے، وہ انشاء اللہ بری الذمہ ہوجائے گا۔ حضرت نوح علیہ السلام ساڑھے نو سو سال تبلیغ کرتے رہے، لیکن صرف ۱۹ آدمی مسلمان ہوئے۔ اب اس کا کوئی وبال حضرت نوح علیہ السلام پر نہیں ہوگا، اس لئے کہ مسلمان بنادینا ان کی ذمہ داری نہیں تھی۔ اس لئے تم بھی حق بات حق نیت سے حق طریقے سے نرمی اور خیر خواہی کے جذبے سے کہدو۔ انشاء

اللہ تم بری الذمہ ہو جاؤ گے۔ تجربہ یہ ہے کہ اگر آدمی لگاتار اس جذبے کے ساتھ بات کہتا رہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فائدہ بھی پہنچا دیتا ہے۔

منکرات کو روکنے کا تیسرا درجہ

تیسرا اور آخری درجہ اس حدیث میں یہ بیان فرمایا کہ اگر کسی کے اندر ہاتھ اور زبان سے روکنے کی طاقت نہیں ہے تو پھر تیسرا درجہ یہ ہے کہ دل سے اس کو برا سمجھے، اور دل میں یہ خیال لائے کہ یہ کام اچھا نہیں کر رہا ہے ـــــ البتہ ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب زبان سے کہنے کی بھی طاقت نہ ہو۔ اس وقت یہ تیسرا درجہ آتا ہے، لیکن زبان سے کہنے کی طاقت تو ہر وقت انسان کے اندر موجود ہوتی ہے۔ پھر زبان سے کہنے کی طاقت نہ ہونے کا کیا مطلب ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ زبان سے کہنے کی طاقت نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ شخص اس کو زبان سے روک تو دے گا۔ اور لیکن اس روکنے کے نتائج اس عمل سے بھی زیادہ برے نکلیں گے۔ ایسی صورت میں بعض اوقات خاموش رہنا بہتر ہوتا ہے۔ مثلاً ایک شخص سنت کے خلاف کوئی کام کر رہا ہے۔ آپ کو اس بات کا یقین ہے کہ اگر میں اس کو روکوں گا تو یہ شخص بات ماننے کے بجائے الٹا اس سنت کا مذاق اڑانا شروع کر دے گا۔ اب اگرچہ آپ کے اندر یہ طاقت ہے کہ آپ اس سے کہدیں کہ یہ عمل سنت کے خلاف ہے، ایسا مت کرو۔ بلکہ سنت کے مطابق کرو۔ لیکن آپ کے کہنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اب تک تو صرف سنت کے خلاف کام کر رہا تھا۔ لیکن اب سنت کا مذاق اڑائے گا۔ اور اس کے نتیجے میں کفر کے اندر مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو جائے گا۔ ایسے موقع پر بعض اوقات خاموش رہنا اور کچھ نہ کہنا زیادہ مناسب ہوتا ہے۔ اور اس وقت میں صرف دل سے برا سمجھنا ہی مناسب ہوتا ہے۔

برائی کو دل سے بدلنے کا مطلب

اگر اس حدیث کا صحیح ترجمہ کیا جائے تو یہ ترجمہ ہوگا کہ اگر کسی شخص کے اندر کسی برائی کو زبان سے بدلنے کی طاقت نہیں ہے تو اس کو اپنے دل سے بدل دے، یہ نہیں فرمایا کہ دل سے برا سمجھے۔ بلکہ دل سے بدلنے کا حکم دیا، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دل سے بدلنے کا کیا مطلب ہے؟ علماء کرام نے اس کا مطلب یہ بیان فرمایا کہ اگر کوئی شخص طاقت نہ ہونے کی وجہ سے ہاتھ استعمال نہ کرسکے نہ ہی زبان استعمال کرسکا تو اب اس کے دل میں اس برائی کے خلاف اتنی نفرت ہو۔ اور اس کے دل میں اتنی گھٹن ہو کہ اس کے چہرے پر ناگواری کا اثر آجائے، اور اس کی پیشانی پر بل پڑجائے اور آدمی موقع کی تلاش میں رہے کہ کب موقع آئے تو پھر اس کو زبان اور ہاتھ سے اس کو بدل دوں۔ جب انسان کے دل میں کسی چیز کی برائی دل میں بیٹھ جاتی ہے۔ اور دل میں یہ جذبہ اور داعیہ ہوتا ہے کہ کسی طرح یہ برائی ختم ہوجائے تو وہ شخص دن رات اس فکر اور سوچ میں رہتا ہے کہ میں اس برائی کو اپنے ہاتھ اور زبان سے روکنے کے لئے کیا طریقہ اختیار کروں۔ مثلاً ایک شخص کی اولاد خراب ہوگئی، اب اگر باپ جبر و تشدد کرتا ہے، اور ہاتھ استعمال کرتا ہے تو اس کا فائدہ نہیں ہوتا۔ اگر زبان سے سمجھاتا ہے تو اس کا اثر بھی ظاہر نہیں ہوتا۔ ایسا شخص دل کے اندر کتنا بے چین ہوگا، اس کی راتوں کی نیندیں حرام ہوجائیں گی کہ میں کس طرح اس کو بری عادت سے نکال دوں۔ یہ بے چینی اور بیتابی انسان کو خود راستہ سجھا دیتی ہے کہ کس موقع پر کس طرح بات کہوں، اور کس طرح اس کے دل میں اپنی بات اتار دوں۔ اس کے نتیجے میں ایک نہ ایک دن اس کی بات کا اثر ہوگا۔

اپنے اندر بے چینی پیدا کریں

آج ہمارے معاشرے میں جتنے منکرات، برائیاں اور گناہ بر سرعام ہو رہے ہیں۔ فرض کریں کہ آج ہمارے اندر ان کو ہاتھ سے بدلنے کی طاقت نہیں ہے۔ زبان سے کہنے کی طاقت نہیں۔ لیکن اگر ہم میں سے ہر شخص اپنے دل کے اندر یہ بے چینی پیدا کرلے کہ معاشرے کے اندر یہ کیا ہو رہا ہے۔ ان برائیوں کو کسی طرح رکنا چاہئے۔ اور یہ بے چینی اور بیتابی اس درجہ میں ہونی چاہئے جس طرح ایک آدمی کے پیٹ میں درد ہو رہا ہو۔ جب تک وہ درد ختم نہیں ہو جاتا اس وقت تک انسان بے چین رہتا ہے، اسی طرح ہم سب کے دلوں میں یہ بے چینی اور بیتابی پیدا ہو جائے تو اس کے نتیجے میں آخر کار معاشرے سے یہ منکرات اور برائیاں ختم ہو جائیں گی۔ اور ان برائیوں کو روکنے کا راستہ مل جائے گا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور بے چینی

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسے معاشرے کے اندر تشریف لائے تھے جہاں گناہ تو گناہ، بلکہ شرک، کفر، بت پرستی۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کھلم کھلا بغاوت، علانیہ نافرمانیاں ہو رہی تھیں، کوئی شخص بھی بات سننے کو تیار نہیں تھا، اس وقت آپ کو یہ حکم دیا گیا کہ ان سب کی اصلاح آپ کو کرنی ہے۔ بعثت کے بعد تین سال ایسے گزرے ہیں کہ ان میں آپ کو تبلیغ اور دعوت کی بھی اجازت نہیں تھی۔ ان تین سال کے اندر آپ معاشرے میں ہونے والی برائیوں کو دیکھتے رہے، اور غار حرا کی تنہائیوں میں جا کر اللہ جل شانہ سے مناجات فرما رہے ہیں۔ اور معاشرے میں ہونے والے منکرات کو دیکھ کر طبیعت میں ایک گھٹن اور ایک بے چینی پیدا ہو رہی ہے کہ کس طرح اس کو دور کروں، آخر کار آپ کی یہ بے چینی اور بیتابی رنگ لاتی ہے۔ اور اس کے بعد جب آپ کو تبلیغ اور دعوت کی اجازت ملتی ہے تو پھر آپ اسی

سے ماحول کے اندر اپنی دعوت کے ذریعہ انقلاب برپا فرماتے ہیں، اس بے چینی اور بیتابی کا ذکر قرآن کریم نے اس طرح فرمایا ہے کہ:

﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ﴾

(سورۃ الشعراء: ۳)

"کیا آپ اپنی جان کو اس اندیشے میں ہلاک کرڈالیں گے کہ یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لاتے؟"

اللہ تعالیٰ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: ان علیک الا البلاغ آپ کے ذمہ صرف تبلیغ کا فریضہ ہے آپ اپنی جان کو ہلکان نہ کیجئے، اور اتنے پریشان نہ ہوں —— لیکن آپ کے دل میں اس قدر بے چینی تھی کہ جو شخص بھی آپ کے پاس آتا، آپ اس کے بارے میں یہ خواہش کرتے کہ کسی طرح میں اس کو جہنم کے عذاب سے بچالوں۔ اور دین کی بات اس کے دل میں اتاردوں۔

ہم نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں

آج ہمارے اندر یہی خرابی ہے کہ ہمارے اندر وہ بے چینی اور بیتابی نہیں ہے۔ اول تو آج برائیوں کو برا سمجھنے کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ معاشرے اور ماحول کے اثر سے ہماری یہ حالت ہوگئی ہے کہ اگر ہم میں سے کوئی شخص برائی نہیں بھی کررہا ہے۔ بلکہ خود ان سے بچا ہوا ہے، وہ صرف یہ سوچ کر بچا ہوا ہے کہ اب تو بڑھاپا آگیا، جوانی ختم ہوگئی ہے، اب کیا میں اپنے طرز عمل میں تبدیلی پیدا کروں، اس شرم سے وہ اپنی پرانی طرز زندگی کو نہیں بدل رہا ہے —— لیکن اولاد جس غلط راستے پر جارہی ہے۔ اس کی برائی دل کے اندر نہیں ہے، اگر دل میں برائی ہوتی تو اس کے لئے بے چین اور بیتاب ہوتا۔ معلوم ہوا کہ دل میں ان کی برائی

موجود نہیں۔ اور اولاد کے بارے میں یہ سوچ لیا ہے کہ ہم نے اپنی زندگی گزار لی ہے۔ یہ نئی نسل کے لوگ ہیں۔ اگر انہوں نے اپنی خوش گپیوں اور کھیل کود کے نئے طریقے نکال لئے ہیں تو چلو ان کو کرنے دو۔ یہ سوچ کر خاموش بیٹھ جاتے ہیں۔ اور ان کو نہیں روکتے۔ اور دل میں ان کی طرف سے کوئی بے چینی اور بیتابی نہیں ہے۔

بات میں تاثیر کیسے پیدا ہو؟

جب انسان کے دل میں معاشرے کی طرف سے بے چینی اور بیتابی پیدا ہو جاتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اس کی بات میں تاثیر بھی پیدا فرما دیتے ہیں، حضرت مولانا نانوتوی صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ "اصل میں تبلیغ و دعوت کا حق اس شخص کو پہنچتا ہے جس کے دل میں تبلیغ و دعوت کا جذبہ ایسا ہو گیا ہو، جیسے حوائج ضروریہ کو پورا کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً بھوک لگ رہی ہے۔ اور جب تک کھانا نہیں کھالے گا۔ چین نہیں آئے گا۔ جب تک ایسا داعیہ کے دل کے اندر پیدا نہ ہو۔ اس وقت تک اس کو دعوت و تبلیغ کا حق نہیں ہے۔ جیسے حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں تبلیغ و دعوت کا ایسا ہی جذبہ پیدا فرمادیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کے ایک ایک وعظ میں سینکڑوں انسان ان کے ہاتھ پر گناہ سے توبہ کرتے تھے۔ اس لئے کہ بات دل سے نکلتی تھی۔ اور دل پر اثر انداز ہوتی تھی۔

حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کا ایک واقعہ

حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ دہلی کی جامع مسجد میں ڈیڑھ دو گھنٹے کا وعظ فرمایا۔ وعظ سے فارغ ہونے کے بعد آپ جامع مسجد کی سیڑھیوں سے نیچے اتر رہے تھے، اتنے میں ایک شخص بھاگتا ہوا مسجد کے اندر آیا،

اور آپ ہی سے پوچھا کہ کیا مولوی اسمٰعیل صاحب کا وعظ ختم ہوگیا؟ آپ نے جواب دیا کہ ہاں بھائی، ختم ہوگیا۔ اس نے کہا کہ مجھے بہت افسوس ہوا، اس لئے کہ میں تو بہت دور سے وعظ سننے کے لئے آیا تھا، آپ نے پوچھا کہ کہاں سے آئے تھے؟ اس نے جواب دیا کہ میں فلاں گاؤں سے آیا تھا۔ اور اس خیال سے آیا تھا کہ میں ان کا وعظ سنوں گا، افسوس کہ ان کا وعظ ختم ہوگیا۔ اور میرا آنا بیکار ہوگیا، حضرت مولانا نے فرمایا کہ تم پریشان مت ہو۔ میرا ہی نام اسمٰعیل ہے۔ آؤ یہاں بیٹھ جاؤ، چنانچہ اس کو وہیں سیڑھیوں پر ہی بٹھادیا، فرمایا کہ میں نے ہی وعظ کہا تھا۔ میں تمہیں دوبارہ سنا دیتا ہوں، جو کچھ میں نے وعظ میں کہا تھا، چنانچہ سیڑھیوں پر بیٹھ کر سارا وعظ دوبارہ دہرا دیا ــــــ بعد میں کسی شخص نے کہا کہ حضرت! آپ نے کمال کردیا کہ صرف ایک آدمی کے خاطر پورا وعظ دوبارہ دہرادیا؟ جواب میں حضرت مولانا نے فرمایا کہ میں نے پہلے بھی ایک ہی کے خاطر وعظ کہا تھا۔ اور دوبارہ بھی ایک ہی کی خاطر کہا۔ یہ مجمع کوئی حقیقت نہیں رکھتا، جس ایک اللہ کے خاطر پہلی بار کہا تھا۔ دوسری مرتبہ بھی اسی ایک اللہ کے خاطر کہدیا ــــــ یہ تھے حضرت مولانا شاہ محمد اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ۔ ایسا جذبہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں پیدا فرمادیا تھا۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس اخلاص اور اس جذبہ اور اس بے چینی اور بیتابی کا کوئی حصہ ہمارے دلوں میں بھی پیدا فرمادے کہ ان منکرات کو دیکھ کر یہ بے چینی اور بیتابی پیدا ہوجائے کہ ان منکرات کو کس طرح ختم کیا جائے، اور کس طرح مٹایا جائے۔

یاد رکھئے! جس دن ہمارے دلوں میں یہ بیتابی اور بے چینی پیدا ہوگئی، اس دن آدمی کم از کم اپنے گھر کی اصلاح تو ضرور کرلے گا، اگر گھر کی اصلاح نہیں ہورہی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی بے چینی اور بیتابی دل میں موجود نہیں ہے۔ بلکہ آدمی وقت گزار رہا ہے۔

خلاصہ

بہرحال، ہر انسان کے ذمے انفرادی تبلیغ فرض عین ہے، جب انسان اپنے سامنے کوئی برائی ہوتی ہوئی دیکھے تو اس برائی کو ختم کرنے کی کوشش کرے، پہلے ہاتھ سے ختم کرنے کی کوشش کرے۔ اگر ہاتھ سے نہ ہوسکے تو زبان سے روکنے کی کوشش کرے، اور اگر زبان سے نہ ہوسکے تو دل سے اس کو برا جانے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان تمام باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

جنت کے مناظر

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱/۱۸۸، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

تاریخ خطاب : ۱۷ر نومبر ۱۹۹۵ء

مقام خطاب : جامع مسجد بیت المکرم
گلشن اقبال کراچی

وقت خطاب : بعد نماز عصر تا مغرب

اصلاحی خطبات : جلد نمبر ۹

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

جنّت کے مناظر

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره و نؤمن به ونتوكل عليه. ونعوذ بالله من شرور انفسنا ومن سيئات اعمالنا، من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادي له، ونشهد ان لا اله الا الله وحده لاشريك له، ونشهدان سيدنا وسندنا ومولانا محمدًا عبده ورسوله. صلى الله تعالى عليه وعلى آله واصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيرًا كثيرا۔

اما بعد!

فاعوذ بالله من الشيطن الرجيم - بسم الله الرحمن الرحيم

﴿وتلك الجنة التي اورثتموها بما كنتم تعملون، لكم فيها فاكهة كثيرة منها تاكلون﴾ (الزخرف: ۷۲، ۷۳)

آمنت بالله صدق الله مولانا العظيم و صدق رسوله النبي الكريم، ونحن على ذلك من الشاهدين والشاكرين والحمد لله رب العلمين۔

آخرت کے حالات جاننے کا راستہ

بزرگان محترم و برادران عزیز! مرنے کے بعد کے حالات جاننے کا انسان کے پاس کوئی راستہ نہیں ہے، کوئی علم کوئی فن کوئی معلومات ایسی نہیں ہیں جو انسان کو مرنے کے بعد کے حالات سے باخبر کر سکے۔ جو شخص اس دنیا سے وہاں چلا جاتا ہے

اس کو وہاں کے حالات کی خبر ہوتی ہے، لیکن ہمیں پھر اس جانے والے کی خبر نہیں رہتی۔

ایک بزرگ کا عجیب قصہ

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ ایک بزرگ کا قصہ سنایا کرتے تھے کہ ایک بزرگ تھے، ان کے مریدین نے ایک مرتبہ ان بزرگ سے کہا کہ حضرت! جو شخص بھی مرنے کے بعد اس دنیا سے جاتا ہے وہ ایسا جاتا ہے کہ پلٹ کر خبر نہیں لیتا، نہ تو یہ بتاتا ہے کہ کہاں پہنچا اور نہ یہ بتاتا ہے کہ اس کے ساتھ کیا معاملہ ہوا اور نہ یہ بتاتا ہے کہ اس نے کیا مناظر دیکھے، کوئی ایسی تدبیر بتایئے کہ ہمیں بھی وہاں کی کوئی خبر مل جائے۔ ان بزرگ نے فرمایا: ایسا کرو کہ جب میرا انتقال ہو جائے اور مجھے قبر میں دفن کرو تو قبر کے اندر میرے پاس تم ایک کاغذ اور قلم رکھ دینا، مجھے اگر موقع ملا تو میں لکھ کر تمہیں وہاں کی خبر بتلا دوں گا کہ وہاں کیا واقعات پیش آئے۔ لوگ بہت خوش ہوئے کہ چلو کوئی بتانے والا ملا۔

جب ان بزرگ کا انتقال ہوا تو ان کی وصیت کے مطابق ان کو دفن کرتے وقت ان کے ساتھ ایک کاغذ اور قلم بھی رکھ دیا۔ ان بزرگ نے یہ بھی وصیت کی تھی کہ دوسرے دن قبر پر آکر وہ کاغذ اٹھا لینا، اس پر تمہیں لکھا ہوا ملے گا۔ چنانچہ اگلے دن لوگ ان کی قبر پر پہنچے تو دیکھا کہ ایک پرچہ ان کی قبر پر لکھا ہوا پڑا ہے۔ اس پرچے کو دیکھ کر لوگ بہت خوش ہوئے کہ آج ہمیں اس دنیا کی خبر مل جائے گی، لیکن جب پرچہ اٹھا کر پڑھا تو اس پر یہ لکھا ہوا تھا کہ:

"یہاں کے حالات دیکھنے والے ہیں، بتانے والے نہیں"۔

واللہ اعلم۔ یہ واقعہ کیسا ہے؟ سچا یا جھوٹا ہے؟ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں تو ہے کہ ایسا کردیتے۔ اس لئے یہ واقعہ سچا بھی ہو سکتا ہے اور جھوٹا اور منگھڑت بھی ہو سکتا

ہے۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ وہاں کے حالات بتانے کے نہیں ہیں، دیکھنے کے ہیں۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے وہاں کے حالات کو ایسا راز کے اندر رکھا ہے کہ کسی پر بھی ذرا سا ظاہر نہیں ہوتا۔ بس قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث میں جتنی باتیں بتادیں اس سے زیادہ کسی کو وہاں کے حالات کے بارے میں معلوم ہونے کا کوئی راستہ نہیں۔ قرآن وحدیث کے ذریعہ جو حالات ہم تک پہنچے ہیں، ان کو یہاں پر تھوڑا سا بیان کرنا مقصود ہے۔

ادنیٰ جنتی کی جنت کا حال

چنانچہ حضرت مغیرۃ شعبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا کہ اے پروردگار! اہل جنت میں سب سے کم درجہ کس کا ہوگا؟ اور سب سے ادنیٰ آدمی جنت میں کون ہوگا؟ جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ جب سارے جنتی جنت میں چلے جائیں گے اور جہنم والے جہنم میں چلے جائیں گے، ایک آدمی جنت میں جانے سے رہ گیا ہوگا اور جنت کے آس پاس کے علاقے میں بیٹھا ہوگا، اللہ تعالیٰ اس سے فرمائیں گے کہ جب تم دنیا میں تھے اس وقت تم نے بڑے بڑے بادشاہوں کا ذکر سنا ہوگا، ان بادشاہوں میں سے اپنی مرضی سے چار بادشاہوں کا انتخاب کر کے میرے سامنے بیان کرو، اور پھر ان بادشاہوں کی سلطنتوں کے جتنے حصے تھے، ان میں سے جتنے حصوں کا تم نام بیان کرسکتے ہو بیان کرو، چنانچہ وہ شخص کہے گا کہ یا اللہ! میں نے فلاں فلاں بادشاہ کا ذکر سنا تھا، ان کی سلطنت بڑی عظیم تھی، اس کو بڑی نعمتیں ملی ہوئی تھیں، میرا دل چاہتا ہے کہ مجھے بھی ویسی ہی سلطنت مل جائے۔ اس طرح وہ ایک ایک کر کے چار مختلف بادشاہوں کی سلطنت کا نام لے گا۔ اللہ تعالیٰ اس سے فرمائیں گے کہ تم نے ان کی سلطنتوں کے اور ان کے علاقوں کے نام تو بتادئے لیکن ان بادشاہوں کو جو لذتیں حاصل تھیں اور ان کے بارے میں تم نے سنا ہوگا کہ فلاں بادشاہ ایسے عیش و آرام

میں ہے، ان لذتوں میں سے جو لذت تم حاصل کرنا چاہتے ہو، ان کا ذکر کرو۔ چنانچہ وہ شخص ان لذتوں کا ذکر کرے گا کہ میں نے سنا تھا کہ فلاں بادشاہ کو یہ نعمت حاصل تھی، فلاں بادشاہ کو یہ لذت حاصل تھی، یہ لذتیں مجھے بھی مل جائیں۔

پھر اللہ تعالیٰ اس سے سوال کریں گے کہ جن بادشاہوں کا تم نے نام لیا ہے اور ان کی جن سلطنتوں کو تم نے گنوایا ہے اور ان کی جن نعمتوں اور لذتوں کا تم نے ذکر کیا ہے اگر وہ تمہیں مل جائیں تو تم راضی ہو جاؤ گے؟ وہ بندہ عرض کرے گا کہ یا اللہ! اس سے بڑی اور کیا نعمت ہو سکتی ہے، میں تو ضرور راضی ہو جاؤں گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اچھا تم نے جتنی سلطنتوں کا نام لیا اور ان کی جن نعمتوں اور لذتوں کا تم نے نام لیا اس سے دس گنا زیادہ تمہیں عطا کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمائیں گے کہ جنت کا سب سے کم تر آدمی جس کو سب سے ادنیٰ درجہ کی جنت ملے گی وہ یہ شخص ہوگا۔ موسیٰ علیہ السلام فرمائیں گے کہ یا اللہ! جب ادنیٰ آدمی کا یہ حال ہے تو جو آپ کے پسندیدہ بندے ہوں گے جن کو اعلیٰ ترین درجات عطا کیے گئے ہوں گے، ان کا کیا حال ہوگا؟ جواب میں اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اے موسیٰ! جو میرے پسندیدہ بندے ہوں گے ان کے اکرام کی چیزیں تو میں نے اپنے ہاتھ سے بنا کر ان کو خزانوں میں مہر لگا کر محفوظ کر کے رکھ دی ہیں اور ان میں وہ چیزیں ہیں کہ:

﴿مالم ترعین ولم یسمع اذن ولم یخطر علی قلب احد من الخلق﴾

یعنی وہ نعمتیں ایسی ہیں کہ آج تک کسی آنکھ نے نہیں دیکھا اور آج تک کسی کان نے ان کا تذکرہ نہیں سنا، اور آج تک کسی انسان کے دل پر ان کا خیال بھی نہیں گزرا، ایسی نعمتیں میں نے تیار کر کے رکھی ہوئی ہیں۔

ایک اور ادنیٰ جنتی کی جنت

ایک اور حدیث میں خود حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کا حال بیان فرمایا کہ سب سے آخر میں جو شخص جنت میں داخل ہوگا وہ ایسا شخص ہوگا جو اپنے اعمالِ بد کی پاداش میں جہنم میں ڈال دیا جائے گا، کیونکہ اگر آدمی مؤمن ہی کیوں نہ ہو، لیکن اگر اعمال خراب کئے ہیں تو پہلے اس کو ان اعمال کی سزا بھگتنی پڑے گی، اس لئے اس کو پہلے جہنم میں ڈال دیا جائے گا، اب وہ شخص جہنم میں جھلس رہا ہوگا تو اس وقت وہ اللہ تعالیٰ سے کہے گا کہ یا اللہ! اس جہنم کی تپش اور اس کی گرمی نے تو مجھے جھلسا دیا ہے، آپ کی بڑی مہربانی ہوگی کہ آپ مجھے تھوڑی دیر کے لئے جہنم سے نکال کر اوپر کنارے پر بٹھا دیں تاکہ میں تھوڑی دیر کے لئے جلنے سے بچ جاؤں۔

اللہ تعالیٰ اس سے فرمائیں گے کہ اگر ہم تمہیں وہاں بٹھا دیں گے تو تم کہو گے کہ مجھے اور آگے پہنچا دو۔ وہ بندہ کہے گا کہ یا اللہ! میں وعدہ کرتا ہوں کہ بس ایک مرتبہ یہاں سے نکال کر اوپر بٹھا دیں، پھر آگے جانے کے لئے نہیں کہوں گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اچھا ہم تمہاری بات مان لیتے ہیں۔ چنانچہ اس کو جہنم سے نکال کر اوپر بٹھا دیا جائے گا۔ جب وہاں تھوڑی دیر تک بیٹھے گا اور کچھ اس کے ہوش وحواس ٹھکانے پر آئیں گے تو تھوڑی دیر کے بعد کہے گا کہ یا اللہ! آپ نے مجھے یہاں بٹھا دیا اور جہنم سے نکال تو دیا لیکن ابھی جہنم کی لپٹ یہاں تک آرہی ہے، تھوڑی دیر کے لئے اور دور کر دیں کہ یہ لپٹ بھی نہ آئے۔

اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تم نے ابھی وعدہ کیا تھا کہ آگے جانے کے لئے نہیں کہوں گا، اب تو وعدہ خلافی کر رہا ہے؟ وہ کہے گا یا اللہ! مجھے تھوڑا اور آگے بڑھا دیں تو پھر میں کچھ نہیں کہوں گا اور کچھ نہیں مانگوں گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اس کو تھوڑا سا اور دور کر دیں گے۔ اور اب اس کو اس جگہ سے جنت نظر آنے لگے گی۔ پھر تھوڑی

دیر کے بعد کہے گا کہ یا اللہ! آپ نے مجھے جہنم سے تو نکال دیا اور اب مجھے یہ جنت نظر آرہی ہے، آپ تھوڑی اجازت دیدیں کہ میں اس جنت کا تھوڑا سا نظارہ کر لوں اور اس کے دروازے کے پاس جاکر دیکھ آؤں کہ یہ جنت کیسی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تو پھر وعدہ خلافی کر رہا ہے۔ وہ شخص کہے گا کہ یا اللہ! جب آپ نے اپنے کرم سے یہاں تک پہنچا دیا تو ایک جھلک مجھے جنت کی بھی دکھادیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ جب تمہیں ایک نظر جنت کی دکھاؤں گا تو کہے گا کہ مجھے ذرا اندر بھی داخل کر دیں۔ وہ شخص کہے گا نہیں یا اللہ! مجھے صرف جنت کی ایک جھلک دکھادیں، اس کے بعد پھر کچھ نہیں کہوں گا۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ اس کو جنت کی ایک جھلک دکھادیں گے۔ لیکن جنت کی ایک جھلک دیکھنے کے بعد وہ اللہ تعالیٰ سے کہے گا یا اللہ! آپ ارحم الراحمین ہیں؟ جب آپ نے مجھے جنت کے دروازے تک پہنچادیا تو اب اے اللہ! اپنے فضل سے مجھے اندر بھی داخل فرما دیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ دیکھ ہم تو تجھ سے پہلے ہی کہہ رہے تھے کہ تو وعدہ خلافی کرے گا لیکن چل، جب ہم نے تجھے اپنی رحمت سے یہاں تک پہنچادیا تو اب ہم تجھے اس میں داخل بھی کردیتے ہیں اور جنت میں تجھے اتنا بڑا رقبہ دیتے ہیں جتنا پوری زمین کا رقبہ ہے۔ وہ شخص کہے گا یا اللہ! آپ ارحم الراحمین ہیں اور میرے ساتھ مذاق کرتے ہیں؟ میں کہاں اور جنت کا اتنا بڑا رقبہ کہاں؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ میں مذاق نہیں کرتا ہوں، تمہیں واقعی جنت کا اتنا بڑا رقبہ عطا کیا جاتا ہے۔

حدیث مسلسل بالضحک

حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حدیث ہنستے ہوئے بیان فرمائی، اور پھر جن صحابی نے یہ حدیث سنی تھی انہوں نے یہ حدیث اپنے شاگردوں کے سامنے ہنستے ہوئے بیان فرمائی، پھر انہوں نے اپنے شاگردوں کو ہنستے

ہوئے بیان فرمائی، یہاں تک کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سے لے کر آج تک جب بھی یہ حدیث بیان کی جاتی ہے تو بیان کرنے والا بھی ہنستا ہے اور سننے والے بھی ہنستے ہیں اسی وجہ سے یہ حدیث "مسلسل بالضحک" کہلاتی ہے۔

پورے کرۂ زمین کے برابر جنت

بہرحال، یہ وہ شخص ہوگا جو سب سے آخر میں جنت میں داخل کیا جائے گا۔ اب آپ اندازہ کریں کہ سب سے آخر میں جنت میں داخل ہونے والے کے بارے میں یہ کہا جارہا ہے کہ جتنا پورا کرۂ زمین ہے، اتنا حصہ جنت میں عطا کیا جائے گا تو پھر اوپر کے درجات والوں کا کیا حال ہوگا اور ان کو جنت میں کتنا بڑا مقام دیا جائے گا۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہم اس دنیا کی چار دیواری میں بیٹھے ہوئے ہیں، ہمیں اس عالم کی ہوا بھی نہیں لگی، اس وجہ سے اس عالم کی وسعتوں کا کوئی اندازہ کر ہی نہیں سکتے، اسی لئے ہمیں اس پر تعجب ہوتا ہے کہ ایک آدمی کو پورے کرۂ ارض کے برابر جگہ کیسے ملے گی؟ اور اگر مل بھی جائے گی تو وہ اتنی بڑی زمین کو لے کر کیا کرے گا؟ یہ اشکال بھی اس لئے ہورہا ہے کہ اس عالم کی ہمیں ہوا بھی نہیں لگی۔

عالمِ آخرت کی مثال

اس عالم آخرت کے مقابلے میں ہماری مثال ایسی ہے جیسے ماں کے پیٹ میں بچہ، اس بچہ کو اس دنیا کی ہوا نہیں لگی ہوتی، اس لئے وہ بچہ اس دنیا کی وسعتوں کا اندازہ نہیں کرسکتا، وہ بچہ ماں کے پیٹ ہی کو سب کچھ سمجھتا ہے لیکن جب وہ بچہ دنیا میں آتا ہے تو اس وقت اس کو پتہ چلتا ہے کہ ماں کا پیٹ تو اس دنیا کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو آخرت کا عالم اپنی رضا کے ساتھ دکھا دے تو پتہ چلے کہ وہ عالم آخرت کیا چیز ہے اور اس کے اندر کتنی وسعت ہے۔ اور وہ عالم مومنوں کے لئے تیار کیا گیا ہے۔

یہ جنت تمہارے لئے ہے

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ الحمد للہ، جنت مؤمنوں کے لئے تیار کی گئی ہے، صاحب ایمان کے لئے تیار کی گئی ہے، اگر تم اللہ جل جلالہ پر ایمان رکھتے ہو تو یقین کرو کہ وہ تمہارے لئے ہی تیار کی گئی ہے، ہاں البتہ اس جنت تک پہنچنے کے لئے اور اس کے راستوں کی رکاوٹوں کو دور کرنے کے لئے تھوڑا سا کام کرنا ہے، بس وہ کام کرلو تو انشاء اللہ وہ جنت تمہاری ہے اور تمہارے لئے تیار کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت اور اپنے فضل وکرم سے ہم سب کو جنت عطاء فرمائے۔ آمین۔

حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ اور آخرت کا دھیان

ایک روایت میں آتا ہے کہ حضرت سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ جو بڑے درجے کے تابعین میں سے ہیں اور بڑے اولیاء اللہ میں سے ہیں۔ حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے شاگرد ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں اپنے استاد حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ جمعہ کے دن کسی بازار میں چلا گیا، ان کو کوئی چیز خریدنی تھی، چنانچہ بازار جاکر وہ چیز خریدلی جب بازار سے واپس لوٹنے لگے تو حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجھ سے فرمایا اے سعید! میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اور تمہیں دونوں کو جنت کے بازار میں جمع کردے۔ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی شان دیکھئے کہ وہ ہر آن اور ہر لمحے آخرت کی کوئی نہ کوئی بات ادنیٰ سی مناسبت سے نکال کر اس کے دھیان کو اور اس کے ذکر کو تازہ کرتے رہتے تھے، تاکہ دنیا کی مشغولیات انسان کو اس طرح اپنے اندر مشغول نہ کر دیں کہ انسان آخرت کو بھول جائے۔ لہٰذا دنیا کا کام کر رہے ہیں، بازار میں خریداری کررہے ہیں اور خریداری کے دوران شاگرد کے سامنے یہ دعا کردی۔

جنّت کے اندر بازار

حضرت سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوہریرۃ ؓ سے پوچھا کہ کیا جنّت میں بھی بازار ہوں گے؟ اس لئے کہ ہم نے یہ سنا ہے کہ جنّت میں ہر چیز مفت ملے گی اور بازار میں خرید و فروخت ہوتی ہے۔ جواب میں حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ وہاں پر بھی بازار ہوں گے، میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ ہر جمعہ کے دن جنّت میں اہل جنّت کے لئے بازار لگا کرے گا۔ پھر اس کی تفصیل حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیان فرمائی ہے کہ جب اہل جنّت جنّت میں چلے جائیں گے اور سب لوگ اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچ جائیں گے، اور خوب عیش و آرام سے زندگی گزار رہے ہوں گے اور وہاں ان کو اتنی نعمتیں دی جائیں گی کہ وہاں سے کہیں اور جانے کا تصوّر بھی نہیں کریں گے۔ تو اچانک یہ اعلان ہوگا کہ تمام اہل جنّت کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ اپنے اپنے ٹھکانوں سے باہر آجائیں اور ایک بازار کی طرف چلیں، چنانچہ اہل جنّت اپنے اپنے ٹھکانوں سے باہر نکلیں گے اور بازار کی طرف چل پڑیں گے۔ وہاں جاکر ایک ایسا بازار دیکھیں گے جس میں ایسی عجیب و غریب اشیاء نظر آئیں گی جو اہل جنّت نے اس سے پہلے کبھی دیکھی نہیں ہوں گی، اور ان اشیاء سے دکانیں سجی ہوں گی، لیکن خرید و فروخت نہیں ہوگی بلکہ یہ اعلان ہوگا کہ جس اہل جنّت کو جو چیز پسند ہو وہ دکان سے اٹھالے اور لے جائے۔ چنانچہ اہل جنّت ایک طرف سے دوسری طرف بازار میں دکانوں کے اندر عجیب و غریب اشیاء کا نظارہ کرتے ہوئے جائیں گے اور ایک سے ایک نعمت ان کو نظر آئے گی، اور جس اہل جنّت کو جو چیز پسند آئے گی وہ اس کو اٹھا کر لے جائے گا۔

جنّت میں اللہ تعالیٰ کا دربار

جب بازار کی خریداری ختم ہو جائے گی تو اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اعلان ہوگا کہ اب سب لوگوں کا اللہ تعالیٰ کے دربار میں ایک اجتماع ہوگا، اور یہ کہا جائے گا کہ آج وہ دن ہے کہ جب دنیا میں تم رہتے تھے تو وہاں جمعہ کا دن آیا کرتا تھا تو تم لوگ جمعہ کی نماز کے لئے اپنے گھروں سے نکل کر ایک جگہ جمع ہوا کرتے تھے، تو آج جمعہ کے اجتماع کا بدل جنّت کے اس اجتماع کی صورت میں عطا فرمارہے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا دربار لگا ہوا ہے وہاں پر حاضر ہونے کی دعوت دی جاتی ہے، چنانچہ تمام اہل جنّت اللہ تعالیٰ کے اس دربار میں پہنچیں گے۔ اس دربار میں ہر شخص کے لئے پہلے سے کرسیاں لگی ہوں گی، کسی کی کرسی جواہر سے بنی ہوگی، کسی کی کرسی سونے سے بنی ہوگی، کسی کی کرسی موتیوں سے بنی ہوئی اور کسی کی کرسی چاندی سے بنی ہوئی ہوگی، اس طرح حسب درجات کرسیاں ہوں گی۔ جو شخص جتنا اعلیٰ درجے کا ہوگا اس کی کرسی اتنی شاندار ہوگی، ان پر اہل جنّت کو بٹھایا جائے گا۔ اور ہر شخص اپنی کرسی کو اتنا اچھا سمجھے گا کہ اس کو یہ حسرت نہیں ہوگی کہ کاش مجھے ویسی کرسی مل جاتی جیسے فلاں شخص کی کرسی ہے، کیونکہ اس جنّت کے عالم میں غم اور حسرت کا کوئی تصور نہیں ہے، اس لئے اس کو عمدہ کی خواہش ہی نہیں ہوگی۔

اور جنّت میں جو سب سے کم رتبے کے لوگ ہوں گے ان کے لئے کرسیوں کے اردگرد مشک و عنبر کے ٹیلے ہوں گے، ان ٹیلوں پر ان کی نشستیں مقرر ہوں گی، اس پر ان کو بٹھا دیا جائے گا۔ جب سب اہل جنّت اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ جائیں گے تو اس کے بعد دربار خداوندی کا آغاز اس طرح ہوگا کہ حضرت اسرافیل علیہ السلام (جنہوں نے قیامت کا صور پھونکا تھا) سے اللہ تعالیٰ ایسے لحن میں اپنا کلام اور نغمہ سنوائیں گے کہ ساری دنیا کے لحن اور موسیقیاں اس کے سامنے ہیچ اور کمتر ہوں گے۔

مشک و زعفران کی بارش

نغمہ اور کلام سنوانے کے بعد آسمان پر بادل چھا جائیں گے جیسے گھٹا آجاتی ہے اور ایسا محسوس ہوگا کہ اب بارش ہونے والی ہے، لوگ ان بادلوں کی طرف دیکھ رہے ہوں گے، اتنے میں تمام اہل دربار کے اوپر مشک اور زعفران کا چھڑکاؤ ان بادلوں سے کیا جائے گا اور اس کے نتیجے میں خوشبو سے پورا دربار مہک جائے گا، اور وہ خوشبو ایسی ہوگی کہ اس سے پہلے نہ کسی نے سونگھی ہوگی اور نہ اس کا تصور کیا ہوگا۔

پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک ہوا چلے گی اور اس ہوا کے چلنے کے نتیجے میں ہر انسان کو ایسی فرحت اور نشاط حاصل ہوگا کہ اس کی وجہ سے اس کا حسن و جمال دوبالا ہو جائے گا، اس کی صورت اور اس کا سراپا پہلے سے کہیں زیادہ حسین اور خوبصورت ہو جائے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنت کا مشروب تمام حاضرین کو پلایا جائے گا، وہ مشروب ایسا ہوگا کہ دنیا کے کسی مشروب سے اس کو تشبیہ نہیں دی جا سکتی۔

جنت کی سب سے عظیم نعمت "اللہ کا دیدار"

اس کے بعد اللہ تعالیٰ پوچھیں گے کہ اے جنت والو! یہ بتاؤ کہ دنیا میں جو ہم نے تم سے وعدے کئے تھے کہ تمہارے اعمال صالحہ اور ایمان کے بدلے میں ہم تمہیں فلاں فلاں نعمتیں دیں گے، کیا وہ ساری نعمتیں تمہیں مل گئیں یا کچھ نعمتیں باقی ہیں؟ تو سارے اہل جنت بیک زبان ہو کر عرض کریں گے کہ یا اللہ! ان سے بڑی نعمت اور کیا ہوگی جو آپ نے ہمیں عطا فرما دی ہیں، آپ نے تو سارے وعدے پورے فرما دیے، ہمارے تمام اعمال کا بدلہ ہم کو مل گیا، ساری نعمتیں ہم کو عطا فرما دیں، اب اس کے بعد ہمیں کسی نعمت کی خواہش نظر نہیں آتی، ساری راحتیں حاصل ہو گئیں، ساری لذتیں حاصل ہو گئیں، اب اور کیا نعمت باقی ہے؟ لیکن

روایت میں آتا ہے کہ اس وقت بھی علماء کام آئیں گے، چنانچہ لوگ علماء کی طرف رجوع کریں گے کہ آپ بتائیں کہ کونسی نعمت ایسی ہے جو ابھی باقی رہ گئی ہے اور ہمیں نہیں ملی ہے۔ چنانچہ علماء بتائیں گے کہ ایک نعمت باقی ہے وہ اللہ تعالیٰ سے مانگو، وہ ہے اللہ تعالیٰ کا دیدار۔ چنانچہ تمام اہل جنت بیک زبان ہو کر عرض کریں گے کہ یا اللہ! ایک عظیم نعمت تو ابھی باقی ہے، وہ ہے آپ کا دیدار۔ اس وقت اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ ہاں تمہاری یہ نعمت باقی ہے، اب تمہیں اس نعمت سے سرفراز کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا دیدار ہو گا اور اللہ تعالیٰ اپنا جلوہ تمام اہل جنت کو دکھائیں گے، اور اس جلوہ کو دیکھنے کے بعد ہر اہل جنت یہ محسوس کرے گا کہ ساری نعمتیں جو اس سے پہلے دی گئی تھیں وہ اس عظیم نعمت کے آگے ہیچ در ہیچ ہیں، اس سے بڑی نعمت کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ دیدار کی نعمت سے سرفراز ہونے کے بعد اس دربار کا اختتام ہو گا اور پھر تمام اہل جنت اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف واپس چلے جائیں گے۔

حسن و جمال میں اضافہ

جب وہ اہل جنت اپنے ٹھکانوں پر واپس پہنچیں گے تو ان کی بیویاں اور حوریں ان سے کہیں گی کہ آج کیا بات ہوئی کہ آج تمہارا حسن و جمال پہلے سے کہیں زیادہ ہو چکا ہے، آج تو تم بہت حسین و جمیل بن کر لوٹے ہو۔ جواب میں اہل جنت اپنی بیویوں سے کہیں گے کہ ہم تمہیں جس حالت میں چھوڑ کر گئے تھے، تم اس سے کہیں زیادہ حسین و جمیل اور خوبصورت نظر آ رہی ہو۔ حدیث شریف میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ دونوں کے حسن و جمال میں اضافہ اس خوشگوار ہوا کی بدولت ہو گا جو اللہ تعالیٰ نے چلائی تھی۔ بہر حال، یہ جنت میں جمعہ کے دن کے اجتماع اور دربار خداوندی کی ایک چھوٹی سی منظر کشی ہے جو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں کو عطا فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو بھی اس کا کچھ حصہ عطا

فرمادے۔ آمین۔

جنت کی نعمتوں کا تصور نہیں ہو سکتا

لیکن جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ کوئی بھی لفظ اور کوئی بھی تعبیر اور کوئی بھی منظر کشی جنت کے حالات کا صحیح منظر نہیں کھینچ سکتی۔ اس لئے کہ ایک حدیث قدسی میں خود اللہ جل شانہ نے فرمایا کہ:

﴿اعددت لعبادی الصالحین مالا عین رات، ولا اذن سمعت، ولا خطر علی قلب بشر﴾

"یعنی میں نے اپنے نیک بندوں کے لئے وہ چیزیں تیار کر رکھی ہیں جو آج تک کسی آنکھ نے دیکھی نہیں، کسی کان نے سنی نہیں اور کسی دل میں اس کا خیال بھی نہیں گزرا"۔

اس لئے علماء کرام نے فرمایا کہ جنت کی نعمتوں کے نام تو دنیا کی نعمتوں جیسے ہیں۔ مثلاً وہاں پر طرح طرح کے پھل ہوں گے، انار ہوں گے، کھجور ہوگی، لیکن ان کی حقیقت ایسی ہوگی کہ آج ہم دنیا میں اس کا تصور نہیں کر سکتے کہ وہ کیسی کھجور ہوگی، کیسا انار ہوگا اور کیسے انگور ہوں گے، ان کی حقیقت کچھ اور ہوگی۔

روایت میں آتا ہے کہ جنت میں محلات ہوں گے۔ اب ہم یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا میں جیسے محلات ہوتے ہیں ایسے محلات ہوں گے، لیکن حقیقت میں یہاں بیٹھ کر ان محلات کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔ اسی طرح روایات میں آتا ہے کہ شراب اور دودھ اور شہد کی نہریں ہوں گی۔ اب ہم یہ تصور کرتے ہیں کہ دنیا کے دودھ اور شہد کی طرح ہوں گے، جس کی وجہ سے اس کی قدر و منزلت ہمارے دل میں پیدا نہیں ہوتی۔ حالانکہ وہاں کے شہد، شراب، اور دودھ کا ہم یہاں پر بیٹھ کر تصور ہی نہیں کر سکتے۔

جنّت میں خوف اور غم نہیں ہوگا

جنّت کی نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت جو دنیا کے اندر ہمارے لئے ناقابل تصوّر ہے اور وہ دنیا میں کسی انسان کے تصوّر میں آہی نہیں سکتی، وہ یہ ہے کہ وہاں نہ خوف ہوگا اور نہ حزن اور غم ہوگا، وہاں نہ ماضی کا غم ہوگا نہ مستقبل کا اندیشہ ہوگا۔ یہ وہ نعمت ہے جو دنیا میں کبھی کسی کو میسّر آہی نہیں سکتی، اس لئے کہ یہ عالم دنیا اللہ تعالیٰ نے ایسا بنایا ہے کہ یہاں کوئی خوشی کامل نہیں، کوئی لذّت کامل نہیں پھر ہر خوشی کے ساتھ کوئی نہ کوئی غم ضرور لگا ہوا ہے، ہر لذّت کے ساتھ کوئی نہ کوئی تلخی ضرور لگی ہوئی ہے۔ مثلاً آپ کھانا کھا رہے ہیں، کھانا بڑا لذیذ ہے، کھانے میں بڑا مزہ آرہا ہے، لیکن یہ اندیشہ لگا ہوا ہے کہ اگر زیادہ کھالیا تو بدہضمی ہوجائے گی۔ یا مثلاً آپ کوئی مشروب پی رہے ہیں، بڑا اچھا لگ رہا ہے، لیکن ساتھ یہ اندیشہ لگا ہوا ہے کہ اگر زیادہ پی لیا تو کہیں پھندا نہ لگ جائے، کسی نہ کسی تکلیف کا، کسی نہ کسی رنج کا، کسی نہ کسی غم کا اندیشہ ضرور لگا ہوا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے جنّت کے عالم کو ہر اندیشہ، ہر غم، ہر تکلیف سے خالی بنایا ہے، وہاں کوئی اندیشہ نہیں ہوگا، کوئی غم نہیں ہوگا، وہاں پر نہ ماضی کا غم ہوگا، اور نہ مستقبل کا اندیشہ ہوگا، وہاں کسی خواہش کے پورے نہ ہونے کی حسرت نہیں ہوگی بلکہ جو خواہش ہوگی وہ پوری ہوگی۔

جنّت کی نعمتوں کی دنیا میں جھلک

حدیث شریف میں آتا ہے کہ اہل جنّت کی ہر خواہش کو پورا کیا جائے گا، مثلاً یہ خواہش پیدا ہوئی کہ فلاں انار کا رس پیوں، اب یہ نہیں ہوگا کہ تمہیں انار توڑ کر اس کا جوس نکالنا پڑے گا بلکہ انار کا جوس خود تمہارے سامنے حاضر کردیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اس جنّت کی نعمتوں کی تھوڑی تھوڑی جھلکیاں دنیا کے اندر بھی دکھائی ہیں، پہلے جب جنّت کی نعمتوں کا تذکرہ کیا جاتا تھا تو لوگ ان کو بہت عجیب ناقابل

یقین سمجھتے تھے کہ یہ طلسماتی باتیں ہیں اور ان باتوں پر یقین کرنے میں لوگوں کو تامل ہوتا تھا۔ لیکن آج اللہ تعالیٰ نے دکھا دیا کہ جب انسان نے اپنی محدود سے محدود عقل کے بل بوتے پر اور تجربے کے بل بوتے پر ایسے کام کر دکھائے کہ اگر سو سال پہلے ان کاموں کے بارے میں لوگوں کو بتا دیا جاتا تو لوگ پاگل اور دیوانہ کہتے۔ مثلاً سو سال تو دور کی بات ہے، اگر آج سے صرف بیس سال پہلے یہ کہا جاتا کہ ایک ایسا آلہ ایجاد ہونے والا ہے جو ایک منٹ میں تمہارے خط کو امریکہ اور دنیا کے کونے کونے میں پہنچا دے گا تو خبر دینے والے کو پاگل کہا جاتا کہ پاکستان کہاں اور امریکہ کہاں، اگر ہوائی جہاز سے بھی جائے تب بھی کم از کم بیس بائیس گھنٹے لگیں گے، ایک منٹ میں خط کیسے پہنچ جائے گا؟ اللہ تعالیٰ نے فیکس مشین اور ٹیلکس مشین کی ایجاد کے ذریعے دکھا دیا، یہاں فیکس مشین میں خط ڈالا اور وہاں اس کی کاپی اسی وقت نکل آئی۔ اس محدود عقل کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے ایسے ایسے آلات ایجاد کرنے کی توفیق عطا فرمادی۔ جب یہ محدود انسان اپنی محدود عقل کے بل بوتے پر ایسے ایسے کام کرنے پر قدرت رکھتا ہے تو کیا اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے اور اپنی رحمت کاملہ سے اپنے بندوں کے لئے ایسے اسباب مہیا نہیں فرما سکتے کہ ادھر اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی اور ادھر وہ خواہش پوری ہو جائے؟

یہ جنت متقین کے لئے ہے

بات دراصل یہ ہے کہ جب تک انسان کے سامنے حقائق نہیں آتے، اس وقت تک وہ اعلیٰ درجے کی چیزوں کو ناقابل یقین تصور کرتا ہے، لیکن حضرات انبیاء علیہم السلام، جن کو اللہ تعالیٰ نے وہ علم عطا فرمایا جو دنیا کے کسی بھی انسان کو عطا نہیں کیا گیا، انہوں نے ہمیں جنت اور اس کی نعمتوں کے بارے میں یقینی خبریں دی ہیں کہ اس سے زیادہ یقینی خبریں اور کوئی نہیں ہو سکتیں۔ لہذا یہ ساری خبریں سچی ہیں اور ہزار درجہ سچی ہیں، اور جنت حق ہے، اس کی نعمتیں حق ہیں اسی کے بارے

میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وسارعوا الی مغفرة من ربکم وجنة عرضها السمٰوٰت والارض اعدت للمتقین﴾ (آل عمران: ۱۳۳)

یعنی اپنے رب کی مغفرت کی طرف اور اس کی جنت کی طرف دوڑو جس کی وسعت آسمان اور زمین کے برابر ہے اور یہ جنت متقین کے لئے تیار کی گئی ہے جو اللہ سے ڈرنے والے ہوں، تقویٰ اختیار کرنے والے ہوں اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کرنے والے ہوں۔

جنت کے گرد کانٹوں کی باڑ

بہرحال، یہ جنت جو عظیم الشان ہے اور جس کی نعمتیں عظیم الشان ہیں، لیکن اسی جنت کے بارے میں ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

﴿ان الجنة حفت بالمکاره﴾

یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس جنت کو ایسی چیزوں سے گھیرا ہوا ہے جو ظاہری طور پر انسان کے نفس کو شاق ہوتی ہیں اور ناگوار ہوتی ہیں، جیسے ایک بہت عالیشان محل ہے لیکن اس محل کے اردگرد کانٹوں کی باڑ لگی ہوئی ہے، اس محل میں داخل ہونے کے لئے کانٹوں کی باڑ کو عبور کرنا ہی پڑے گا، اور جب تک کانٹوں کی اس باڑ کو پار نہیں کرو گے اس محل کی لذتیں اور نعمتیں حاصل نہیں ہوسکتیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس عالیشان جنت کے گرد ان چیزوں کی باڑ لگائی ہے جو انسان کے نفس کو شاق گزرتی ہیں، مثلاً فرائض و واجبات لازم کردیے کہ یہ فرائض انجام دو۔ اب آدمی کے نفس کو یہ بات شاق گزرتی ہے کہ اپنے سب کام چھوڑ کر مسجد جائے اور مسجد میں جاکر نماز ادا کرے۔ اسی طرح بہت سے کام جن کے کرنے کو انسان کا

دل چاہتا ہے لیکن ان کو حرام اور گناہ قرار دیدیا گیا۔ مثلاً یہ حکم دیدیا گیا کہ اس نگاہ کی حفاظت کرو، یہ نگاہ غلط جگہ پر نہ پڑے، نامحرم پر نہ پڑے، اور یہ نگاہ غلط اور ناجائز پروگرام نہ دیکھے۔ ان سب کاموں سے رکنا انسان پر شاق گزرتا ہے، اب اس کا دل تو یہ چاہ رہا تھا کہ یہ کام کرے لیکن اس کو روک دیا گیا۔ یہی کانٹوں کی باڑ ہے جو جنت کے گرد لگی ہوئی ہے۔ یا مثلاً مجلس میں دوستوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں، کسی کا ذکر آگیا، اب دل چاہ رہا ہے کہ اس کی خوب غیبت کریں، لیکن یہ حکم دیدیا گیا کہ نہیں، غیبت مت کرو، اپنی زبان روک لو، یہ ہے کانٹوں کی باڑ۔ اگر جنت کو حاصل کرنا ہے تو کانٹوں کی اس باڑ کو عبور کرنا ہوگا، اس کے بغیر جنت کا حصول ممکن نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کی سُنّت یہی ہے۔

دوزخ کے گرد شہوات کی باڑ

اسی حدیث میں پہلا جملہ یہ ارشاد فرمایا کہ:

﴿حجبت النار بالشهوات﴾

یعنی دوزخ کے گرد اللہ تعالیٰ نے شہوات کی باڑ لگادی ہے، دوزخ کو بڑی خوشنما چیزوں اور دلکش خواہشات نے گھیر رکھا ہے، دل ان کی طرف بھاگنے کو چاہتا ہے، لیکن اس کے اندر آگ ہی آگ ہے۔

یہ کانٹوں کی باڑ بھی پھول بن جاتی ہے

بہر حال، اس جنت کے گرد کانٹوں کی باڑ لگی ہوئی ہے، لیکن یہ کانٹے بھی اللہ تعالیٰ نے ایسے بنائے ہیں کہ اگر کوئی شخص ہمت اور عزم کرلے کہ مجھے کانٹوں کی یہ باڑ عبور کرنی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے ان کانٹوں کو بھی پھول بنا دیتے ہیں۔ یہ کانٹے اس وقت تک کانٹے ہیں جب تک ان کو دور دور سے دیکھو گے اور جب تک

ان کا تصور کرتے رہو گے تو یہ کانٹے ہیں اور ان کا عبور کرنا مشکل نظر آئے گا، لیکن جب ایک مرتبہ ڈٹ کر اور ہمت کر کے ارادہ کرلیا کہ میں تو کانٹوں کی یہ باڑ عبور کر کے رہوں گا اور مجھے اس کانٹے کی باڑ کے پیچھے وہ باغ نظر آرہا ہے اور اس کی نعمتیں نظر آرہی ہیں اور مجھے اس کانٹوں کی باڑ کو پار کر کے اس باغ میں جانا ہے تو اللہ تعالیٰ ان کانٹوں کو بھی پھول بنا دیتے ہیں اور اس کو گلزار بنا دیتے ہیں۔

ایک صحابی کا جان دیدینا

ایک صحابی جہاد میں شریک ہیں، انہوں نے دیکھا کہ دشمن کا لشکر بڑی طاقت کے ساتھ مسلمانوں پر حملہ آور ہو رہا ہے اور اب بچاؤ کا کوئی راستہ نہیں ہے تو اس وقت بے ساختہ زبان پر جو کلمہ آیا وہ یہ تھا کہ:

غدا نلقی الاحبة محمدا وصحبه

یعنی وہ وقت آگیا کہ کل ہماری ملاقات اپنے محبوبوں سے اور دوستوں سے ہوگی یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ سے اس عالم آخرت میں ملاقات ہوگی۔ گویا کہ آگ اور خون کا جو کھیل ہو رہا تھا، جس میں لاشیں تڑپ رہی تھیں اور جان دینا جو سب سے زیادہ مشکل نظر آرہا تھا، لیکن وہ صحابی اس جان دینے کی تکلیف کو خوشی خوشی سہنے کے لئے تیار ہوگئے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب اللہ کے راستے میں لڑنے والا شہید ہوتا ہے اور اس کو موت آتی ہے تو اس کو موت آنے کی تکلیف اتنی بھی نہیں ہوتی جتنی چیونٹی کے کاٹنے کی تکلیف ہوتی ہے۔ یہ درحقیقت جنت تک پہنچنے کے لئے کانٹے کی باڑ حائل تھی جس کو عبور کرنا تھا لیکن جب عزم کرلیا کہ یہ جان تو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہے اسی کو دینی ہے ۔

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

جب یہ عزم کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کانٹے کو پھول بنا دیا، اگر بستر پر مرتے تو نہ جانے کس طرح ایڑیاں رگڑ کر مرتے، کیا کیا تکلیف اٹھانی پڑتیں، لیکن ہم نے تمہارے لئے قتل ہونے کی تکلیف بھی ایسی بنادی جیسی چیونٹی کے کاٹنے کی تکلیف ہوتی ہے۔

دنیا والوں کے طعنوں کو قبول کر لو

بہر حال، یہ کانٹے بھی دور دور سے دیکھنے کے کانٹے ہیں، لیکن جب آدمی ایک مرتبہ عزم اور ہمت کرلے اور اس کی طرف چل پڑے تو اللہ تعالیٰ ان کانٹوں کو بھی اس کے لئے پھول بنا دیتے ہیں۔ لہٰذا ہم لوگ جو سوچتے رہتے ہیں کہ اگر ہم نے دین کے فلاں حکم پر عمل کر لیا یا فلاں گناہ سے بچ گئے یا فلاں کام کر لیا تو اول نفس کو بڑی مشقت ہوگی۔ پھر دوسری طرف معاشرے کا خیال آتا ہے کہ لوگ کیا کہیں گے کہ یہ تو بالکل مولوی ہوگیا، یہ تو پرانے وقت کا آدمی ہوگیا، یہ تو زمانے کے ساتھ ساتھ چلنے کو تیار نہیں، اس قسم کے طعنے ملنے کا خیال آتا ہے، یاد رکھو! یہ سب کانٹے ہیں اور جنت تک پہنچنے کے لئے راستے میں جو کانٹوں کی باڑ لگی ہوئی ہے یہ بھی انہی میں سے ہیں۔ جب تم ایک مرتبہ ان کانٹوں کو خندہ پیشانی سے قبول کر لو گے اور ان سے یہ کہہ دو گے کہ ہاں! ہم مولوی ہیں اور بیک ورڈ ہیں، لیکن ہم ایسے بیک ورڈ ہیں جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت کی طرف دیکھنے والے ہیں۔ جب تم ایک مرتبہ یہ عزم کر لو گے تو یقین رکھو کہ یہ سب کانٹے تمہارے لئے پھول بن جائیں گے۔

عزت دین پر چلنے والوں کی ہوتی ہے

اللہ تعالیٰ اس دنیا کے اندر دکھا دیتے ہیں کہ ان طعنہ دینے والے اور الزام عائد کرنے والوں کی زبانیں رک جاتی ہیں اور بالآخر اللہ تعالیٰ عزت انہی لوگوں کو عطا

فرماتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے آگے سر جھکاتے ہیں۔ عزت انہی کی ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع فرمان ہوں۔ عہد رسالت میں منافقین بھی مسلمانوں سے یہ کہا کرتے تھے کہ ہم تو عزت والے ہیں، اور مسلمان ذلیل ہیں، اور جب مدینہ منورہ جائیں گے تو عزت والے ذلیل لوگوں کو باہر نکال دیں گے یعنی مسلمانوں کو۔ چنانچہ یہ منافقین مسلمانوں کو ذلیل ہونے کا طعنہ دیا کرتے تھے، ان کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ولله العزة ولرسوله وللمؤمنين ولكن المنفقين لا يعلمون﴾

"یعنی عزت تو اللہ کے لئے ہے اور اللہ کے رسول کے لئے ہے اور مؤمنین کے لئے ہے، لیکن منافقین نہیں جانتے، ان کو حقیقت حال کا پتہ نہیں"۔

پھر عبادتوں میں لذت آئے گی

تو جنت کے ارد گرد کانٹے ضرور ہیں لیکن یہ آزمائش کے کانٹے ہیں، جب تم اس کے قریب جاؤ گے تو اللہ تعالیٰ انہی کانٹوں کو پھول بنادیں گے اور پھر یہی عبادتیں جو تم پر شاق گزر رہی تھیں، انہی عبادتوں میں وہ لذت حاصل ہوگی کہ دنیا کے بڑے سے بڑے لذیذ کام میں حاصل نہیں ہوتی، چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ قرة عيني في الصلاة میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔ یعنی یہ نماز ویسے تو عبادت ہے لیکن اس میں اللہ تعالیٰ نے مجھے ایسی لذت عطا فرمائی ہے کہ دنیا کی ساری لذتیں اس کے آگے ہیچ ہیں۔

گناہ چھوڑنے کی تکلیف

اسی طرح گناہ چھوڑنے میں بیشک مشقت معلوم ہوتی ہے، دل پر آرے چل جاتے ہیں، لیکن دل پر آرے چلنے کے باوجود آدمی اللہ کے لئے یہ گناہ چھوڑ دے اور یہ کہے کہ میں اپنی ان خواہشات کو اللہ کے آگے قربان کر رہا ہوں تو ابتداء میں ضرور مشقت ہوتی ہے لیکن بالآخر پھر ان خواہشات کو کچلنے ہی میں مزہ آتا ہے۔ جب بندہ یہ تصور کرتا ہے کہ میں یہ خواہشات اپنے مالک کے لئے کچل رہا ہوں، اپنے خالق کے لئے کچل رہا ہوں تو پھر اس کو اسی میں لذت حاصل ہوتی ہے۔

ماں بچے کی تکلیف کیوں برداشت کرتی ہے؟

دیکھئے! ایک ماں ہے اور اس کا چھوٹا سا بچہ ہے، سردی کی رات ہے اور ماں اپنے بچے کے ساتھ لحاف میں لیٹی ہے، اتنے میں بچے نے پیشاب پاخانہ کر دیا، اب وہ ماں اس گرم اور نرم لحاف اور بستر کو چھوڑ کر اس بچے کے کپڑے بدل رہی ہے، اس کا بستر اور کپڑے ٹھنڈے پانی سے دھو رہی ہے، اب اس وقت میں اپنی نیند خراب کر کے ٹھنڈے پانی سے یہ کام کرنا کتنا مشکل کام ہے، لیکن وہ ماں یہ سب کام کرتی ہے اور اس کو اس کام میں مشقت بھی ہوتی ہے، لیکن جب وہ یہ تصور کرتی ہے کہ میں یہ کام اپنے بچے کے لئے کر رہی ہوں، اپنے جگر کے ٹکڑے کے لئے کر رہی ہوں تو اس مشقت ہی میں اس کو لطف اور مزہ آنے لگتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص اس خاتون سے کہے کہ تجھے بڑی مشقت اٹھانی پڑتی ہے، راتوں کو اٹھنا پڑتا ہے، سردی کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے، اگر تیرا یہ بچہ تجھ سے چھن جائے تو تیری یہ مشقتیں اور تکلیفیں دور ہو جائیں، تو خاتون یہ کہے گی کہ اس مشقت سے ہزار گنا مشقت اور تکلیف برداشت کرنے کو تیار ہوں لیکن میرا بچہ مجھ سے نہ چھن جائے۔ کیوں ایسا کہے گی؟ اس لئے کہ اس خاتون کو اس بچہ سے محبت ہے اور اس کی محبت

کی خاطر سخت سے سخت کام کرنے کو نہ صرف تیار ہے بلکہ اس کو اسی مشقت اور تکلیف میں مزہ آتا ہے۔ بالکل اسی طرح جب ایک بندے کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہوجاتی ہے، تو پھر اللہ کی راہ میں اپنے نفس کی خواہشات کو کچلنے میں وہ لذت حاصل ہوتی ہے جو خواہشات کے پورا کرنے میں حاصل نہیں ہوتی۔

جنت اور عالَم آخرت کا مراقبہ کریں

بہرحال، جنت کی یہ نعمتیں جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائیں اور سارا قرآن کریم ان نعمتوں کے تذکرے سے بھرا ہوا ہے، یہ اس لئے بیان کی گئی ہیں تاکہ انسان ان کو حاصل کرنے کی کوشش کرے اور کانٹوں کی اس باڑ کو عبور کرے جو اس جنت کے اردگرد لگی ہوئی ہے۔ اس کے لئے بزرگوں نے یہ طریقہ بتایا ہے کہ اس دنیا میں رہ کر انسان جنت کی ان نعمتوں کا کبھی کبھی تصور اور دھیان کیا کرے۔ چنانچہ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے مواعظ میں فرماتے ہیں کہ "ہر مسلمان کو چاہئے کہ روزانہ تھوڑی دیر بیٹھ کر عالَم آخرت کا تصور کیا کرے اور خاص طور پر جنت کی نعمتوں کا تصور کیا کرے، اور یہ مراقبہ کرے کہ میں دنیا سے جارہا ہوں، قبر میں رکھ دیا گیا ہوں، لوگ مجھے دفن کرکے رخصت ہوگئے ہیں، پھر عالَم برزخ میں پہنچ گیا، پھر عالَم آخرت شروع ہوگیا، یہاں حساب کتاب ہورہا ہے، میزان لگی ہوئی ہے، پل صراط لگا ہوا ہے، ایک طرف جنت ہے، دوسری طرف جہنم ہے، اور پھر جنت کے اندر یہ نعمتیں ہیں اور جہنم کے اندر اس اس طرح کے عذاب ہیں۔ اس طرح تھوڑی دیر بیٹھ کر ان تمام چیزوں کا تصور اور دھیان کیا کرے۔ اس لئے کہ ہم صبح سے شام تک دنیا کی زندگی میں مصروف رہنے کی وجہ سے اس عالَم آخرت سے غافل ہوگئے ہیں۔ الحمدللہ ہم سب کا یہ عقیدہ ہے اور اس پر یقین ہے کہ اس دنیا سے ایک دن جانا ہے، اور آخرت آنے والی ہے، لیکن تنہا عقیدہ اور یقین کافی نہیں بلکہ اس کا استحضار بھی ضروری ہے اور اس کا دھیان بھی ضروری ہے،

یہ دھیان اور استحضار ہی انسان کو اطاعت پر آمادہ کرتا ہے اور معصیت اور گناہ سے روکتا ہے۔ اس وجہ سے تھوڑا وقت نکال کر آخرت کا دھیان اور مراقبہ کرو، اس دھیان اور مراقبہ کے نتیجے میں انشاء اللہ آخرت کا استحضار پیدا ہوگا۔

دنیا کے کاموں کے اندر آخرت کا دھیان اور استحضار تمہیں اللہ کی اطاعت پر آمادہ کرے گا اور معصیت اور گناہ سے بچنے میں مدد دے گا۔ جنت کی ان نعمتوں کے بیان کرنے کا یہی مقصود ہے جو قرآن و حدیث میں بھری ہوئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اور اپنے فضل وکرم سے ہم سب کو جنت کی نعمتوں کا استحضار عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔
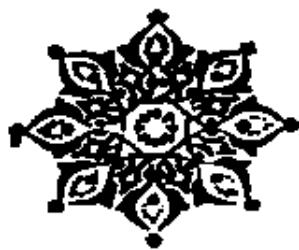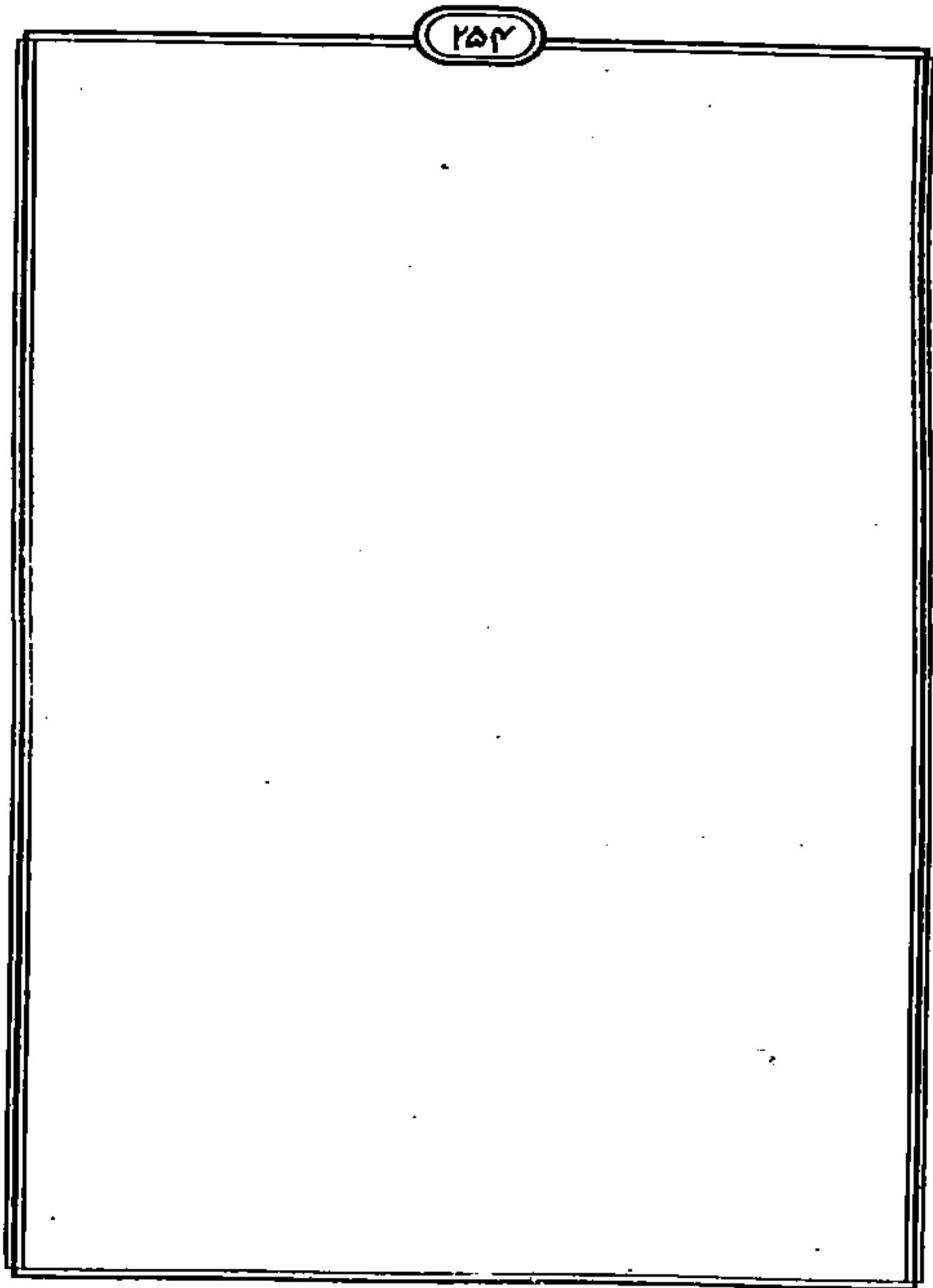
فکرِ آخرت

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبد اللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

تاریخ خطاب : ۱۴ / مارچ ۱۹۸۸ء

مقام خطاب : جامع مسجد حقانیہ ساہیوال
سرگودھا

وقت خطاب : بعد نماز عشاء

اصلاحی خطبات : جلد نمبر ۹

عرضِ ناشر

۱۴ مارچ ۱۹۸۸ء کو بعد نماز عشاء جامع مسجد حقانیہ ساہیوال سرگودھا میں مجلس صیانۃ المسلمین کے دوسرے عظیم الشان اجتماع سے محقق العصر حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم استاذ حدیث ونائب صدر دارالعلوم کراچی و جسٹس شریعت بینچ سپریم کورٹ آف پاکستان نے ایک فکر انگیز بصیرت افروز اور موثر خطاب فرمایا، جس میں فکر آخرت کا مفید درس دیا، مجلس کے رضاکار جناب حافظ عبدالغفور صاحب ترمذی اور محترم حافظ غلام رسول صاحب کے تعاون سے اس کو ہدیہ قارئین کیا جاتا ہے۔

ولی اللہ میمن
میمن اسلامک پبلشرز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فکر آخرت

الحمد للّٰه نحمده ونستعينه ونستغفره و نؤمن به ونتوكل عليه، ونعوذ باللّٰه من شرور انفسنا ومن سيئات اعمالنا، من يهده اللّٰه فلا مضل له ومن يضلله فلا هادى له ونشهد ان لا اله الا اللّٰه وحده لاشريك له، ونشهدان سيدنا وسندنا ومولانا محمدًا عبده ورسوله، صلى اللّٰه تعالى عليه وعلى اٰله واصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيرًا كثيرا۔

اما بعد!

فاعوذ باللّٰه من الشيطن الرجيم۔ بسم اللّٰه الرحمن الرحيم

﴿بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى۔ (سورة الاعلى: ۱۷۰)

امنت بالله صدق الله مولانا العظيم وصدق رسوله النبى الكريم و نحن على ذالك من الشاهدين والشاكرين والحمدلله رب العالمين۔﴾

حضرات علماء کرام، بزرگان محترم اور برادران عزیز، وکارکنان مجلس صیانۃ المسلمین ساہیوال! یہ میرے لئے بہت عظیم سعادت کا موقع ہے کہ آج اپنے محترم بزرگوں کی زیارت اور صحبت سے استفادہ کا موقع اللہ تبارک و تعالیٰ نے عطا فرمایا۔

ہماری ایک بیماری

میں نے ایک آیت تلاوت کی جو سورہ اعلیٰ کی آیت ہے اور قرآن کریم کا یہ اعجاز ہے کہ اس کی چھوٹی سے چھوٹی آیت لے لیجئے وہ الفاظ کے اعتبار سے مختصر ہوگی، لیکن اگر اس کے معنی اور مفہوم کو دیکھا جائے اور اس کی گہرائی میں جایا جائے تو تنہا وہ چھوٹی سی آیت بھی انسان کی پوری زندگی کا دستور بن جاتی ہے یہ چھوٹی سی آیت ہے اس میں باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ:

﴿بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا ۝ وَالْاٰخِرَةُ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی﴾

اس آیت میں اللہ جل جلالہ نے ہماری آپ کی ایک بنیادی بیماری کی تشخیص فرمائی ہے کہ تمہارے اندر یہ بیماری پائی جاتی ہے۔

اور وہ ایسی بیماری ہے کہ جو زندگی کے ہر شعبے میں ہمارے لئے تباہی اور ہلاکت لانے والی ہے۔ وہ بیماری بتائی اور پھر اس بیماری کا علاج بتایا۔ دو مختصر جملوں میں بیماری بھی بتادی، بیماری کا علاج بھی بتادیا یہ بھی بتایا کہ تمہارے اندر کیا خرابی ہے، اور یہ بھی بتادیا کہ اس خرابی سے بچنے کا راستہ کیا ہے۔ فرمایا کہ:

﴿بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا﴾

تمہاری بنیادی خرابی یہ ہے کہ تم ہر معاملے میں اس دنیوی زندگی کو ترجیح دیتے ہو، دنیوی زندگی کے دائرے میں رہ کر سوچتے ہو، اسی کی بھلائی، اسی کی فلاح، اسی کی خوشحالی ہر وقت تمہارے پیش نظر رہتی ہے۔ اور اس دنیوی زندگی کو تم کس پر ترجیح دیتے ہو؟ مرنے کے بعد والی آخرت والی زندگی پر۔ اس پر ترجیح دیتے ہو، یہ تو تمہاری بیماری ہے، اور اب بیماری کا علاج کیا ہے؟

اس بیماری کا علاج

علاج یہ ہے کہ ذرا یہ بات سوچو کہ یہ دنیا جس کی خاطر تم دوڑ دھوپ کر رہے ہو، تمہاری مسلسل جدوجہد تمہاری دوڑ دھوپ تمہاری شب و روز کی کوشش ساری اسی دنیا کی خوشحالی کے گرد گھوم رہی ہیں۔ تمہاری کوشش یہ ہے کہ میرا مکان اچھا بن جائے، مجھے پیسے مل جائیں، میری دنیا میں عزت ہو، لوگ میرا نام جانیں، لوگوں میں میری شہرت ہو جائے، مجھے بڑا منصب مل جائے، مجھے بڑا مرتبہ حاصل ہو جائے، ساری تمہاری سوچ کا محور یہ دنیوی زندگی بنی ہوئی ہے۔

لیکن کیا کبھی تم نے یہ سوچا کہ جس کی خاطر یہ ساری دوڑ دھوپ کر رہے ہو، جس کی خاطر حلال و حرام ایک کر رکھا ہے، جس کی خاطر لڑائیاں مول لے رہے ہو، جس کی خاطر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بن جاتے ہو، وہ کتنے دن کی زندگی ہے؟

اور اس کے بعد مرنے کے بعد جو زندگی آنے والی ہے وہ اس کے مقابلے میں کیسی خیر کی زندگی ہے اور یہاں کی زندگی کے مقابلے میں بہتر ہے یہاں کی زندگی کے مقابلے میں کہیں زیادہ پائیدار غیر متناہی ہے۔

کوئی خوشی کامل نہیں

خوب سمجھ لیجئے دنیا کی کوئی خوشی کامل نہیں، ہر خوشی کے ساتھ غم کا کانٹا لگا ہوا ہے۔ کسی فکر کا کسی صدمے کا کسی تشویش کا کانٹا لگا ہوا ہے۔ کوئی خوشی کامل نہیں کوئی لذت کامل نہیں۔ کھانا اچھا رکھا ہوا ہے بھوک لگی ہوئی ہے اس کے کھانے میں لذت آرہی ہے لیکن کوئی فکر دماغ کے اوپر مسلط ہے اس کی وجہ سے سارا کھانا اکارت ہو رہا ہے اس کی لذت مکدر ہو رہی ہے دنیا کی کوئی خوشی ایسی نہیں ہے جو کامل ہو۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ مال و دولت جمع کرلوں گا تو اطمینان حاصل ہو جائے گا. سکون مل جائے گا لیکن آپ ذرا بڑے بڑے سرمایہ داروں، بڑے بڑے مل کے مالکوں کی اندرونی زندگی میں جھانک کر دیکھئے بظاہر یہ نظر آئے گا کہ ملیں کھڑی ہوئی ہیں۔ عالیشان کاریں ہیں، شاندار بنگلے ہیں۔ حشم و خدم ہیں، نوکر چاکر ہیں، سارے اسباب راحت کے میسر ہیں۔ لیکن صاحب بہادر کو رات کے وقت نیند نہیں آتی۔ نیند لانے کے لئے گولیاں کھانی پڑتی ہیں۔ ڈاکٹر سے گولیاں لے لے کر کھا کھا کر نیند لاتے ہیں۔

آرام وہ بستر اور مسہریاں ہیں، ایئر کنڈیشن کمرے ہیں لیکن نیند نہیں آتی۔ اس کے مقابلے میں ایک مزدور ہے ایک کسان ہے جس کے پاس یہ مسہری تو نہیں، یہ گدے اور یہ بستر ے تو نہیں، لیکن رات کے وقت میں تھک کر اپنے سر کے نیچے اپنا ہاتھ رکھ کر سوتا ہے آٹھ گھنٹے کی بھرپور نیند لے کر اٹھتا ہے۔ بتاؤ، رات اس سرمایہ دار کی اچھی گزری یا اس مزدور اور کسان کی اچھی گزری؟ تو اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کا نظام ایسا بنایا ہے کہ اس کی کوئی خوشی کامل نہیں، کوئی لذت کامل نہیں، ہر خوشی کے ساتھ کوئی غم لگا ہوا ہے، اور ہر غم کے ساتھ کوئی خوشی لگی ہوئی ہے۔

تین عالم

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں تین عالم پیدا کئے ہیں۔ ایک عالم ہے جس میں خوشی ہی خوشی ہے، لذت ہی لذت ہے، مزہ ہی مزہ ہے، غم کا نام نہیں، صدمے کا گزر نہیں۔ وہ عالم ہے جنت، اس میں غم صدمے کا کوئی گزر نہیں، فکر و تشویش کا کوئی راستہ نہیں۔ ایک عالم اللہ نے وہ پیدا کیا ہے جو صدمے ہی کی جگہ ہے اس میں غم ہی غم ہیں تکلیف ہی تکلیف ہے، پریشانی ہی پریشانی ہے، صدمہ ہی صدمہ ہے، اس میں خوشی کا گزر نہیں، اس میں راحت کا گزر نہیں وہ جہنم، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی رحمت سے اس سے محفوظ رکھے۔ آمین

تیسرا عالم پیدا کیا یہ دنیا، یہ غم اور خوشی سے ملی جلی ہے۔ اس میں غم بھی ہے اس میں خوشی بھی ہے، اس میں لذت بھی ہے، اس میں راحت بھی ہے اس میں تکلیف بھی ہے۔ یہ دنیا دونوں چیزوں سے ملی جلی ہے لہٰذا اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ اس دنیا میں مجھے کوئی صدمہ نہ پہنچے، مجھے کوئی تکلیف نہ ہو، کوئی میری مرضی کے خلاف کام نہ ہو تو وہ دنیا کی حقیقت سے بے خبر ہے، اس دنیا میں یہ نہیں ہو سکتا۔ ارے اور تو اور اللہ کے محبوب ترین بندے یعنی انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اس دنیا کے اندر تشریف لاتے ہیں تو ان کو تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ان کو بھی غم اٹھانے پڑتے ہیں ان کو بھی صدمے جھیلنے پڑتے ہیں۔

اگر اس دنیا میں کسی کو صرف راحت ملنی ہوتی، صرف خوشی ملنی ہوتی تو اللہ کے محبوب ترین پیغمبروں سے زیادہ اس کا حق دار کوئی نہیں تھا۔ لیکن ان پر بھی صدمے آئے اور ان پر بھی تکلیفیں آئیں، بلکہ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

﴿اشد الناس بلاء الانبیاء ثم الامثل فالامثل﴾

اس دنیا کے اندر سب سے زیادہ آزمائشیں انبیاء پر آتی ہیں، اس کے بعد جتنا جو قریب ہوتا ہے انبیاء سے اتنی ہی آزمائشیں اس کے اوپر آتی ہیں۔

میں عرض یہ کر رہا تھا کہ دنیا کی کوئی خوشی کامل نہیں، کوئی لذت کامل نہیں، کوئی راحت کامل نہیں اور جتنی بھی خوشی مل جائے پائیدار نہیں، اور کچھ پتہ نہیں کہ اگلے لمحے یہ خوشی حاصل رہے گی یا نہیں؟ ہو سکتا ہے کہ اگلے گھنٹے ختم ہو جائے، ہو سکتا ہے کل ختم ہو جائے، ہو سکتا ہے اگلے مہینے ختم ہو جائے، ہو سکتا ہے کہ ایک سال چل جائے اس کے بعد ختم، تو نہ خوشی کامل اور نہ غم کامل۔

آخرت کی خوشی کامل ہوگی

باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آخرت کی زندگی خیر ہے، خیر کے معنی کامل ہے۔ اس کی لذت بھی کامل، اس کی رحمت بھی کامل، اس کے اندر خوشی بھی کامل اور پائیدار بھی ہے۔ یعنی ختم ہونے والی نہیں، جو نعمت مل گئی وہ ہمیشہ کے لئے ملے گی۔

حدیث کا مضمون ہے یہاں دنیا میں آپ کو ایک کھانا اچھا لگ رہا ہے، دل چاہ رہا ہے کھائیں، ایک پلیٹ کھائی دو پلیٹ کھائی ایک روٹی کھائی، آخر ایک حد ایسی آگئی کہ پیٹ بھر گیا اب اگر کھانا بھی چاہیں تو کھا نہیں سکتے، اسی کھانے سے نفرت ہوگئی، وہی کھانا جس کی طرف دل لپک رہا تھا، جس کی طرف آدمی شوق سے بڑھ رہا تھا، چند لمحوں کے اندر اس سے نفرت ہوگئی، اب کھانے کو دل بھی نہیں چاہتا، کوئی انعام بھی دینا چاہے ہزار روپیہ بھی دینا چاہے کہ کھاؤ، نہیں کھائے گا۔ کیوں؟ اس پیٹ کی ایک حد تھی وہ حد آگئی، اس کے بعد اس میں گنجائش نہیں اور نہیں کھاتا۔ لیکن آخرت میں جو کھانا آئے گا یا جو بھی غذا ہوگی اس میں یہ مرحلہ نہیں آئے گا کہ صاحب اب پیٹ بھر گیا دل تو چاہ رہا ہے، کھایا نہیں جاتا، یہ مرحلہ جنت میں نہیں۔ جو لذت وہ کامل ہے اس میں کوئی تکدر نہیں تو باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آخرت بہتر بھی ہے اور پائیدار بھی ہے۔ دنیا بہتر بھی نہیں، بھی ہے اور ناپائیدار بھی ہے۔ اس کے باوجود تمہارا یہ حال ہے کہ دنیوی زندگی ہی کو ترجیح دیتے ہو شب و روز اس کی دوڑ دھوپ میں مگن ہو اور آخرت کا خیال نہیں کرتے۔

اس آیت میں اب ہم ذرا غور کریں تو یہ نظر آئے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں ہمارے سارے امراض ساری بیماریوں کی جڑ اور اس کا علاج بھی بتادیا۔ جڑ کیا؟

موت یقینی ہے

اس دنیا کے اندر کوئی بات اتنی یقینی نہیں ہے اتنی متفق علیہ نہیں ہے کہ جتنی

یہ بات یقینی اور متفق علیہ ہے کہ ہر انسان کو ایک دن مرنا ہے۔ کوئی بات اس سے زیادہ یقینی نہیں۔ یعنی یہ وہ بات ہے کہ جس کو مسلمان تو مسلمان کافر بھی مانتا ہے کہ ہاں! ایک دن وہ ضرور مرے گا۔ آج تک اس کائنات میں کوئی انسان ایسا پیدا نہیں ہو جس نے یہ نظریہ پیش کیا ہو کہ انسان کو موت نہیں آئے گی۔ لوگوں نے خدا کا انکار کردیا کہنے والوں نے کہہ دیا کہ خدا کو نہیں مانتے، لیکن موت سے انکار کرنے والا آج تک پیدا نہیں ہوا، بڑے سے بڑا دہریہ، بڑے سے بڑا ملحد، بڑے سے بڑا منکر خدا وہ بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے موت نہیں آئے گی، اور سب باتوں میں اختلاف۔ لیکن یہ بات ایسی ہے کہ اس پر سب متفق ہیں کہ موت آنی ہے مرنا ہے۔ اس بات پر بھی سب متفق ہیں کہ مرنے کے دن کا پتہ نہیں کہ کب مریں گے۔ سائنس ترقی کرگئی، لوگ چاند پر پہنچ گئے، مریخ پر پہنچ گئے، کمپیوٹر ایجاد ہو گئے۔ مصنوعی آدمی ایجاد ہو گئے سب کچھ ہوگیا۔ لیکن پوچھو ان سائنسدانوں سے کہ بتاؤ بھائی جو سامنے بیٹھا ہوا انسان ہے، اس کی موت کب آئے گی؟

ساری سائنس سارے علوم فنون یہاں آکر عاجز ہیں کوئی نہیں بتا سکتا کہ موت کب آئے گی لیکن عجیب معاملہ ہے کہ جتنی یہ بات یقینی ہے کہ مرنا ہے اور جتنا اس کا وقت غیر یقینی ہے اتنا ہی اس موت سے ہم اور آپ غافل ہیں۔

ذرا گریباں میں ہم سب منہ ڈال کر دیکھیں۔ صبح بیدار ہونے سے لے کر رات کو بستر پر جانے تک اس پورے وقت میں کیا کچھ سوچتے ہیں کیا کیا خیالات آتے ہیں دنیا داری کے روزگار کے، محنت مزدوری کے، ملازمت کے، تجارت کے، زراعت کے، کاشتکاری کے، خدا جانے کیا کیا خیالات آتے ہیں۔ کیا کبھی خیال آتا ہے کہ ایک دن قبر میں جاکے سونا ہے؟ کبھی خیال آتا ہے کہ قبر میں جانے کے بعد کیا حالت پیش آنے والی ہے۔

حضرت بہلول کا واقعہ

ایک بزرگ گزرے ہیں ان کا نام تھا بہلول۔ "بہلول مجذوب" کہلاتے تھے۔ مجذوب قسم کے آدمی تھے۔ لیکن باتیں بڑی حکمت کی کیا کرتے تھے۔ اس واسطے ان کو لوگ بہلول دانا بھی کہتے ہیں۔ بہلول حکیم بھی، مجذوب بھی۔

ہارون رشید کے زمانے میں تھے اور ہارون رشید ان سے کبھی مذاق بھی کیا کرتا تھا، اور اعلان کر رکھا تھا کہ جب بہلول مجذوب میرے پاس آنا چاہیں تو کوئی ان کے لئے رکاوٹ نہ ہوا کرے۔ سیدھا میرے پاس پہنچ جائیں۔ ایک دن ایسے ہی ہارون رشید کے پاس پہنچ گئے، ہارون رشید مذاق تو کرتے تھے۔ ہارون رشید کے ہاتھ میں چھڑی تھی، وہ چھڑی اٹھا کر انہوں نے بہلول کو دی اور کہا میاں بہلول یہ چھڑی میں تم کو امانت کے طور پر دیتا ہوں ایسا کرنا کہ اس دنیا میں جو شخص تمہیں اپنے سے زیادہ بے وقوف ملے اس کو یہ چھڑی میری طرف سے ہدیہ دے دینا اشارہ اس طرف تھا کہ تم سے زیادہ بے وقوف تو کوئی دنیا میں ہے ہی نہیں۔ تو اگر تمہیں اپنے سے زیادہ بے وقوف کوئی شخص ملے تو اس کو دے دینا۔ بہلول نے وہ چھڑی اٹھا کر اپنے پاس رکھ لی۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ مہینے گزر گئے، سال گزر گئے، اتفاق سے ہارون رشید بیمار پڑ گئے۔ بیمار ایسے پڑے کہ بستر سے لگ گئے، نہ کہیں آنا، نہ کہیں جانا حکیموں نے کہیں جانے آنے سے منع کردیا۔

بہلول عیادت کے لئے ہارون رشید کے پاس پہنچے۔ جاکر کہا کہ امیر المومنین کیا حال ہے؟ کہا بہلول کیا حال سناؤں بہت لمبا سفر درپیش ہے۔ کہاں کا سفر امیر المومنین؟ کہا کہ آخرت کا سفر، اچھا تو وہاں پر آپ نے کتنے لشکر بھیجے ہیں، کتنی چھولداریاں؟ کتنے خیمے؟ ہارون رشید نے کہا بہلول تم بھی عجیب باتیں کرتے ہو، وہ سفر ایسا ہے کہ اس میں کوئی خیمہ نہیں جاتا کوئی آدمی کوئی باڈی گارڈ کوئی لشکر ساتھ نہیں جاتا۔ اچھا جناب واپس کب آئیں گے؟ کہا کہ پھر تم نے ایسی بات شروع کردی

وہ سفر آخرت کا سفر ہے، اس میں جانے کے بعد کوئی واپس نہیں آیا کرتا۔

اچھا اتنا بڑا سفر ہے کہ وہاں سے کوئی واپس بھی نہیں آتا اور کوئی آدمی بھی وہاں پہلے سے نہیں جاسکتا، کہا کہ ہاں بہلول وہ ایسا ہی سفر ہے۔ کہا کہ امیر المؤمنین پھر تو ایک امانت میرے پاس آپ کی بہت مدت سے رکھی ہوئی ہے جو آپ نے یہ کہہ کر دی تھی کہ اپنے سے زیادہ بے وقوف آدمی کو دے دینا، آج مجھے اس چھڑی کا مستحق آپ سے زیادہ کوئی نظر نہیں آتا۔ اس واسطے کہ میں دیکھتا تھا کہ جب آپ کو چھوٹا سا بھی سفر درپیش ہوتا جہاں سے جلدی واپسی ہوتی تو اس کے لئے آپ پہلے سے بہت سا لشکر بھیجا کرتے تھے۔ وہ آپ کا راستہ تیار کرتے تھے منزلیں قائم کرتے تھے، لیکن اب آپ کا اتنا لمبا سفر ہو رہا ہے، اس کی کوئی تیاری بھی نہیں ہے اور جہاں سے واپس آنا بھی نہیں ہے تو مجھے اپنے سے زیادہ بے وقوف صرف آپ ہی ملے ہیں، آپ کے علاوہ کوئی نہیں، یہ چھڑی آپ ہی کو مبارک ہو۔ ہارون رشید یہ بات سن کر رو پڑے، کہا کہ بہلول: ہم تمہیں دیوانہ سمجھا کرتے تھے، لیکن معلوم یہ ہوا کہ تم سے زیادہ حکیم کوئی نہیں۔

موت کو یاد کرو

واقعہ یہ ہے کہ اس دنیا میں ذرا سا کوئی معمول کے خلاف سفر درپیش آجائے تو اس کی پہلے سے تیاریاں ہیں اس کے تذکرے ہیں اس کے لئے پہلے سے کیا کچھ منصوبے بنائے جاتے ہیں۔ لیکن جب آخرت کا سفر پیش آتا ہے اور وہ سفر بھی ایسا ہے بیٹھے بیٹھے پیش آجاتا ہے پہلے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب میرے بغیر اس دنیا کی گاڑی نہیں چل سکتی۔ میں نہیں ہوں گا تو بچوں کا کیا ہوگا؟ بیوی کا کیا ہوگا؟ اور کاروبار کا کیا ہوگا؟ وہ وقت آرہا ہے لیکن ہم اور آپ اس کے بارے میں سوچنے کے لئے تیار نہیں۔ اپنے ہاتھوں سے جنازوں کو کندھے دیتے ہیں، اپنے ہاتھوں سے اپنے پیاروں کو قبر میں اتارتے ہیں، اپنے ہاتھوں سے ان کو مٹی دے کر آتے ہیں۔

لیکن یہ سمجھ کر بیٹھ جاتے ہیں کہ ان کے ساتھ ہوگیا یہ واقعہ۔ ہمارا اس کے ساتھ کیا تعلق؟

سرکار دو عالم محمد صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ:

"لذتوں کو ختم کرنے والی چیز یعنی موت کو کثرت سے یاد کیا کرو"۔

ذرا ہم اپنا جائزہ لیں کہ چوبیس گھنٹوں میں سے کتنا وقت ہم اس موت کو یاد کرنے میں صرف کرتے ہیں؟ بہرحال، اس حدیث کے ذریعہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلادیا کہ تمہاری بنیادی بیماری یہ ہے کہ تم آخرت سے غافل ہو آخرت اگر تمہارے پیش نظر ہوجائے، آخرت تمہاری آنکھوں کے سامنے آجائے اور اس کی فکر تمہارے دل و دماغ پر سوار ہوجائے۔ تمہاری ساری زندگی کی مشکلات ختم ہوجائیں۔ سارے جرائم ساری بدامنی ساری بدعنوانیاں اس بنیاد پر ہیں کہ اسی دنیا کے گرد ہمارا دماغ چکر لگارہا ہے۔ آخرت کی طرف نہیں دیکھتا۔ آخرت کو نہیں سوچتا، اس کا مال ہڑپ کرلوں، اس کا حق ضائع کردوں، اس کا خون پی جاؤں۔ یہ سب اس لئے کرتا ہے، تاکہ میری دنیا درست ہوجائے۔ مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ اس کی کچھ فکر نہیں۔

اور یہ فکر سرور کونین محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیدا کی، اور یہ جو کچھ آپ سیرت کے اندر امن و امان کے سکون اور اطمینان کے واقعات پڑھتے ہیں، وہ درحقیقت اس فکر آخرت کا نمونہ ہیں، کہ دل و دماغ پر ہر وقت جنت کا خیال چھایا ہوا ہے کہ اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے، وہ جنت نظر آرہی ہے اور اس جنت کے خیال میں اللہ تبارک و تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے کے خیال میں انسان جو کام کرتا ہے وہ اللہ کو راضی کرنے والا کرتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ

ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ مدینہ منورہ کے باہر کسی علاقے میں گئے، ایک بکریوں کا چرواہا ان کے پاس سے گزرا، جو روزے سے تھا، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کی دیانت کو آزمانے کے لئے اس سے پوچھا کہ اگر تم بکریوں کے اس گلے میں سے ایک بکری ہمیں بیچ دو تو اس کی قیمت بھی تمہیں دیدیں گے، اور بکری کے گوشت میں سے اتنا گوشت بھی دیدیں گے جس پر تم افطار کرسکو، اس نے جواب میں کہا کہ یہ بکریاں میری نہیں ہیں، میرے آقا کی ہیں، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر اس کی ایک بکری گم ہوجائے گی تو وہ کیا کرے گا؟ یہ سنتے ہی چرواھے نے پیٹھ پھیری اور آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر کہا: فاین اللّٰہ ؟ یعنی اللہ کہاں گیا؟ اور یہ کہہ کر روانہ ہوگیا، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ چرواھے کے اس جملے کو دھراتے رہے، مدینہ منورہ پہنچے تو اس چرواھے کے آقا سے مل کر اس سے بکریاں بھی خرید لیں اور چرواھے کو بھی خرید لیا، پھر چرواھے کو آزاد کردیا، اور ساری بکریاں اس کو تحفے میں دیدیں۔

یہ ہے وہ فکر آخرت کہ جنگل کی تنہائی میں بکریاں چراتے ہوئے چرواھے کے دماغ پر بھی یہ بات مسلط ہے کہ مجھے اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے، اور وہ

زندگی بھی درست کرنی ہے، اگر غلط کام کر کے تھوڑے سے پیسے میرے ہاتھ آبھی گئے تو دنیا کا کچھ فائدہ شاید ہو جائے، لیکن آخرت میرے ہاتھ سے جاتی رہے گی۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ رات کے وقت لوگوں کے حالات دیکھنے کے لئے گشت کیا کرتے تھے، ایک مرتبہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ گشت کرتے ہوئے ایک گھر کے قریب سے گزرے، صبح کے جھٹ پٹے کا وقت تھا، اس گھر میں ایک ماں بیٹی آپس میں باتیں کر رہی تھیں، ماں بیٹی سے کہہ رہی تھی کہ بیٹی! دودھ نکالنے کا وقت آگیا، دودھ نکالو اور ایسا کرنا کہ آج کل ہماری گائے دودھ کم دے رہی ہے، اس لئے دودھ میں پانی ملا دینا تاکہ وہ زیادہ ہو جائے، بیٹی نے کہا کہ اماں جان! میں دودھ میں پانی ملا تو دوں، لیکن امیر المؤمنین کا یہ حکم آیا ہوا ہے کہ کوئی شخص دودھ میں پانی نہ ملائے۔

ماں نے کہا کہ بیٹی امیر المؤمنین کا حکم ضرور ہے، لیکن وہ یہاں کہاں پانی ملاتے ہوئے تجھے دیکھ رہے ہیں، وہ تو کہیں اپنے گھر میں سو رہے ہوں گے، اگر ملا لے گی تو امیر المؤمنین کو پتہ بھی نہیں چلے گا، بیٹی نے کہا کہ اماں جان ٹھیک ہے، ہوسکتا ہے

کہ امیر المومنین کو پتہ نہ چلے، لیکن امیر المومنین کا جو امیر ہے، وہ تو دیکھ رہا ہے، اور جب وہ دیکھ رہا ہے تو میں پھر یہ کام کیسے کر سکتی ہوں؟

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ باہر کھڑے ہوئے یہ گفتگو سن رہے ہیں اور واپس اپنے گھر جانے کے بعد صبح کے وقت اس لڑکی کے بارے میں معلوم کیا کہ یہ کون ہے؟ اس لڑکی کو بلایا اور اپنے صاحب زادے سے ان کا نکاح کردیا اور انہیں کی نسل سے بعد میں امیر المومنین حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ عمر ثانی پیدا ہوئے۔

آخرت کی فکر

یہ ہے وہ ذہنیت کہ جو جانتی ہے کہ والاخرۃ خیر وابقی آخرت بہتر اور زیادہ پائیدار ہے، دل و دماغ پر جب یہ بات بیٹھ گئی تو پھر کوئی گناہ کوئی بدعنوانی کرنے کے لئے ہاتھ نہیں بڑھتا۔ ہر شخص اس کام کی طرف لپک رہا ہے جو جنت بنانے والا ہے اور اللہ کو خوش کرنے والا ہے اور اس کام سے رک رہا ہے جو اللہ کو ناراض کرنے والا ہے۔

یہ ہے درحقیقت اس آیت کا منشاء کہ اگر تم اپنی اس بیماری کو پہچان لو کہ تم ساری دوڑ دھوپ ساری فکر ساری سوچ دنیا کے لئے کر رہے ہو۔ کبھی بیٹھ کر یہ بھی سوچا کرو کہ اتنے آدمیوں کو میں نے مرتے ہوئے دیکھا ہے قبر میں دفن ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ ایک دن میرے ساتھ بھی وہی معاملہ پیش آنے والا ہے اور قبر کے اندر کیا ہونے والا ہے اس کی تفصیل سرکار دو عالم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم بتا گئے کہ قبر میں کیا ہوگا؟ قبر کے بعد کیا ہوگا؟ پورا قرآن کریم آخرت کے تذکرے سے بھرا ہوا ہے اور احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تفصیل سے بتادیا کہ آخرت کے اندر کیا ہونے والا ہے۔ تاکہ آخرت کا خیال دلوں پر مسلط ہوجائے۔ آخرت کا خیال دلوں پر بیٹھ جائے۔ لیکن ہم اور آپ اپنے چوبیس گھنٹوں

میں سے کوئی وقت اس کام کے لئے نہیں نکالتے کہ جس کے اندر ہم آپ اس بات کو سوچا کریں۔

یہ فکر کس طرح پیدا ہو؟

اب سوال یہ ہے کہ یہ دنیا کی زندگی کی فکر جو غالب آئی ہوئی ہے اس کو کیسے مغلوب کیا جائے؟ اور آخرت کی فکر کو غالب کیسے کیا جائے؟ کیسے یہ بات دل میں بیٹھے جو اس چرواہے کے دل میں بیٹھ گئی تھی؟ کیسے وہ بات دل میں بیٹھے جو اس نوجوان لڑکی کے دل میں بیٹھ گئی تھی کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے یہ بات کسی طرح دل میں پیدا ہو؟

راستہ اس کا ایک ہی ہے وہ یہ کہ جس کو آخرت کی فکر ہو، جس کے دل میں اللہ کے سامنے جوابدہی کا احساس ہو۔ اس کی صحبت اختیار کرلو، اس کے ساتھ رہو، اس کے پاس بیٹھو، اس کی باتیں سنو تو وہ آخرت کی فکر تمہارے دل میں بھی منتقل ہو جائے گی،

یہ صحبت ہی وہ چیز ہے جس نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو بدل دیا، آخر یہ لوگ وہی تو تھے جو دنیا کی معمولی باتوں پر ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے، مرغی کے بچے کی خاطر چالیس سال جنگ جاری رہی۔ کنویں کی خاطر زمینوں کی خاطر معمولی معمولی بکریوں اور جانوروں کی خاطر ایک دوسرے کے گلے کاٹے جارہے تھے، ایک دوسرے کی گردنیں اتاری جارہی تھیں، ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بنے ہوئے تھے، وہی لوگ تو تھے، لیکن جب سرکار دو عالم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت نصیب ہوگئی تو وہ ساری دنیا طلبی ایسی راکھ ہوئی کہ سارے گھر بار مکہ مکرمہ میں چھوڑ کر دشمنوں کے حوالے کر کے صرف تن کے کپڑوں کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ طیبہ چلے آئے۔

صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی حالت

انصار مدینہ نے پیش کش کی کہ آپ ہمارے بھائی ہیں۔ لہٰذا ہماری زمینیں آدھی آپ لے لیں۔ آدھی ہم رکھ لیں، لیکن مہاجرین نے کہا کہ نہیں، ہم وہ زمینیں اس طرح لینے کے لئے تیار نہیں۔ البتہ آپ کی زمینوں میں محنت کریں گے، محنت کے بعد جو پیداوار ہوگی، وہ آپس میں تقسیم کرلیں گے —— بتایئے کہ ان کی وہ دنیا طلبی کہاں گئی؟

میدان جہاد میں جنگ ہو رہی ہے موت آنکھوں کے سامنے ناچ رہی ہے اس وقت کوئی حدیث سنا دیتا ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اللہ کے راستے میں شہید ہو تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو جنت کے اعلیٰ درجات عطا فرماتے ہیں۔ ایک صحابی نے پوچھا: کیا واقعی یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تم نے سنی؟ کہا کہ ہاں میں نے سنی، میرے کانوں نے سنی، میرے دل نے یاد رکھا۔ ان صحابی نے کہا کہ اچھا بس اب تو میرے اوپر جہاد سے علیحدگی حرام ہے۔ تلوار اٹھائی اور دشمن کے زغے کے اندر گھسے، تیر آکر سینے کے اوپر لگا سینے سے خون کا فوارہ ابلتا ہوا دیکھ کر جو الفاظ زبان سے جاری ہوتی ہیں وہ یہ کہ "فزت ورب الکعبہ" رب کعبہ کی قسم آج میں کامیاب ہوگیا، آج منزل مل گئی۔

یہ وہی دنیا کے طالب، وہی دنیا کے چاہنے والے، دنیا کے پیچھے دوڑنے والے تھے، لیکن نبی کریم سرور دو عالم محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے آخرت دل و دماغ پر اس طرح چھاگئی۔

جادوگروں کا مضبوط ایمان

قرآن کریم میں حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا واقعہ آتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب فرعون کو دعوت دی اور معجزہ دکھایا، عصاہ زمین پر ڈالا تو

وہ سانپ بن گیا تو فرعون نے کہا ان کے مقابلے کے لئے جادوگر لانے چاہئیں۔ سارے ملک سے جادوگر اکٹھے کر کے ان سے کہا کہ آج تمہارا مقابلہ ایک بڑے جادوگر سے ہے، اور آج تم ان کے اوپر غالب آکر دکھاؤ، اپنے فن کا مظاہرہ کرو، جادوگر آئے، جو فرعون کے چہیتے جادوگر تھے۔ لیکن پہلے بھاؤ تاؤ طے کیا کہ:

﴿قَالُوٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ﴾

(الشعراء:۴۱)

پہلے یہ بتلایئے فرعون صاحب کہ اگر ہم موسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام پر غالب آگئے تو کچھ اجرت بھی ملے گی یا نہیں ملے گی؟ کوئی انعام ملے گا کہ نہیں ملے گا؟

﴿قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ﴾

ہاں ضرور انعام ملے گا اور نہ صرف انعام ملے گا بلکہ تمہیں ہمیشہ کے لئے اپنا مقرب بنالوں گا۔ جب مقابلہ کا وقت آیا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے جادوگر کھڑے ہوئے تو جادوگروں نے اپنی رسیاں ڈالیں، لاٹھیاں ڈالیں تو وہ سانپ بن کر چلنا شروع ہوگئیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وحی فرمائی اور فرمایا کہ اب تم اپنا عصا ڈالو، حضرت موسیٰ نے اپنا عصا ڈالا اور وہ عصا ایک اژدہا بن کر جتنے سانپ ان جادوگروں نے بنائے تھے ان سب کو ایک ایک کر کے نگلنا شروع کردیا۔ سارے سانپوں کو نگل گیا، جادوگر فن جانتے تھے۔ سمجھ گئے یہ جو کچھ دکھایا جارہا ہے یہ جادو نہیں ہے، اگر جادو ہوتا تو ہم غالب آجاتے، ہمارا جادو مغلوب ہوگیا اس لئے یہ جادو نہیں ہے۔ یہ جو بات کررہے ہیں کہ وہ اللہ کی طرف سے بھیجے ہوئے پیغمبر ہیں، وہ یقیناً اللہ کے پیغمبر ہیں۔ دل میں بات آگئی اور جب پیغمبر پر ایمان لے آئے، اور پیغمبر کے معجزہ کو آنکھوں سے دیکھ لیا اور پیغمبر کی ذرا سی دیر زیارت کرلی۔ صحبت اس کی حاصل ہوگئی، ایک دم سارے کے سارے جادوگر پکار اٹھے۔

﴿آمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى﴾ (طٰہٰ:۷۰)

"ہم موسیٰ و ہارون کے پروردگار پر ایمان لے آئے"۔

فرعون یہ سب نظارہ دیکھ رہا ہے، وہ کہتا ہے:

﴿اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ﴾

ارے تم اس کے اوپر ایمان لے آئے، میں نے تمہیں اب تک ایمان لانے کی اجازت بھی نہیں دی، اجازت سے پہلے ایمان لے آئے اور ساتھ میں پھر سزا کی دھمکی بھی دی کہ یاد رکھو کہ اگر تم اس پر ایمان لائے تو تمہارا حشر یہ ہوگا۔

﴿لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ وَلَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبْقٰى﴾ (طٰہٰ:۷۱)

میں تمہارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ دوں گا، اور تمہیں کھجور کے شہتیر میں سولی پر چڑھاؤں گا اور تب پتہ چلے گا کہ کس کا عذاب زیادہ سخت ہے —— یہ دھمکی دے رہا ہے فرعون۔ اب آپ ذرا غور فرمایئے کہ وہی جادوگر جو ابھی تھوڑی دیر پہلے بھاؤ تاؤ کر رہے تھے کہ کیا ہمیں اجرت بھی ملے گی؟ وہی جادوگر جو فرعون کی طلبی پر موسیٰ علیہ السلام کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اب نہ صرف یہ کہ وہ اجرت کی طلب باقی نہ رہی، بلکہ اب پھانسی کا تختہ سامنے لٹکا ہوا نظر آرہا ہے۔ فرعون کہہ رہا ہے میں اس پر چڑھادوں گا۔ ہاتھ پاؤں کاٹ دوں گا، لیکن اس سب کے باوجود ان کی زبان سے نکلتا ہے۔

﴿قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِيْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ﴾ (سورۃ طٰہٰ:۷۲)

اے فرعون، خوب سمجھ لو کہ ہم تمہیں اور تمہارے مال و دولت کو تمہاری سلطنت کو اس معجزے پر ترجیح نہیں دیں گے۔ جو اللہ نے ہمیں کھلی آنکھوں سے دکھا دیا۔ جو تجھے کرنا ہو کر گزر، کیوں؟ اس واسطے کہ جو کچھ فیصلہ تو کرے گا وہ اس

دنیوی زندگی کا فیصلہ ہوگا، تو ہمارے ہاتھ کاٹنے یا پاؤں کاٹنے، سولی پر چڑھائے، یا پھانسی چڑھائے، یہ دنیا کا فیصلہ ہوگا، اور ہم نے جو منظر دیکھا ہے وہ آخرت کا منظر ہے، وہ ابدی زندگی کا منظر ہے دیکھئے: ایک لمحے پہلے تو اجرت مانگ رہے تھے کہ پیسے لاؤ اور اب ایک لمحے کے بعد یہ حالت ہوگئی کہ سولی پر چڑھنے کے لئے تیار ہوگئے، یہ کایا کس نے پلٹی؟ یہ ایمان کے ساتھ جب صحبت نصیب ہوئی۔ اس نے یہ کایا پلٹ دی۔

صحبت کا فائدہ

بہرحال، ایمان کے ساتھ اعتقاد کے ساتھ جب صحبت ہوتی ہے تو وہ دلوں کے اندر یہ جذبے پیدا کیا کرتی ہے پھر دنیا طلبی مٹتی ہے آخرت کی فکر غالب آجاتی ہے اور جب یہ غالب آجائے تو اس وقت انسان انسان بنتا ہے جب تک اس کے دل و دماغ پر دنیا مسلط ہے وہ انسان نہیں، درندہ ہے۔ اس واسطے کہ وہ تو چاہتا ہے کہ دنیا کے اندر مجھے خوشحالی مل جائے۔ خواہ کسی کی گردن پھلانگ کر ہو، کسی کی لاش پر کھڑے ہو کر ہو، اور کسی کی گردن کاٹ کر ہو، لیکن مجھے کسی طریقہ سے دنیا کا فائدہ حاصل ہوجائے وہ درندہ بن جاتا ہے۔ انسان بننے کا راستہ سوائے اس کے نہیں کہ آدمی مرنے کے بعد کی بات کو سوچے۔ آخرت کی بات کو سوچے اور یہ صرف اور صرف آخرت کی فکر رکھنے والوں کی صحبت سے نصیب ہوتی ہے۔ درحقیقت اس دین کو حاصل کرنے کا اور اپنی زندگیوں میں اس کو رچانے کا واحد راستہ یہی ہے کہ اللہ والوں کی صحبت اٹھائی جائے، اللہ والا اسی کو کہتے ہیں جو آخرت کی فکر رکھتا ہو، اس کی صحبت میں آدمی بیٹھے گا تو اس کو آخرت کی فکر حاصل ہوگی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ اپنی رحمت سے اپنے فضل و کرم سے ہمارے دلوں میں یہ جذبہ پیدا فرمائے تو ساری مشکلات حل ہوجائیں۔

آج کی دنیا کا حال

آج ہمارے اوپر مسائل و مشکلات کا طوفان چاروں طرف مسلط ہے اس کو حل کرنے کے لئے محکمے ہیں پولیس ہے عدالتیں ہیں لیکن سرکاری دفتروں میں رشوت بہت لی جاتی ہے۔ اچھا بھائی اس کا یہ علاج کیا جائے کہ محکمہ انسداد رشوت ستانی بناؤ، چنانچہ اب محکمہ انسداد رشوت ستانی بن گیا۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا کہ رشوت پہلے پانچ روپے ہوتی تھی، اب دس روپے ہو گئی۔ اور رشوت میں اب دو حصے لگ گئے۔ ایک حصہ سرکاری افسر کا، اور ایک محکمہ انسداد رشوت ستانی کے افسر کا بھی حصہ لگ گیا، اب انسداد رشوت ستانی کے اوپر ایک اور نگران بٹھادو اس نگران پر ایک اور نگران بٹھادو اور چلتے چلے جاؤ، رشوت کا ریٹ بڑھتا چلا جائے گا لیکن رشوت نہیں بند ہوگی کیوں؟ اس واسطے کہ جس کو بھی بٹھار ہے ہو۔ اس کے سامنے بس یہ دنیا چکر لگارہی ہے اس کے سامنے صرف یہ ہے کہ کسی طرح دوسرے کے بنگلے سے میرا اچھا بنگلہ بن جائے۔ دوسرے کی کار سے میری کار اچھی ہو جائے۔ دوسروں کے کپڑوں سے میرے کپڑے اچھے ہو جائیں۔ یہ اس کے دل و دماغ پر ہر وقت یہ بھوت چھایا ہوا ہے، اب چاہے کتنے محکمے بٹھاتے چلے جاؤ عدالتیں لگاتے چلے جاؤ، قانون بناتے چلے جاؤ، قانون بھی دو دو روپے میں بکتا ہے، میں دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ اگر خدا کا خوف نہیں، اگر آخرت کی فکر نہیں، اللہ کے سامنے جوابدہی کے احساس نہیں۔ تو پھر ہزار قانون بنالو، ہزار محکمے بٹھا دو، ہزار پولیس والے بٹھادو۔ لیکن خدا کے خوف کے بغیر سب بیکار، یہ امریکہ دنیا کے اندر سب سے مہذب ترین ملک کہلانے والا، بچہ بچہ تعلیم یافتہ، سو فیصد تعلیم، دولت کی ریل پیل، سائنسی ٹیکنالوجی اور دنیا بھر کے تمام علوم وفنوں کا مرکز، پولیس ہروقت چوکس اور فعال کوئی رشوت نہیں کھاتا۔ پولیس والے کو رشوت دے کر باز نہیں رکھا جاسکتا۔ پولیس تین منٹ کے نوٹس پر پہنچ جاتی ہے لیکن وہاں کا یہ حال ہے کہ مجھے نصیحت کرنے والوں

نے یہ نصیحت کی کہ براہ کرم جب آپ اپنے ہوٹل سے باہر نکلیں تو بہتر یہ ہے کہ گھڑی ہاتھ پر نہ باندھیں اور آپ کی جیب کے اندر پیسے بھی نہ ہوں، تھوڑے بہت جو ضرورت کے ہوں رکھ لیجئے۔ کیونکہ خطرہ ہے کہ کسی وقت بھی کوئی آدمی گھڑی چھین کر لے جائے گا، کوئی آدمی آپ کی جیب سے پیسے نکال کر لے جائے گا، اور اس کی خاطر آپ کا خون تک کردے گا۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے، اور قانون بیٹھا تماشہ دیکھ رہا ہے۔ پولیس تین منٹ کے نوٹس پر پہنچنے والی بے بس ہے۔ محکمے، عدالتیں سب اپنی جگہ پر کھڑی ہوئی ہیں، ایک طرف چاند پر جھنڈے گاڑ رہا ہے، اور امریکہ کا صدر یہ بیان دے رہا ہے کہ آج ہمارا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ جرائم پر کیسے قابو پائیں؟ وہ جو اقبال مرحوم نے کہا تھا کہ ۔

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزر گاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

دنیا یہ منظر دیکھ رہی ہے اور دیکھتی رہے گی، اور جب تک سرکار دو عالم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر سر نہیں رکھے گی، اور جب تک آپ کی رہنمائی میں آخرت کی فکر دل و دماغ پر مسلط نہیں ہوگی۔ اس وقت تک یہ منظر نظر آتے رہیں گے۔ ہزار قانون بناتے رہو، ہزار محکمے بٹھاتے رہو، تمہارے مسائل کا حل کبھی نہیں نکلے گا، مسائل کے حل کا راستہ یہی ہے کہ اللہ والوں کی صحبت اختیار کریں، ان کے پاس بیٹھیں، ان کی بات سنیں، آخرت کے حالات معلوم کریں۔

اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہمیں اس کی حقیقت سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آخرت کی فکر ہمارے دلوں کے اوپر غالب فرمائے اور دنیا طلبی کی دوڑ جس کے اندر ہم مبتلا ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس سے ہمیں بچائے اور اہل اللہ کی صحبت نصیب

فرمائے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

دوسروں کو خوش کیجئے

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

تاریخ خطاب : ۳۰ / مارچ ۱۹۹۷ء

مقام خطاب : جامع مسجد بیت المکرم
گلشن اقبال کراچی

وقت خطاب : بعد نماز عصر تا مغرب

اصلاحی خطبات : جلد نمبر ۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دوسروں کو خوش کیجئے

الحمد للّٰہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ و نؤمن بہ ونتوکل علیہ۔ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا، من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ، ونشھد ان لا الہ الا اللّٰہ وحدہ لاشریک لہ، ونشھدان سیدنا وسندنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ، صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وبارک وسلم تسلیماً کثیرًا کثیرا۔

اما بعد!

﴿عن عبد اللّٰہ بن عمر رضی اللّٰہ عنھما قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: احب الاعمال الی اللّٰہ سرور یدخلہ علیٰ مسلم﴾

(المعجم الکبیر، حدیث نمبر: ۱۳۶۴۶)

تمہید

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو اعمال اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں، ان اعمال میں سے ایک عمل کسی مؤمن کے دل میں خوشی داخل کرنا اور اس کو خوشی سے ہم کنار کرنا ہے۔ اس حدیث کی سند اگرچہ کمزور ہے مگر اس حدیث کا مضمون دوسری احادیث اور دلائل سے بھی ثابت ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد احادیث میں اور

اپنے قول و فعل کے ذریعہ یہ بات واضح فرمائی ہے کہ کسی بھی صاحب ایمان کو خوش کرنا اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔

میرے بندوں کو خوش رکھو

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ جب کوئی بندہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے اپنی محبت کا اظہار کرتا ہے تو اللہ جل جلالہ جواب میں زبان حال سے گویا یوں فرماتے ہیں کہ اگر مجھ سے محبت کرتے ہو تو میں تو تمہارے ساتھ دنیا میں ملنے والا نہیں ہوں کہ تم کسی وقت مجھ سے ملاقات کرکے اپنی محبت کا اظہار کرو۔ لیکن اگر تم کو میرے ساتھ محبت ہے تو اس کا تقاضہ یہ ہے کہ میرے بندوں کے ساتھ محبت کرو، میری مخلوق سے محبت کرو، اور میری مخلوق سے محبت کرنے کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کو حتی الامکان خوش کرنے کی اور خوش رکھنے کی کوشش کرو۔

دل بدست آور کہ حج اکبر است

اس بارے میں ہمارے معاشرے میں افراط و تفریط پائی جاتی ہے، اعتدال نہیں ہے۔ کچھ لوگ تو وہ ہیں جو کسی دوسرے مسلمان کو خوش کرنے کی کوئی اہمیت ہی نہیں سمجھتے اور ان کو یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ کتنی بڑی عبادت ہے۔ کسی بھی مسلمان کو خوش کردیا یا کسی انسان کو خوش کردیا تو اللہ تبارک و تعالیٰ اس پر کتنا اجر و ثواب عطا فرماتے ہیں، اس کا ہمیں احساس ہی نہیں۔ بزرگوں نے فرمایا کہ ؎

دل بدست آور کہ حج اکبر است

یعنی کسی مسلمان کا دل ہاتھ میں لے لینا یعنی اس کے دل کو خوش کردینا یہ حج اکبر ہے۔ بزرگوں نے ویسے ہی اس کو حج اکبر نہیں کہدیا بلکہ کسی مسلمان کے دل کو

خوش کر دینا واقعی اللہ تعالیٰ کے محبوب اعمال میں سے ہے۔

دوسروں کو خوش کرنے کا نتیجہ

ذرا اس بات کو سوچیں کہ اگر اس حدیث کی تعلیم پر ہم سب عمل کرنے لگیں اور ہر انسان اس بات کی فکر کرے کہ میں کسی دوسرے کو خوش کروں تو یہ دنیا جنت کا نمونہ بن جائے، کوئی جھگڑا باقی نہ رہے، پھر کوئی حسد باقی نہ رہے اور کسی بھی شخص کو دوسرے سے کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ لہٰذا اہتمام کر کے دوسرے کو خوش کرو، تھوڑی سی تکلیف اٹھا کر اور قربانی دے کر دوسروں کو خوش کرو، اگر تم تھوڑی سی تکلیف اٹھا لو گے اور اس کے نتیجے میں دوسرے کو راحت اور خوشی مل جائے گی تو دنیا میں چند لمحوں اور چند منٹوں کی جو تکلیف اٹھائی ہے اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ آخرت میں جو ثواب تمہیں عطا فرمائیں گے وہ دنیا کی اس معمولی سی تکلیف کے مقابلے میں کہیں زیادہ عظیم ہے۔

خندہ پیشانی سے ملاقات کرنا "صدقہ" ہے

ایک حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ کی بہت سی قسمیں بیان فرمائی ہیں کہ یہ عمل بھی صدقہ ہے، فلاں عمل بھی صدقہ ہے، فلاں عمل بھی صدقہ ہے، اور صدقہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس عمل پر ایسا ہی ثواب ہے جیسے صدقہ کرنے کا ثواب ہے، پھر اسی حدیث کے آخر میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿وان تلقی اخاک بوجه طلق﴾

یعنی ایک صدقہ یہ ہے کہ اپنے بھائی کے ساتھ شگفتہ اور مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ ملو۔ جب تم کسی سے ملاقات کرو تو تم کو یہ احساس ہو کہ تمہاری ملاقات

سے اس کو خوشی ہوئی ہے اور اس ملاقات سے اس کے دل میں ٹھنڈک محسوس ہو۔ اس کو صدقہ کرنے میں شمار فرمایا ہے۔

لہٰذا جو لوگ دوسروں سے ملاقات کے وقت اور برتاؤ کے وقت لئے دیے رہتے ہیں اور وقار کے پردے میں اپنے آپ کو ریزرو رکھتے ہیں، وہ لوگ سُنّت طریقہ پر عمل نہیں کرتے، سُنّت طریقہ یہ ہے کہ جب اپنے مسلمان بھائی سے ملے تو وہ خوش خلقی کے ساتھ شگفتگی کے ساتھ ملے اور اس کو خوش کرنے کی کوشش کرے۔

گناہ کے ذریعے دوسروں کو خوش نہ کریں

دوسری طرف بعض لوگوں میں یہ بے اعتدالی پائی جاتی ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ چونکہ دوسرے مسلمان کو خوش کرنا بڑی عبادت ہے، لہٰذا ہم تو یہ عبادت کرتے ہیں کہ دوسروں کو خوش کرتے ہیں، چاہے وہ خوش کرنا کسی گناہ کے ذریعہ ہو یا کسی ناجائز کام کے ذریعہ ہو، جب اللہ تعالیٰ نے کہہ دیا کہ دوسروں کو خوش کرو تو ہم یہ عبادت انجام دے رہے ہیں۔ حالانکہ یہ گمراہی کی بات ہے، اس لئے کہ دوسروں کو خوش کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مباح اور جائز طریقے سے خوش کرو، اب اگر ناجائز طریقے سے دوسروں کو خوش کرو گے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ گناہ کر کے اللہ تعالیٰ کو تو ناراض کردیا اور بندے کو خوش کردیا، یہ کوئی عبادت نہیں۔ لہٰذا اگر دوسرے کی مروت میں آکر یا اس کے تعلقات سے مرعوب ہو کر گناہ کا ارتکاب کرلیا تو یہ کوئی دین نہیں، یہ کوئی عبادت نہیں۔

فیضی شاعر کا واقعہ

اکبر بادشاہ کے زمانے میں "فیضی" بہت بڑے ادیب اور شاعر گزرے ہیں، ایک مرتبہ وہ حجام سے داڑھی منڈوا رہے تھے، ایک صاحب ان کے پاس سے گزرے، انہوں نے جب دیکھا کہ فیضی صاحب داڑھی منڈوا رہے ہیں تو ان سے کہا کہ

آغا ریش می تراشی؟

"جناب! آپ یہ داڑھی منڈوا رہے ہیں؟"

جواب میں فیضی نے کہا ۔

"بلے! ریش می تراشم، ولے دلے کسے نمی خراشم"

"جی ہاں! داڑھی تو منڈوا رہا ہوں لیکن کسی کا دل نہیں دکھا رہا ہوں"۔

مطلب یہ تھا کہ میرا عمل میرے ساتھ ہے اور میں کسی کی دل آزاری نہیں کر رہا ہوں، اور تم نے جو میرے اس عمل پر مجھے ٹوکا تو اس کے ذریعہ تم نے میرا دل دکھایا۔ اس پر ان صاحب نے جواب میں کہا کہ:

"دلے کسے نمی خراشی، ولے دلے رسول اللہ می خراشی (صلی اللہ علیہ وسلم)"۔

یعنی جو یہ کہہ رہے ہو کہ میں کسی کا دل نہیں دکھا رہا ہوں، ارے اس عمل کے ذریعہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دل دکھا رہے ہو۔

اللہ والے دوسروں کو خوش رکھتے ہیں

لہٰذا بعض لوگوں کے ذہن میں بھی اور زبان پر بھی یہ بات رہتی ہے کہ ہم تو دوسرے لوگوں کا دل خوش کرتے ہیں، اور اب دوسروں کا دل خوش کرنے کے لئے کسی گناہ کا ارتکاب بھی کرنا پڑا تو کر گزریں گے۔ بھائی! اللہ تعالیٰ کو ناراض کر کے، اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر کے اور اللہ تعالیٰ کے حکم کو پامال کر کے کسی انسان کا دل خوش کیا، تو کیا خوش کیا کیونکہ اللہ تعالیٰ کو تو ناراض کر دیا، یہ تو کوئی عبادت نہیں ہے ـــــ اس حدیث کا منشا یہ ہے جو جائز امور ہیں، ان میں مسلمانوں کو خوش کرنے

کی فکر کرو —— حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"یہ معمول صوفیاء کا مثل طبعی کے ہے"۔

یعنی صوفیاء کرام جو اللہ کے دوست اور اللہ کے ولی ہوتے ہیں، ہر مسلمان کو خوش کرنے کی فکر ان کی طبیعت بن جاتی ہے، ان کے پاس آکر آدمی ہمیشہ خوش ہو کر جاتا ہے، ملول ہو کر نہیں۔ اس لئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل سے ان کو اس سُنّت پر عمل کی توفیق ہوتی ہے کہ وہ اللہ کے بندوں کو خوش کرتے ہیں۔ پھر آگے فرمایا کہ:

خود گناہ میں مبتلا نہ ہو

"اس کی ایک شرط ہے، وہ یہ کہ اس سرور کو داخل کرنے سے خود شرور میں داخل نہ ہو جائے"۔

یعنی دوسروں کا تو دل خوش کر رہا ہے اور اس کو سرور دینے کی فکر میں ہے لیکن اس کے نتیجے میں خود شرور میں یعنی معاصی اور گناہ میں داخل ہو گیا، یہ نہ کرے۔ آگے فرمایا:

"جیسا ان لوگوں کا طریقہ ہے جنہوں نے اپنے مسلک کا لقب "صلح کل" رکھا ہوا ہے"۔

یعنی بعض لوگوں نے اپنا مسلک "صلح کل" بنایا ہے، ان کا کہنا یہ ہے کہ ہم تو "صلح کل" ہیں، لہٰذا کوئی کچھ بھی کرے، ہم کسی کو بھی کسی غلطی پر نہیں ٹوکیں گے، کسی بُرائی کو بُرائی نہیں کہیں گے، کسی بُرائی کی تردید نہیں کریں گے، ہم تو "صلح کل" ہیں۔ یہ طریقہ صحیح نہیں ہے، چنانچہ آگے حضرت والا فرماتے ہیں کہ:

امر بالمعروف کو نہ چھوڑے

"بعض لوگ تو اسی وجہ سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہیں کرتے"۔

مثلاً اگر فلاں کو نماز پڑھنے کے لئے کہیں گے تو اس کا دل برا ہوگا، اگر فلاں کو کسی گناہ پر ٹوکیں گے تو اس کا دل برا ہوگا، اور ہم سے کسی کا جی برا نہ ہو۔ پھر فرمایا کہ:

"کیا ان کو قرآن پاک کا یہ حکم نظر نہیں آیا کہ: "ولا تاخذکم بھما رافۃ فی دین اللہ" کہ تم کو اللہ کے دین کے بارے میں ان پر ترس نہ آئے"۔

یعنی ایک شخص دین کی خلاف ورزی کر رہا ہے، گناہ کا ارتکاب کر رہا ہے، اس کے بارے میں تمہارے دل میں یہ شفقت پیدا نہ ہو کہ اگر میں اس کو گناہ کرنے پر ٹوکوں گا تو اس کا دل دکھے گا۔

نرم انداز سے نہی عن المنکر کرے

البتہ یہ ضروری ہے کہ اس کو کہنے کے لئے طریقہ ایسا اختیار کرے جس سے اس کا دل کم سے کم دکھے، دل آزار اسلوب اختیار نہ کرے بلکہ نرمی کا انداز ہو، اس میں ہمدردی ہو، محبت ہو، شفقت ہو، خیر خواہی ہو، اخلاص ہو، غصہ نکالنا مقصود نہ ہو۔ لیکن یہ سوچنا کہ اگر میں اس کو ٹوکوں گا تو اس کا دل دکھے گا، چاہے کتنے بھی نرم انداز میں کہوں تو یہ سوچ درست نہیں، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا تمام مخلوق کو راضی کرنے سے مقدم ہے۔ لہٰذا دونوں انتہائیں غلط ہیں، افراط بھی اور تفریط بھی۔ بس اپنی طرف سے ہر مسلمان کو خوش کرنے کی کوشش کرو، لیکن

جہاں اللہ کی حدود آجائیں، حرام اور ناجائز امور آجائیں تو پھر کسی کا دل دکھے یا خوش ہو اس وقت بس اللہ ہی کا حکم ماننا ہے، اس وقت اطاعت صرف اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی کرنی ہے، کسی اور کی پروا نہیں کرنی ہے۔ البتہ حتی الامکان نرمی کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

مزاح و مذاق
کی رعایت کریں

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

تاریخ خطاب : ۳۰ر مارچ ۱۹۹۷ء

مقام خطاب : جامع مسجد بیت المکرم
گلشن اقبال کراچی

وقت خطاب : بعد نماز عصر تا مغرب

اصلاحی خطبات : جلد نمبر ۹

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

دوسروں کے مزاج ومذاق کی رعایت کریں

الحمد للّٰہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ و نؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا، من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ، ونشھد ان لا الہ الا اللّٰہ وحدہ لاشریک لہ، ونشھدان سیدنا وسندنا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ، صلی اللّٰہ تعالٰی علیہ وعلی آلہ واصحابہ وبارک وسلم تسلیماً کثیراً کثیرا۔

اما بعد!

﴿عن ابی ذرالغفاری رضی اللّٰہ عنہ قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: خالقوا الناس باخلاقھم -- اوکما قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم﴾ (اتحاف السادۃ المتقین ۶: ۳۵۴)

تمہید

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لوگوں کے ساتھ ان کے مزاج و مذاق اور اخلاق کے مطابق

برتاؤ کرو۔ یہ بھی دین کا ایک حصہ ہے کہ انسان کو جن لوگوں سے واسطہ پڑے، ان کے مزاج اور مذاق کی رعایت کرے اور وہ کوئی ایسا کام نہ کرے جو ان کے مزاج و مذاق کے خلاف ہو اور جس سے ان کو تکلیف پہنچے، چاہے وہ کام فی نفسہ جائز ہو، حرام اور ناجائز کام نہ ہو لیکن یہ خیال کر کے کہ اس کام کے کرنے سے ان کے مزاج پر بار ہو گا تو وہ کام نہ کیا جائے تاکہ اس سے ان کی طبیعت پر کوئی گرانی پیدا نہ ہو۔

"دوسرے کے مزاج و مذاق کی رعایت" دینی معاشرت کے ابواب میں ایک بڑا عظیم باب ہے، اللہ تعالیٰ حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے درجات بلند فرمائے۔ آمین۔ انہوں نے اس باب کو واضح کیا ہے، اس لئے کہ یہ بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا بڑا عظیم پہلو ہے۔

حضرت عثمان غنیؓ کے مزاج کی رعایت

چنانچہ حدیث شریف میں واقعہ آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر میں تشریف فرما تھا اور آپ اس حالت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ نے ایک تہبند پہنا ہوا تھا اور وہ تہبند کافی اوپر تک چڑھا ہوا تھا، اور بعض روایات میں آتا ہے کہ گھٹنے تک چڑھا ہوا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ واقعہ اس وقت کا ہو جب گھٹنے کا حصہ ستر میں داخل قرار نہیں دیا گیا تھا۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ گھٹنے ڈھکے ہوئے تھے۔ اتنے میں کسی نے دروازے پر دستک دی، معلوم ہوا کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تشریف لائے ہیں، آپ نے اندر آنے کی اجازت دے دی، وہ اندر آکر آپ کے پاس بیٹھ گئے اور آپ جس انداز میں بیٹھے ہوئے تھے اسی انداز میں بیٹھے رہے اور آپ کے پاؤں مبارک کھلے رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر دروازے پر دستک ہوئی، پتہ چلا کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ تشریف لائے ہیں، آپ نے ان کو بھی اندر آنے کی اجازت دے دی، وہ بھی آکر حضور اقدس

صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھ گئے، آپ اسی حالت میں بیٹھے رہے اور اپنی ہیئت میں آپ نے کوئی تبدیلی نہیں فرمائی۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر دروازے پر دستک ہوئی، آپ نے پوچھا کہ کون ہیں؟ پتہ چلا کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ تشریف لائے ہیں، آپ نے فوراً اپنا تہبند نیچے کر کے اپنے پاؤں مبارک اچھی طرح ڈھک لئے۔ پھر فرمایا کہ ان کو اندر بلالو، چنانچہ وہ بھی اندر آکر بیٹھ گئے۔

ان سے تو فرشتے بھی حیا کرتے ہیں

ایک صاحب یہ سب منظر دیکھ رہے تھے، انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! جب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تشریف لائے تو آپ نے اپنا تہبند نیچے نہیں کیا بلکہ ویسے ہی بیٹھے رہے، جب حضرت فاروق اعظم تشریف لائے تب بھی آپ اسی طرح بیٹھے رہے، لیکن جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ تشریف لائے تو آپ نے اپنی ہیئت میں تبدیلی پیدا فرمائی، اس کی کیا وجہ ہے؟ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا: میں اس شخص سے کیوں حیا نہ کروں جس سے فرشتے بھی حیا کرتے ہیں۔

کامل الحیاء والایمان

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا خاص وصف "حیاء" تھا۔ اللہ تعالیٰ نے "حیاء" میں ان کو بہت اونچا مقام عطا فرمایا تھا، اور آپ کا لقب "کامل الحیاء والایمان" تھا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تمام صحابہ کے مزاجوں سے واقف تھے اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے بارے میں جانتے تھے کہ ان کے اندر حیا بہت ہے، اگرچہ گھٹنے تک پاؤں کھلا ہونا کوئی ناجائز بات نہیں تھی اس لئے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے آنے پر بھی کھلا رکھا اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے آنے پر بھی کھلا رکھا لیکن حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے

آنے پر یہ سوچا کہ چونکہ ان کی طبیعت میں حیاء زیادہ ہے، اگر ان کے سامنے اسی طرح بیٹھا رہوں گا تو ان کی طبیعت پر ناگوار ہوگا اور ان کی طبیعت پر بار ہوگا۔ اس وجہ سے ان کے اندر آنے سے پہلے پاؤں کو ڈھک لیا اور تہبند کو نیچے کر لیا۔

وہ حضرات صحابہ جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اشارے پر اپنی جانیں قربان کرنے کے لئے تیار تھے، ان کے مزاجوں کی آپ نے اتنی رعایت فرمائی۔ فرض کریں کہ اگر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے آنے پر اسی طرح بیٹھے رہتے جس طرح بیٹھے ہوئے تھے تو ان کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا شکوہ ہو سکتا تھا، لیکن آپ نے اس بات کی تعلیم دے دی کہ تمہارے تعلق والوں میں جو شخص جیسا مزاج رکھتا ہو اس کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کرو۔ دیکھئے: حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کتنی باریک بینی سے اپنے رفقاء کے مزاجوں کا خیال فرمایا کرتے تھے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مزاج کی رعایت

ایک مرتبہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے عمر (رضی اللہ عنہ) میں نے ایک عجیب خواب دیکھا ہے، میں نے خواب میں جنت دیکھی اور اس جنت میں ایک بڑا عالیشان محل بنا ہوا دیکھا، میں نے پوچھا کہ یہ محل کس کا ہے؟ مجھے بتایا گیا کہ یہ عمر (رضی اللہ عنہ) کا محل ہے، ان کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ وہ محل مجھے اتنا اچھا لگا کہ میرا دل چاہا کہ اندر چلا جاؤں اور اندر جا کر دیکھوں کہ عمر (رضی اللہ عنہ) کا محل کیسا ہے، لیکن پھر اے عمر (رضی اللہ عنہ) تمہاری غیرت یاد آگئی کہ تمہاری طبیعت میں اللہ تعالیٰ نے غیرت بہت رکھی ہے، مجھے یہ خیال ہوا کہ عمر (رضی اللہ عنہ) سے پہلے ان کے محل میں داخل ہو جانا اور اس کو دیکھنا ان کی غیرت کے مطابق نہیں ہوگا، اس وجہ سے میں اس محل میں داخل نہیں ہوا۔ جب

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے یہ سنا تو رو پڑے اور عرض کیا کہ:

﴿او علیک یا رسول اللّٰہ اغار﴾

یا رسول اللہ! کیا میں آپ پر غیرت کروں گا، اگر غیرت ہے بھی تو وہ دوسروں کے حق میں ہے، کیا آپ پر غیرت کروں گا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے پہلے محل میں کیوں داخل ہوئے۔

ایک ایک صحابی کی رعایت کی

آپ اس سے اندازہ لگائیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسے کیسے لطیف پیرائے میں اپنے اصحاب کے مزاجوں کی رعایت کی، یہ نہیں تھا کہ چونکہ ہم امام ہیں اور یہ ہمارے مقتدی ہیں، ہم پیر ہیں اور یہ ہمارے مرید ہیں، ہم استاد ہیں اور یہ ہمارے شاگرد ہیں، لہٰذا سارے حقوق ہمارے ہوگئے اور ان کا کوئی حق نہ رہا۔ لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایک صحابی کے مزاج کی رعایت کر کے دکھائی۔

امہات المؤمنین اور حضرت عائشہؓ کے مزاج کی رعایت

ایک روایت میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اعتکاف کا ارادہ فرمایا تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میرا دل بھی چاہتا ہے کہ آپ کے ساتھ اعتکاف میں بیٹھوں۔ ویسے تو خواتین کے لئے مسجد میں اعتکاف کرنا کوئی اچھی بات نہیں ہے، خواتین کو اعتکاف کرنا ہو تو اپنے گھر میں کریں، لیکن حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا معاملہ اس لحاظ سے مختلف تھا کہ ان کے گھر کا دروازہ مسجد میں کھلتا تھا، اب اگر ان کے گھر کے دروازے کے ساتھ ہی ان کی اعتکاف کی جگہ بنادی جاتی، اور اس کے ساتھ ہی

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اعتکاف کی جگہ ہوتی تو کسی بے پردگی کا احتمال نہ ہوتا، جب ضرورت ہوتی تو گھر میں چلی جاتیں اور پھر واپس آکر اپنے اعتکاف میں بیٹھ جاتیں، اس لئے اگر وہ مسجد میں اعتکاف فرماتیں تو کوئی خرابی لازم نہ آتی۔ اسی وجہ سے جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت طلب کی کہ میں آپ کے ساتھ اعتکاف کرنا چاہتی ہوں تو آپ نے اجازت دے دی۔

لیکن جب ۲۰/ رمضان المبارک کی تاریخ آئی تو اس دن آپ کہیں باہر تشریف لے گئے تھے، جب واپس تشریف لائے اور مسجد نبوی میں پہنچے تو آپ نے دیکھا کہ مسجد نبوی میں بہت سارے خیمے لگے ہوئے ہیں، آپ نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ خیمے کس کے ہیں؟ لوگوں نے بتایا کہ یہ امہات المؤمنین کے خیمے ہیں۔ جب حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو اعتکاف کرنے کی اجازت مل گئی تو دوسری ازواج مطہرات نے چاہا کہ ہم بھی یہ سعادت حاصل کرلیں، لہٰذا انہوں نے بھی اعتکاف کے لئے اپنے اپنے خیمے لگا دیئے۔ اب اس وقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ احساس ہوا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا معاملہ تو مختلف تھا اس لئے کہ ان کا گھر تو مسجد نبوی سے بالکل متصل تھا اور دوسری ازواج مطہرات کے مکان تو مسجد نبوی سے دور ہیں، اگر انہوں نے بھی اعتکاف کیا تو ان کا بار بار آنا جانا رہے گا، اس میں بے پردگی کا احتمال ہے اور اس طرح خواتین کا مسجد کے اندر اعتکاف کرنا مناسب بھی نہیں ہے۔ اس لئے آپ نے ان کے خیمے دیکھ کر ارشاد فرمایا:

﴿آلبر یردن؟﴾

"کیا یہ خواتین کوئی نیکی کرنا چاہتی ہیں؟"۔

مطلب یہ تھا کہ اس طرح خواتین کا مسجد میں اعتکاف کرنا کوئی نیکی کی بات نہیں۔

اس سال ہم بھی اعتکاف نہیں کریں گے

لیکن اب مشکل یہ تھی کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو آپ اعتکاف کی اجازت دے چکے تھے، اگرچہ ان کو اجازت دینے کی وجہ واضح تھی اور دوسری امہات المؤمنین میں وہ وجہ موجود نہیں تھی، لیکن آپ نے سوچا کہ اگر میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا خیمہ باقی رکھوں گا اور دوسری امہات المؤمنین کو منع کردوں گا تو ان کے مزاج پر بار ہوگا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو تو اجازت دے دی اور ہمیں اجازت نہ ملی، لہٰذا جب آپ نے دوسری امہات المؤمنین کے خیمے اٹھوائے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ تم بھی اپنا خیمہ اٹھالو۔ لیکن پھر خیال آیا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو چونکہ پہلے صراحۃً اجازت دیدی گئی تھی اب اگر اچانک ان سے خیمہ اٹھانے کو کہا جائے گا تو ان کی طبیعت پر بار ہوگا، اس لئے ان کا خیال کرتے ہوئے آپ نے یہ اعلان فرما دیا کہ اس سال ہم بھی اعتکاف نہیں کریں گے۔ چنانچہ اس سال آپ نے اعتکاف ہی نہیں فرمایا۔

اعتکاف کی تلافی

بہرحال امہات المؤمنین کے مزاجوں کی رعایت کے نتیجے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا خیمہ اٹھوا دیا اور پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے مزاج کی رعایت کرتے ہوئے اپنے ساتھ یہ معاملہ فرمایا کہ وہ معمول جو ساری عمر کا چلا آرہا تھا کہ ہر رمضان المبارک میں آپ اعتکاف کیا کرتے تھے، محض حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی دل شکنی کے اندیشہ میں اس معمول کو توڑ دیا۔ پوری حیات طیبہ میں یہ سال ایسا تھا جس میں آپ نے اعتکاف نہیں فرمایا لیکن بعد میں اس کی تلافی اس طرح فرمائی کہ اس سے اگلے سال دس دن کے بجائے بیس دن کا اعتکاف فرمایا۔

یہ بھی سنت ہے

اس سے آپ اندازہ لگائیں کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسی کیسی رعایتیں اپنے چھوٹوں کے ساتھ بھی فرمائیں اور ایک شرعی حکم کی وضاحت کے معاملے میں بھی ایسا طریقہ اختیار فرمایا جس سے دوسرے کی طبیعت پر بار نہ ہو، حکم کی وضاحت بھی فرمادی۔ اس پر عمل بھی کرلیا اور دوسروں کی دل شکنی سے بھی بچ گئے۔ اور ساتھ میں آپ نے اپنے عمل سے یہ تعلیم بھی دے دی کہ جو عمل فرض یا واجب نہیں ہے بلکہ مستحب ہے، اگر آدمی کسی کی دل شکنی سے بچنے کے لئے اس مستحب کام کو مؤخر کردے یا چھوڑ دے تو یہ عمل بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا حصہ ہے۔

حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب کا معمول

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ہر رمضان میں یہ معمول تھا کہ جب عصر کی نماز کے لئے مسجد میں تشریف لے جاتے تو مغرب تک اعتکاف کی نیت سے مسجد ہی میں قیام فرمایا کرتے تھے، وہاں تلاوت، ذکر واذکار، تسبیحات اور مناجات میں مشغول رہتے تھے اور جو باقی وقت ملتا تو آخر میں لمبی دعا فرمایا کرتے تھے اور وہ دعا افطار کے وقت تک جاری رہتی تھی۔ حضرت والا اپنے متوسلین کو بھی یہ مشورہ دیا کرتے تھے کہ وہ بھی اپنا یہ معمول بنالیں، کیونکہ اس کے اندر آدمی کا وقت مسجد میں گذر جاتا ہے، اعتکاف کی فضیلت بھی حاصل ہوجاتی ہے اور معمولات بھی پورے ہوجاتے ہیں اور آخر میں دعا کی توفیق بھی ہوجاتی ہے، اور یہ دعا تو رمضان المبارک کا حاصل ہے اس لئے کہ اس وقت دن ختم ہورہا ہوتا ہے اور افطار کا وقت قریب ہوتا ہے اور اس وقت آدمی کی طبیعت میں شکستگی ہوتی ہے اور اس شکستگی کی حالت میں جو دعائیں کی جاتی ہیں وہ بڑی ہی قبول ہوتی ہیں، حضرت والا اکثر اپنے

متوسلین کو مشورہ دیا کرتے تھے بلکہ تاکید فرمایا کرتے تھے کہ ایسا کرلیا کرو، چنانچہ حضرت والا کے متوسلین میں اس طریقہ پر عمل اب بھی جاری ہے۔

مسجد کے بجائے گھر پر وقت گزاریں

ایک مرتبہ حضرت والا کے متوسلین میں سے ایک صاحب نے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ حضرت! میں نے آپ کے ارشاد کے مطابق اپنا یہ معمول بنایا ہوا تھا کہ عصر سے لے کر مغرب تک کا وقت مسجد میں گزارتا اور وہاں بیٹھ کر تلاوت، ذکر واذکار اور تسبیحات اور دعا میں مشغول رہتا، ایک دن میری بیوی نے مجھ سے کہا کہ آپ سارا دن ویسے بھی باہر رہتے ہیں، لے دیکر عصر کے بعد کا وقت ہوتا تھا اس میں ہم بیٹھ کر کچھ باتیں کرلیا کرتے تھے اور افطار کے وقت ایک ساتھ افطار کرنے کی راحت حاصل ہوتی تھی، اب آپ نے چند روز سے یہ طریقہ اختیار کرلیا ہے کہ عصر کی نماز کے بعد آپ مسجد میں جاکر بیٹھ جاتے ہیں اور مغرب تک آپ وہیں رہتے ہیں اور عصر کے بعد اکھٹے بیٹھ کر بات چیت کرنے اور ایک ساتھ افطار کرنے کا سلسلہ بھی ختم ہوگیا۔ حضرت! اب کشمکش میں مبتلا ہوگیا ہوں کہ عصر کے بعد کا وقت مسجد میں گزارنے کا یہ معمول جاری رکھوں یا بیوی کے کہنے کے مطابق اس معمول کو چھوڑ دوں اور گھر پر وقت گزاروں۔ حضرت والا نے ان کی بات سنتے ہی فرمایا کہ آپ کی بیوی ٹھیک کہتی ہیں، لہٰذا آپ ان کے کہنے کے مطابق مسجد میں وقت گزارنے کے بجائے گھر پر ہی وقت گزارا کریں اور گھر میں ان کے پاس بیٹھ کر جو تلاوت، ذکر واذکار کرسکتے ہیں کرلیا کریں اور پھر ایک ساتھ روزہ افطار کیا کریں۔

تمہیں اس پر پورا ثواب ملے گا

پھر خود ہی ارشاد فرمایا کہ میں نے جو معمول بنایا تھا وہ زیادہ سے زیادہ مستحب عمل ہے، اور جو بات ان کی بیوی نے کہی تو اس کے حقوق میں یہ بات داخل ہے کہ

شوہر جائز حدود میں رہتے ہوئے اس کی دلداری کرے، اور بعض اوقات یہ دلداری واجب ہوجاتی ہے، لہٰذا اگر اس کا دل خوش کرنے کے لئے تم اپنا یہ معمول چھوڑ دو گے تو انشاء اللہ، اللہ تعالیٰ اس معمول کی برکات سے محروم نہیں فرمائیں گے، اس لئے کہ اس کا دل رکھنے کے لئے اور اس کے مزاج کی رعایت کرنے کے لئے یہ معمول چھوڑا ہے، انشاء اللہ تمہیں وہی اجر و ثواب حاصل ہوگا جو اس معمول کے پورا کرنے پر حاصل ہوتا۔

ذکر واذکار کے بجائے تیمارداری کریں

ایک مرتبہ ہمارے حضرت والا نے فرمایا کہ ایک شخص نے اپنے معمولات پورے کرنے کے لئے ایک خاص وقت مقرر کیا ہوا تھا، اس وقت میں وہ تنہائی میں بیٹھ کر اللہ تعالیٰ سے عرض معروض کیا کرتا تھا، ذکر و تسبیح کیا کرتا تھا۔ اب اچانک گھر میں کوئی بیمار ہوگیا، والد بیمار ہوگئے یا والدہ بیمار ہوگئیں یا بیوی بچے بیمار ہوگئے، اب یہ شخص ان کی تیمارداری اور خدمت میں لگا ہوا ہے جس کے نتیجے میں اس کے ذکر و اذکار اور تسبیحات کا معمول پورا نہیں ہورہا ہے اور اس کی وجہ سے اس کا دل دکھ رہا ہے کہ یہ وقت اب تک تو عبادت اور ذکر واذکار میں گزر رہا تھا اور اب یہ تیمارداری اور خدمت میں گزر رہا ہے۔

فرمایا کہ یہ دل دکھانے کی بات نہیں، کیونکہ اس وقت ان لوگوں کی تیمارداری اور خدمت کرنا یہی عبادت ہے اور ذکر واذکار سے زیادہ افضل ہے۔

وقت کا تقاضہ دیکھئے

فرمایا کہ دین دراصل وقت کے تقاضے پر عمل کرنے کا نام ہے، دیکھو اس وقت تم سے کیا مطالبہ ہے؟ اس وقت تم سے مطالبہ یہ ہے کہ اس ذکر کو چھوڑو اور بیمار کی خدمت کرو، اور یہ کام کرتے وقت یہ مت خیال کرو کہ جو ذکر و تسبیح کیا کرتے تھے

اس سے محرومی ہوگئی ہے، اللہ تعالیٰ محروم نہیں فرمائیں گے، کیونکہ ایک صحیح داعیے کے تحت تم نے ذکر و اذکار چھوڑا ہے۔

رمضان کی برکات سے محروم نہیں ہوگا

اسی طرح ایک مرتبہ حضرت والا نے فرمایا کہ فرض کریں کہ ایک شخص رمضان میں بیمار ہوگیا یا سفر پر چلا گیا اور اس بیماری یا سفر کی وجہ سے رمضان کا روزہ نہ رکھ سکا، تو اس کے لئے حکم یہ ہے کہ اگر بیماری اور سفر کے عذر کی وجہ سے روزہ نہ رکھ سکے تو بعد میں قضا کرلے، چنانچہ بعد میں اس نے اس روزے کی قضا کرلی، تو چونکہ عذر شرعی تھا اس لئے جب وہ شخص عام دنوں میں رمضان کے اس روزے کی قضا کرے گا، تو جس دن میں وہ قضا روزہ رکھے گا اس شخص کے حق میں اس دن رمضان ہی کا دن واپس آگیا، وہ سارے انوار و برکات جو رمضان کے دنوں میں تھے وہ سب اس دن اس کے حق میں لوٹ آئیں گے، اس لئے کہ عذر کی وجہ سے جب اللہ تعالیٰ نے اس کو رخصت عطا کی تھی تو کیا اس کو رمضان کی برکات سے محروم کردیں گے؟ نہیں، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے یہ بات بعید ہے کہ اس کو رمضان کی برکات سے محروم کردیں۔

لہٰذا اگر کوئی شخص جائز عذر کی بنا پر اپنا کوئی معمول چھوڑ رہا ہے یا مؤخر کر رہا ہے تو انشاء اللہ اس کام کے اندر بھی اس کو وہ سارے انوار و برکات حاصل ہوجائیں گے۔ بس وقت کے تقاضے پر عمل کرنے کا نام دین ہے، یہ نہ ہو کہ آپ یہ کہہ دیں کہ یہ وقت تو ہمارے ذکر و اذکار کا ہے یا تلاوت کا ہے، کوئی اگر مر رہا ہے تو مرنے یا اگر کوئی بیمار پڑا ہے تو پڑا رہے۔ یہ کوئی دین کی بات نہیں ہے بلکہ وقت کے تقاضے پر عمل کرنے کا نام دین ہے۔

بے جا اصرار نہ کریں

لہٰذا مزاجوں کی رعایت کرو اور کسی شخص کے ساتھ برتاؤ کرتے وقت یہ دیکھو کہ میرے اس عمل سے اس شخص کے مزاج کے پیش نظر اس کی طبیعت پر کوئی گرانی تو نہیں ہوگی، کوئی بار تو نہیں ہوگا، اس کی رعایت رکھو۔ اور یہ اصلاح معاشرت کی تعلیم کا بڑا عظیم باب ہے، آجکل لوگ اس کا خیال نہیں کرتے، مثلاً کسی کی طبیعت پر کوئی کام بہت بوجھ ہوتا ہے، اب اگر آپ اس کو اس کام پر اصرار کریں گے تو ہو سکتا ہے کہ وہ بیچارہ اصرار سے مغلوب ہو کر آپ کی بات مان لے، لیکن آپ نے اس کی طبیعت پر جو بوجھ ڈالا اور جو گرانی آپ نے پیدا کی اور اس سے جو تکلیف اس کو پہنچی اس کا سبب آپ بنے، کیا معلوم اس کے سبب آپ گناہ میں مبتلا ہو گئے ہوں العیاذ باللہ۔

سفارش اس طرح کی جائے

مثلاً آجکل سفارش کرانے کا سلسلہ چل پڑا ہے، کسی دوسرے سے تعلقات کا ایک لازمی حصہ یہ ہے کہ ضرور وہ میری سفارش کرے، اور سفارش کرنے کے بارے میں قرآن کریم کی یہ آیت بہت یاد رہتی ہے کہ۔

﴿من يشفع شفاعة يكن له نصيب منها﴾

یعنی جو شخص اچھی سفارش کرے تو اللہ تعالیٰ اس کام میں اس کا حصہ بھی لگا دیتے ہیں۔ اور اچھی سفارش کرنے کی بڑی فضیلت ہے اور واقعۃً بڑی فضیلت ہے، لیکن لوگ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ سفارش اس وقت باعث فضیلت ہے جب اس بات کا لحاظ کرتے ہوئے سفارش کی جائے کہ جس سے سفارش کی جارہی ہے اس کی طبیعت پر بار نہ ہو۔ اب اگر آپ نے ایک شخص کی رعایت اور اس کی

دلداری کی خاطر اس کی سفارش تو کردی لیکن جس کے پاس سفارش کی اس کی طبیعت پر ایک پہاڑ ڈال دیا، وہ تو یہ سوچے گا کہ اتنا بڑا شخص مجھ سے سفارش کر رہا ہے اب اگر میں اس سفارش کو قبول کروں تو مشکل، اس لئے کہ اس کی وجہ سے اپنے اصول اور قاعدے توڑنے پڑتے ہیں، اور اگر سفارش قبول نہ کروں تو اس کی دل شکنی ہوتی ہے۔ یہ سفارش نہ ہوئی، یہ تو دباؤ ڈالنا ہوا۔ لہٰذا دوسرے کے مزاج کی رعایت رکھتے ہوئے سفارش کرنی چاہئے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ہمیشہ کا معمول یہ تھا کہ جب بھی کسی کی سفارش کرتے تو یہ عبارت ضرور لکھتے کہ "اگر آپ کی مصلحت اور اصول کے خلاف نہ ہو تو آپ ان کا یہ کام کردیجئے"۔ بعض اوقات یہ عبارت بھی بڑھا دیتے کہ "اگر آپ کی کسی مصلحت کے خلاف ہو اور آپ یہ کام نہ کریں تو مجھے ادنیٰ ناگواری نہیں ہوگی"۔ یہ عبارت اس لئے لکھ دیتے تاکہ اس کے دل پر بوجھ نہ ہو۔ یہ ہے سفارش کا طریقہ۔

ایک صاحب میرے پاس آئے اور تعلقات کی مد میں کہنے لگے کہ دیکھو بھائی! میں تم سے ایک کام کہنا چاہتا ہوں، میں نے پوچھا کہ کیا کام ہے؟ کہنے لگے کہ ایسے نہیں، بلکہ پہلے یہ وعدہ کرو کہ یہ کام کرو گے۔ میں نے کہا کہ جب تک مجھے پتہ نہیں کہ وہ کام کیا ہے، میں کیسے وعدہ کرلوں کہ میں یہ کام کروں گا۔ وہ کہنے لگے کہ نہیں، پہلے وعدہ کرو کہ میرا وہ کام کرو گے۔ میں نے کہا کہ اگر وہ کام ایسا ہوا جو میرے بس میں نہ ہو تو پھر کیا کروں گا۔ کہنے لگے کہ وہ کام آپ کے بس میں ہے۔ میں نے کہا، بتا تو دیں کہ وہ کیا کام ہے؟ کہنے لگے کہ میں اس وقت تک نہیں بتاؤں گا جب تک آپ یہ وعدہ نہ کریں کہ میں یہ کام کروں گا۔

میں نے ان کو ہزار سمجھایا کہ پہلے اس کام کی کچھ تفصیل تو معلوم ہو تو وعدہ کروں، ایسے کیسے وعدہ کرلوں۔ کہنے لگے کہ اگر آپ انکار کر رہے ہیں تو یہ تعلقات کے خلاف بات ہوگی۔

اب آپ بتایئے کہ کیا یہ طریقہ صحیح ہے؟ یہ تو ایک شخص کو دباؤ میں ڈالنا ہے کہ جب تک اس کام کو کرنے کا وعدہ نہیں کرو گے اس وقت تک بتائیں گے بھی نہیں۔ چنانچہ آج کے تعلقات کا یہ لازمی حصّہ ہے کہ آدمی دوسرے کی سفارش کرے۔ حالانکہ یہ بات اسلامی آداب معاشرت کے قطعی خلاف ہے۔ اس لئے کہ آپ نے ایک آدمی کو ذہنی کشمکش میں مبتلا کر دیا اور بلاوجہ ایک آدمی کو کشمکش اور ذہنی پریشانی میں ڈالنا گناہ ہے۔

تعلق رسمیات کا نام ہوگیا ہے

آجکل تعلق اور محبت صرف "رسمیات" کا نام ہوگیا ہے، اب اگر وہ "رسمیات" پوری ہو رہی ہیں تو تعلقات کا حق ادا ہو رہا ہے، اور اگر "رسمیات" پوری نہیں ہو رہی ہیں تو تعلقات کا حق ہی ادا نہ ہوا مثلاً اگر کسی کو دعوت دی تو بس اب اس کے سر پر بیٹھے ہوئے ہیں کہ ضرور اس دعوت کو قبول کریں۔ اس کا احساس نہیں کہ اس دعوت کی وجہ سے وہ کتنی دور سے آئے گا، کتنی تکلیف اٹھا کر اس دعوت میں شرکت کرے گا، اس کے حالات دعوت قبول کرنے کی اجازت دیتے ہیں یا نہیں، اس سے اس دعوت دینے والے کو کوئی بحث نہیں، اس کو تو دعوت ضرور دینی ہے اور اس کو بلانا ہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی دعوت

ہمارے ایک بزرگ گزرے ہیں حضرت مولانا ادریس صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ ــــ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے آمین ــــ یہ بزرگ میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بچپن کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ ایک مرتبہ لاہور سے کراچی تشریف لائے اور والد صاحب سے ملاقات کے لئے دارالعلوم تشریف لائے اور ایسے وقت تشریف لائے کہ وہ کھانے کا وقت نہیں

تھا۔ ان کے آنے پر حضرت والد صاحب بہت خوش ہوئے اور بڑے شاندار طریقے سے ان کا استقبال کیا، جب وہ رخصت ہونے لگے تو حضرت والد صاحب نے عرض کیا کہ "بھائی مولانا ادریس صاحب! میرا دل چاہ رہا تھا کہ ایک وقت کا کھانا آپ ہمارے ساتھ کھا لیتے، لیکن مصیبت یہ ہے کہ آپ کا قیام بہت دور ہے اور آپ کے پاس وقت کم ہے، ایک دن کے بعد آپ واپس لاہور جا رہے ہیں، اب اگر میں آپ پر یہ اصرار کروں کہ آپ ایک وقت کا کھانا میرے ساتھ کھائیں تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ دعوت نہ ہوگی بلکہ عداوت ہو جائے گی، اس لئے کہ آپ کے پاس وقت کم ہے، آپ اتنی دور سے دعوت کھانے کے لئے آئیں گے تو اس میں چار پانچ گھنٹے آپ کے صرف ہو جائیں گے، اس میں آپ کو مشقت اور تکلیف ہوگی، اس لئے میں آپ کی دعوت تو نہیں کرتا اگرچہ میرا دل دعوت کرنے کو چاہ رہا ہے، لیکن دعوت کے بغیر بھی دل نہیں مانتا، اس لئے میں آپ کی خدمت میں تھوڑا سا ہدیہ پیش کرتا ہوں اور جتنے پیسے میں دعوت میں خرچ کرتا اتنے پیسے آپ میری طرف سے ہدیہ میں قبول کر لیجئے۔ حضرت مولانا ادریس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے وہ پیسے ان سے لئے اور اپنے سر پر رکھ لئے اور فرمایا کہ یہ میرے لئے بڑی عظیم نعمت ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ میرا دل بھی یہ چاہ رہا تھا کہ آپ کے پاس حاضر ہو کر آپ کے ساتھ کھانا کھاؤں لیکن وقت میرے پاس اتنا کم ہے کہ اس کے اندر گنجائش نظر نہیں آرہی تھی اور آپ نے پہلے ہی میرے لئے یہ راستہ آسان کر دیا۔

اب بتایئے! اگر والد صاحب ان سے یہ کہتے کہ نہیں، ایک وقت کا کھانا آپ کو میرے ساتھ ضرور کھانا پڑے گا اور وہ جواب میں یہ کہتے کہ میرے پاس تو وقت نہیں ہے، والد صاحب کہتے کہ نہیں بھائی! دوستی کا تقاضہ تو یہی ہے کہ ایک وقت کا کھانا آپ ضرور میرے ساتھ آکر کھائیں۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ جس کام کے لئے وہ اتنا لمبا سفر کر کے آئے ہیں وہ کام چھوڑتے اور دعوت کھانے کے لئے پانچ گھنٹے قربان کرتے۔ یہ دعوت نہ ہوتی بلکہ عداوت ہوتی۔

محبت نام ہے محبوب کو راحت پہنچانے کا

آج ان رسمیات نے نہ صرف ہمارے معاشرے کو تباہ کر رکھا ہے بلکہ دین کے اخلاق و آداب سے بھی ہمیں دور کر دیا ہے۔ حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوبصورت بات ارشاد فرمائی ہے، اگر اللہ تعالیٰ یہ بات ہمارے دلوں میں اتار دے تو ہمارے سارے کام سنور جائیں، فرمایا کہ "محبت نام ہے محبوب کو راحت پہنچانے کا" جس سے محبت ہے اس کو آرام پہنچاؤ، اپنی من مانی کرنے اور اپنی خواہشات کو پورا کرنے کا نام محبت نہیں، اگر محبت کرنے والا عاشق نادان اور بیوقوف ہو تو اس کی محبت سے محبوب کو تکلیف پہنچ جاتی ہے، لیکن ہمارے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کا مذاق یہ ہے کہ محبت سے تکلیف پہنچنے کے کوئی معنی نہیں ہیں، اگر تم کو کسی سے محبت ہے تو اس کو تکلیف مت پہنچاؤ بلکہ راحت پہنچاؤ، چاہے اپنے جذبات کو قربان کرنا پڑے لیکن راحت پہنچاؤ۔

یہ سب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی تشریح ہو رہی ہے کہ خالقوا الناس باخلاقھم لوگوں کے ساتھ ان کے مزاج کے مطابق معاملہ کرو، جس سے معاملہ کرنے جا رہے ہو پہلے یہ دیکھ لو کہ اس کا مزاج کیا ہے، اس کے مزاج پر یہ بات بار تو نہیں ہوگی، ناگوار تو نہیں ہوگی۔ اور یہ چیز بزرگوں کی صحبت کے بغیر حاصل نہیں ہوتی، ہمارا تو یہی تجربہ ہے، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی خانقاہ میں لوگوں کی اس طرح تربیت فرمائی کہ لوگوں کے مزاج کی کس طرح رعایت رکھی جاتی ہے۔ لوگوں کے ایک ایک عمل پر نگاہ رکھی اور ان کو یہ تعلیم دی کہ اس موقع پر آپ کو یہ عمل کرنا چاہئے۔

یہ آداب المعاشرت کے سلسلے کی آخری حدیث تھی، اس میں سارے احکام اور سارے آداب کی بنیادیں بیان فرما دی ہیں کہ اپنی ذات سے دوسروں کو ادنیٰ تکلیف نہ پہنچے، اس بات کا آدمی اہتمام اور دھیان کرے۔ ہر کام کرنے سے پہلے آدمی یہ

سوچے کہ اس کام سے دوسروں کو تکلیف تو نہیں پہنچے گی، اور دوسرے کی مزاج کی رعایت کرے۔

ایک شاعر گزرے ہیں جن کا نام ہے "جگر مراد آبادی مرحوم" یہ بھی حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت میں پہنچ گئے تھے، ان کا ایک شعر بڑے کام کا ہے، اگر یہ شعر ہمارا لائحہ عمل بن جائے تو یہ سارے اسلامی آدابِ معاشرت کا خلاصہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ

اس نفع و ضرر کی دنیا میں یہ ہم نے لیا ہے درسِ جنوں
اپنا تو زیاں منظور سہی، اوروں کا زیاں منظور نہیں

یعنی اس دنیا میں سارے کام اپنی طبیعت اور مزاج کے مطابق نہیں ہوتے لیکن اس دنیا کے کام اپنی طبیعت کے خلاف ہو جائیں اور اپنے اوپر مشقت اٹھالیں اور اپنی طرف سے قربانی دیدیں، تو یہ ہمیں منظور ہے لیکن دوسروں کو ہم سے کوئی مالی، جانی ،ذہنی، نفسیاتی نقصان پہنچ جائے تو یہ ہمیں منظور نہیں۔ یہ ہی سارے دین کی تعلیم ہے اور یہی آداب معاشرت کا خلاصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

اجمالی فہرست

اصلاحی خطبات مکمل

جلد اول (۱)

عنوان | صفحہ نمبر

جلد دوم (۲)

جلد سوم (۳)

جلد چہارم (۴)

جلد پنجم (۵)

جلد ششم (۶)

جلد ہفتم (۷)

جلد ہشتم (۸)

جلد نہم (۹)